مشاہیرِ اسلام

از

عباد اللہ اختر

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور

مشاہیر اسلام

طبع اوّل ۱۹۵۸ء

محمد اشرف ڈار سیکرٹری نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لئے
دین محمدی پریس سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر شایع کی۔

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

سید محمد المہدی جونپوری

(مہدویت اور مدعیان مہدویت و دجال و یاجوج و ماجوج کی جامع تاریخ)

حرفِ مطلب

کارلائل انگلستان کا مشہور مفکر اور ادیب تھا۔ اس نے ایک کتاب "مشاہیر و مشاہیر پرستی" (HERO AND HERO WER SHIP)
لکھی اس میں ہیرو بحیثیت نبی کا انتخاب اس نے آنحضرت کا کیا۔ اور آنحضرت کے دعویٰ رسالت کی تصدیق بھی کی۔ وہ کہتا ہے کہ آنحضرت ؐ سے پیشتر جتنے ہیرو گذرے ہیں لوگوں نے دیوتا اور اوتار سمجھ کر ان کی پوجا کی لیکن آنحضرت کی پہلی شخصیت ہے، جس نے واشگاف لفظوں میں کہا کہ "انما انا بشر مثلکم" کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں اور بس - یہ پہلی شخصیت ہے جس نے اپنے آپ کو بحیثیت بشر پیش کیا۔ اب آئندہ کسی "ہیرو" کو کوئی الوہیت کا درجہ نہیں دے گا۔ بلکہ یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ جن کو الوہیت کا درجہ دیا گیا کیا فی الواقع اس کے معاصرین اس کو خدا یا خدا زادہ سمجھتے تھے یا بہت عرصہ بعد صرف عقیدتمندوں نے اس کو الوہیت کا درجہ دیا -

کارلائل نے بات تو موحدوں کی کہی ہے کہ توحید بلا شائبہ شرک اسی صورت میں متصور ہو سکتی ہے کہ اللہ کے سوا ہر ایک شے کو مخلوق

اور اللہ کے بندے یقین کیا جائے اور جس شخصیت نے "انما انا بشر مثلکم" کا اعلان کیا اس کے متبعین اہل اسلام میں سے لاکھوں ہر ایک زمانہ میں اپنے اپنے ائمہ دین کو یا تو الوہیت کا درجہ دیتے رہے یا ان کو بھی نک جی وقیدم یقین کرتے ہیں یا کم از کم اس کے نام سے وابستہ ہیں کارلائل کو اس کا علم نہ تھا۔ اور اگر کوئی اسے بتاتا کہ مسلمانوں میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک فرقہ اپنے ائمہ دین کے نام سے وابستہ ہے تو شاید وہ اس کی اور تاویل کرتا لیکن اگر کوئی یہ بتاتا کہ وہ آنحضرت کے بعد ائمہ دین کو الوہیت کا درجہ بھی دیتے ہیں تو کبھی یقین نہ کرتا اور یہی کہتا کہ یہ متعصب مسیحی پادریوں کی اختراع ہے اس نے مسیحی پادریوں کی یاوہ گوئی کا جواب بھی دیا ہے وہ آنحضرت کی نسبت اختراع کرتے ہیں۔

مسیحی مسیح کو خدا اور خدا زادہ کہیں، اصنام پرست اپنے رشیوں اور منیوں کو دیوتا کہیں اور ان کی پوجا کریں لیکن آنحضرت پر ایمان لانے والے بھی اگر یہی روش اختیار کریں تو

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد ‌ ‌ ‌ ‌ وائے گر از پس امروز بود فردائی

امر واقعہ یہ ہے کہ عالم انسانی کی اکثریت ابھی تک "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور "لقد کرمنا بنی آدم وحملنھم فی البر والبحر وازقنھم" سے روشناس نہیں ہوئی ابھی تک اسے اس حقیقت کا علم نہیں کہ اس ارشاد الٰہی کا کیا مفہوم کہ وہ ابھی تک اپنے اعلے مرتبہ سے واقف نہیں جو اسے کائنات میں فطرۃً حاصل ہے۔

انسان کہ فلک باست سرافگندہ او — در حیرت او گم است دانۂ او
دارد خاصیتے کہ در خارج نہ ہبن — ہر چیز کہ آفریدہ شد بندہ او

امر واقعہ یہ ہے اور تاریخی واقعات اور ہمارا اپنا مشاہدہ اس کی تائید میں ہے کہ "انما انا بشر مثلکم" کو لوگ کچھ وقعت نہیں دیتے، مسیحؑ کی نسبت کہتے کہ دیکھو یہ ہے رسول شرابی اور بھی لوگ آنحضرت پر پھبتی جمائے کہ " یہ کیسا رسول ہے کہ کیا تاپتا اور بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے، مناسب تو یہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہوتا جو ہمیں ڈراتا دھمکاتا" پست ذہنیت "انما انا بشر مثلکم" پر ایمان نہیں لائی۔ لیکن اگر کوئی مدعی الوہیت ہو تو اس کے گرد پروانہ وار جمع ہو جاتی ہے اگر پولوس مسیحؑ کو بحیثیت دیوتا پیش نہ کرتا تو رومی اور یونانی کبھی ایمان نہ لاتے، اور آج بھی کسی ایسی شخصیت کا اتباع نہ کریں گے جو "انا بشر مثلکم" کی حیثیت سے سامنے آئے اگر وہ یہ کہے کہ مجھے خدا "انت ولدی" کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو بلا چوں وچرا تسلیم کر لیں گے۔

مدعیان الوہیت نے انسانی ذہنی کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور بعض نے دنیوی حکومت اور اکثر نے دینی حکومت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر جما دیا۔ انبیاء اور رسل تو لوگوں کو اللہ والے بنانے کے لیے مبعوث ہوئے انہوں نے بندگان خدا کو اپنا بندہ بنا کر چھوڑا۔ اور زیادہ تر حیرت اس بات پر ہے کہ مر کر خاک میں مل گئے مگر ابھی تک ان کے ناموں کے پوجاری ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "عبودیت" اور "عبدیت" نہ صرف انسان بلکہ کائنات کی ہر ایک شے کی فطرت میں ودیعت ہے اور یہ احتیاج کا تقاضہ ہے کہ انسان اپنے حاجت روا کی بندگی کرے۔ اگر خالق کائنات رب العالمین کی بندگی نہ کرے گا تو بہر حال شجر و حجر کی پوجا کرے گا۔ اور کرتا ہے۔ اور اسی کمزوری

کا نامدہ ہر ایک فرعون اٹھاتا رہا اور دعوے "انا ربکم الاعلیٰ" منواتا رہا۔

بیدل بحصول رزق آمادہ بسر ننگ چا کر سگ نگذشت و خر بندہ خر

از مخترعات کارگاہ امکاں ایں ننگ شعور غیست جز ضع بشر

جب تک علم انسانی ایک اللہ تعالےٰ پر ایمان نہیں لائے گا کسی نہ کسی رنگ میں مخلوق کی پوجا ہی کرتا رہے گا۔ یہ دینی حکومت ہو یا دنیوی پست ذہنیت اس کے سامنے جھکتی رہے گی۔ اللہ تعالےٰ کے بندے وہ ہیں "لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

"فہل انتم مسلمون"

مسیح کی آمدِ ثانی

یہ محمد المہدی کے حالات اکثر تذکروں میں مفصل بیان کئے گئے ہیں۔
فرشتہ نے اور عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں اور
"تذکرہ علمائے ہند" میں سید کے حالات ممکن تفصیل کے ساتھ قلم بند
کئے ہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ان حالات اور واقعات کو بیان کریں
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کی واقفیت کے لیے تاریخ "مہدویت"
بھی بیان کریں اور علم النفس کی طرف بھی توجہ دلائیں کہ کسی شخصیت سے عقیدت
کیا کچھ کرشمہ دکھاتی ہے۔

قبلۂ خاصم یا پیمبر یا خدا یا کعبہ است اصطلاح شوق بسیار است و من دیوانہ ام

قیصر جولیس سیزر اور شاہ فرانس شارلمین کے مرنے کے بعد ایک مدت تک
لوگوں کو ان کی آمد ثانی کا انتظار رہا۔ اور موخر الذکر کی نسبت اب بھی مسیحی روایات
سے پایا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور مسیحؑ کی آمد ثانی کے وقت ظاہر ہوگا
مسیحؑ کے ساتھ مل کر غیر مسیحی اقوام بالخصوص یہود کو قتل کرے گا۔ یہ تو عقیدت
کا کرشمہ ہے۔ لیکن انسان بھی عجب مخلوق واقع ہوا ہے۔ قیصر جولیس کو اپنے

ہاتھ سے قتل کیا جب مر گیا تو اس کی پتھر کی مورتی کی پوجا کی۔ کسی نے اسے آسمانی ستارہ میں جلوہ گر ہوتے دیکھا۔ "ٹیپو" کے میدان جنگ میں وہ قاتلوں سے حسب وعدہ ملا۔ اور عوام تو اسے ہمیشہ زندہ ہی سمجھتے رہے۔

کتنے اہل قلم علماء و حکماء شعراء گزرے ہیں۔ جن کے افکار عالیہ صفحہ قرطاس پر آچکے ہیں۔ زندگی جس عسرت سے بسر کی ان کی اپنی تحریر میں اس کا شکوہ و شکایت موجود ہے۔

فلک بردم سفلہ و بدنام مراد   تو اہل دانش و فضل ہمیں گناہت بس

جب موت نے ان کی دنیوی مصائب کا خاتمہ کر دیا تو ان کی قبریں زیارت گاہ عام بن گئیں۔ ان کی برسی منائی جاتی ہے اور تذکروں میں ان کے علم و فضل بلکہ کرامات بیان کی جاتی ہیں۔

مسیح سے جو کچھ آپ کی اپنی قوم یہود نے سلوک کیا اناجیل میں مفصل مذکور ہے۔ آپ نے بہت چاہا کہ یروشلم کو اس کی ابتدائی شان و عظمت میں دیکھیں، یہ یروشلم جو نبیوں کو قتل کرتا ہے اور رسولوں کو سنگسار کرتا ہے۔ کتنی بار چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے جمع کرتی ہے اسی طرح فرزندان یروشلم کی سرپرستی کریں۔ مگر اس نے نہ چاہا (مقدس متی ۲۳) قوم نے آپ پر کفر و بغاوت کا الزام عائد کیا اور رومی عدالت میں پیش کیا۔ کوڑے لگوائے۔ کسی نے دھول دھپے سے اور کسی نے منہ پر تھوکنے سے ذلیل کیا۔ اور آخر دار پر کھنچوایا حواری جو ہر وقت سایہ کی طرح ساتھ رہے آخر وقت پر مفرور ہو گئے۔ اور ایک نے تو برملا لعنت کی۔

یہی مسیح ہے جس کی نسبت مسیحی دنیا کا پختہ عقیدہ ہے بلکہ جزو ایمان ہے۔ مسیح خدا کا اکلوتا بیٹا ہے اور زندہ ہے اور خدا کے دہنے

ہاتھ پر بیٹھا ہے اور کسی وقت دوبارہ دنیا میں تشریف لائے گا۔ اس آمد ثانی کا انتظار مسیحؑ دنیا کو ہمیشہ سے رہا ہے۔

آنحضرت فوت ہوگئے تو جو والہانہ عشق اصحاب رسول کریم کو آنحضرت سے تھا اس کا بھی یہی تقاضہ تھا کہ حضرت عمرؓ شمشیر بکف مسجد نبوی میں یہ کہہ رہے تھے آنحضرت فوت نہیں ہوئے، اللہ سے ملنے گئے ہیں اور ضرور واپس آئیں گے۔ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت فوت ہو گئے، خدا کی قسم میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ ایک جوش کے عالم میں آپ قسم کھا کر یہی فقرے دہرا رہے تھے کہ صدیق اکبرؓ آگئے۔ اور آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ "ای قسم کھانے والے ذرا دم لے" اس کے بعد منبر پر چڑھ کر تقریر کی کہ "اے لوگو جان لو کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی حی القیوم ہے۔ اور ہر ایک نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہونا ہے" پھر قرآن کی آیت پڑھی کہ محمدؐ تو ایک معزز رسول ہے اور اس سے پیشتر کئی رسول گذر چکے ہیں۔ اگر یہ مر جائے (جو یقینی امر ہے) یا مارا جائے (جو ممکن ہے)، تو کیا تم اسلام دین اللہ سے اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو بھی رو گرداں ہوا وہ دین اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا اور اللہ شکر گذار بندوں کو جلدی ہی مناسب اجر عطا فرمائے گا۔" جو محمد کی بشری شخصیت کے پوجاری ہیں سمجھ لیں کہ آپ فوت ہوگئے اللہ ہی حی القیوم ہے،

حضرت عمرؓ کا اپنا بیان ہے کہ صدیق اکبر کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ میرے حواس بجا ہوئے گویا آنکھوں کے سامنے پردہ آگیا تھا جو اٹھ گیا۔ اس طرح صدیق اکبرؓ نے مسلمانوں کو فتنہ آمد ثانی سے بچا لیا۔

سوال یہ ہے کہ مسیحی عقیدہ کی تائید مسلمان عموماً کیوں کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ آپ ضرور زندہ ہیں اور دوبارہ تشریف لائیں گے۔ نہ صرف مسیحؑ بلکہ ان کے ساتھ ایک اور شخصیت کا بھی ظہور ہو گا۔ جو "امام مہدی" ہے اور دونوں عیسےٰؑ اور مہدیؑ مل کر کفار بالخصوص یہود کا قلع قمع کریں گے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ ان کا مذکور احادیث میں ہے جو آنحضرت سے منسوب ہیں۔

بعض علماء اسلام نے ان احادیث کو ضعیف بلحاظ روایت اور موضوع بلحاظ روایت قرار دے کر مسیحؑ و مہدی کی آمد ثانی کا انکار کر دیا۔ بیدل کہتا ہے کہ

باز آمدن مسیح و مہدی ایں جا از تجربہ مزاج اعیان دور است

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثریت کا عقیدہ دربارہ آمد ثانی بدستور ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط مورخ ایسی الجھن میں نہ خود الجھتے ہیں اور نہ کسی کو الجھاتے ہیں۔ وہ حالات اور واقعات معرا بیان کرتے ہیں۔ نتیجہ قارئین خود جو کچھ پسند ہو نکال سکتے ہیں۔

مسیحی دنیا کو تو مسیح کی آمد ثانی کا انتظار ہے۔ اور رہے گا، اکثر اقوام کے دیوتاؤں کی بھی یہی کیفیت ہے یعنی عموماً قوموں کو اپنے بزرگان دین کی آمد ثانی کا انتظار رہا ہے اور غالباً اب بھی ہے۔ اور اس میں تو کلام نہیں کہ مسلمان بھی مسیح و مہدی کے منتظر ہیں۔ اور یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ کئی مسیح اور مہدی آئے ایک جم غفیر ان پر ایمان لایا جب یہ مر گئے یا مارے گئے تو یہ عقیدت کا کرشمہ ہی سمجھنا چاہیے

کہ ان کے ایمان میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ یہ کہہ کر بے قرار دلوں کو تسلی دی کہ مرے نہیں زندہ ہیں اور کسی مناسب وقت پر دوبارہ تشریف لائیں گے۔ معتقدین ہوں یا منکرین۔ انتظار کی گھڑیاں سب بے صبری سے شمار کرتے ہیں۔ اگر ایک مدعی مہدویت مرگیا تو کیا ہوا، دوسرا اس کی جگہ کچھ عرصہ کے بعد کھڑا ہو جاتا اور لوگ اس کے گرد بھی پروانہ وار جمع ہو جاتے اور تن من دھن سب کچھ قربان کر دیتے، اس طرح کچھ عرصہ ہڑبونگ مچی رہتی۔ لیکن اس کے خاتمہ پر کچھ عرصہ سکون کے بعد لوگ بھول جاتے کہ جس مہدی کا انتظار تھا وہ آکر گذر گیا۔ منکرین تو یہ کہتے کہ وہ مہدی کاذب تھا۔ اصلی مہدی آنے والا ہے۔ یہ بھی آتا اور گذر جاتا۔ اس کے منکرین بھی یہ کہتے کہ کاذب تھا۔ بہرحال انتظار میں کچھ ایسی لذت ہے کہ یہ ہمیشہ باقی رہا اور آج تک ہے اور شاید بہت عرصہ اور بھی رہے، دعویٰ مہدویت اب بھی کشادہ ہے اور کشادہ ہی رہے گا۔ ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو۔

زیر بحث یہ امر نہیں کہ گذشتہ مدعیان مہدویت سچے تھے یا جھوٹے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہر ایک ایک نئے فرقہ کا بانی ہوا۔ اور ان میں سے اب بھی اکثر دنیائے اسلام کے کسی نہ کسی حصہ میں موجود ہیں! یہ ایک مستقل موضوع ہے ان مدعیان مہدویت کا مفصل تذکرہ اس مختصر مقالہ میں نہیں ہو سکتا۔ ہم نے صرف ایک شخصیت کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ اس کے کارنامہ میں کچھ خصوصیات ہیں جو دوسرے مدعیان مہدویت میں نظر نہیں آتی۔ ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے دوسرے مدعیان کے حالات کا بھی علم ہونا چاہیے

یہ ہم بالاختصار بیان کرتے ہیں،

پہلی صدی ہجری کے نصف آخری ایام میں "مہدی" کا تصوّر ایسا صاف صاف اور ممیز نہ تھا جو دوسری صدی ہجری میں نمایاں ہوتا گیا۔ غالباً پہلی صدی ہجری میں "مہدی" کی اصطلاح بھی وضع نہ ہوئی تھی، چند پیش گوئیاں احادیث میں شائع ہو رہی تھیں جن کا مذکور "باب فتن" میں ہے جو مؤلفین صحاح ستہ نے باندھا، بخاری میں کوئی حدیث دوبارہ ظہور مہدی نہیں۔ لیکن باب فتن کے تحت چند پیش گوئیاں مذکور ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد فتنہ کا دروازہ کھل جائے گا اور یہ اور وہ واقعہ ظہور میں آئے گا۔

اس وقت اموی حکومت تمام دنیائے اسلام پر مسلط تھی۔ اور حریف قبیلہ بنو ہاشم مسلسل جدوجہد کے ساتھ اس کا تختہ حکومت الٹنے میں لگا ہوا تھا۔ یہ خفیہ سازشیں تھیں اور ان کا جال ملک کے طول و عرض حجاز اور عراق اور ایران میں بنو ہاشم کے داعیوں نے بچھا رکھا تھا۔

امیر معاویہ کے بعد یزید اور یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ثانی تخت خلافت پر بیٹھا مگر تین ماہ کے بعد دست بردار ہو گیا۔ اعیان سلطنت کو جمع کر کے کہا کہ مجھے حکومت سے معذور ہی سمجھو، میں چاہتا تھا کہ سنت عمرؓ پر عمل کروں مگر آج ایسے چھ آدمی بھی نظر نہیں آتے، اس لیے میں اب تمہیں ارباب شوریٰ مقرر کرتا ہوں جس کو چاہو خلیفہ منتخب کر لو۔ معاویہ تو گوشہ نشین ہو گیا اور ادھر ارباب شوریٰ اس ادھیڑ بن میں لگے کہ کس کے ہاتھ میں عنان خلافت دیں۔ ادھر عبداللہ بن زبیر نے ارض حجاز میں اور آپ کے بھائی مصعب نے

بصرہ میں، خراسان میں عبداللہ بن حازم نے مختار ثقفی نے کوفہ میں علم بغاوت بلند کر دیا - نافع بن ارزق امیر خوارج نے بھی سر اٹھایا۔ نظام حکومت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اور ملک کے طول و عرض میں عام بدنظمی شائع ہوگئی۔ خلافت راشدہ نے قیصر و کسریٰ کی حکومت میں کچھ سکت باقی نہ چھوڑی تھی کسریٰ کی مملکت پر تو مسلمان قابض ہو چکے تھے اور قیصر کو بھی اپنی خانہ جنگی سے فرصت نہ تھی اگر یہ دو حکومتیں کچھ طاقتور ہوتیں تو دنیائے اسلام کی خانہ جنگی سے فائدہ خاطر خواہ اٹھا سکتی تھیں اور غالباً عرب کی تباہی کے ساتھ اسلام بھی ختم ہو جاتا۔

اہل شام اور مصر نے مروان بن حکم کو خلیفہ منتخب کیا جو مروان اول کے نام سے مشہور ہے چند سال تک ہنگامہ کارزار مختلف مقامات پر گرم رہا نیک نیت معاویہ ثانی کی ایک سیاسی غلطی کا خمیازہ تمام دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا۔ اور ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہ گیا۔ آخر بنو امیہ ہی کے حق میں برہان قاطع یعنی تلوار نے فیصلہ کر دیا۔

یہ ہیں واقعات۔ ہر ایک فریق کے داعیوں نے۔ چند پیش گوئیاں شائع کیں جو آنحضرت سے منسوب کی جاتی۔ مختار ثقفی چاہتا تھا کہ اس بدنظمی کے زمانہ میں اپنی خود مختار حکومت کوفہ کو مستقر بنا کر قائم کرے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قریش کے سامنے اس کی دال نہ گلے گی۔ اس لیے اسے بنو ہاشم میں ایسے شخص کی تلاش تھی جس کا اثر و رسوخ اس کا آلہ کار بن سکے۔ امام زین العابدین اس وقت مدینہ میں تھے ان کے پاس گیا اور کہا کہ حالات اتنے سازگار ہیں کہ اگر آپ خروج کریں تو تمام عرب آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائے گا۔ امام صاحب نے

صاف انکار کر دیا بلکہ اہل مدینہ کو مسجد نبوی میں جمع کر کے فیصلہ دیا کہ یہ مختار انتہائی فتنہ پرداز شخص ہے اس لیے اس کے شر سے بچو۔ یہاں سے مایوس ہو کر مختار عبداللہ بن زبیرؓ سے ملا اور یہی دعوت خلافت دی۔ عبداللہ بن زبیرؓ عرصہ سے اس کا ارادہ کر چکے تھے۔ مختار کی پیش کش قبول کر لی۔ مختار نے یقین دلایا کہ کوفیوں کی مدد سے میں شام پر حملہ کروں گا۔ کوفہ میں آیا اور لوگوں کو بھڑکایا۔ اور ساتھ ہی خزانہ کا منہ کھول دیا۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی مصعب نے بھائی کو تنبیہ بھی کیا مختار کی نیت بخیر نہیں وہ آپ کے نام پر لوگوں کو گرویدہ بنا رہا ہے جب عبداللہ بن زبیرؓ نے جواب طلب کیا تو مختار نے دیکھا کہ ابن زبیرؓ کے لیے وہب کا آدمی نہیں اس لیے محمد بن علیؓ بن ابی طالب المعروف ابن الحنفیہ کی طرف رجوع کیا۔ اور لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ خلافت کا حق بنو فاطمہ کا تھا مگر وہ خود ہی دست بردار ہو گئے اور علی بن حسینؓ اس کا اہل بھی نہیں اس لیے اولاد علیؓ میں سے محمد ابن الحنفیہ کو امام وقت اور خلیفہ برحق سمجھنا اس لیے بھی کہ آنحضرت ؐ نے حضرت علی کو ایک فرزند کی بشارت دی کہ اس کا نام میرا نام اور اس کی کنیت ابوالقاسم مری کنیت ہو گی۔ میری امت میں سے کسی اور کے لیے جائز نہیں میری کنیت اختیار کرے۔ اسی ایک کے لیے یہ خاص اجازت ہے۔ چنانچہ جب محمد بن الحنفیہ خولہ بن جعفر کے بطن سے پیدا ہوا تو کنیت ابوالقاسم سے مشہور ہوا۔ یہ بہت بڑا عالم دین تھا اور زہد و تقویٰ میں کسی سے کم نہ تھا۔ شدید القوۃ ایسا تھا کہ اس کے بارہ میں بہت عجیب و غریب حکایات مشہور

ہیں۔ (وفیات الاعیان از ابن خلکان)

یہ تو معلوم نہیں کہ محمد بن الحنفیہ نے خود کبھی دعویٰ خلافت کیا یا کسی لڑائی میں شریک ہوا۔ مگر مختار ثقفی کو پہلے عبداللہ بن زبیرؓ اور آپ کے بھائی سے سابقہ پڑا۔ مختار لڑائی میں مارا گیا۔ محمد بن الحنفیہ کی وفات یا حیات کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدینہ میں فوت ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ طائف کی طرف گیا ابن زبیرؓ سے لڑا اور وہیں فوت ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ "ایلہ" میں رحلت کی مگر ایک فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ فوت نہیں ہوئے "جبل رضوی" میں غائب ہو گئے۔ اور کسی وقت خروج فرمائیں گے۔ یہ فرقہ مختاریہ یا کیسانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن خلکان کہتا ہے کیسانی مختار ہی کا لقب ہے۔ اس فرقہ کے شعرا سید حمیدی اور کثیر نے محمد بن الحنفیہ کے مناقب میں بہت اشعار لکھے ہیں جن کو مسعودی مروج الذہب اور ابن خلکان وفیات میں نقل کرتا ہے کثیر کہتا ہے کہ

الا ان الائمۃ من قریش	سن رکھو امام تو قریش ہی سے ہیں
ولاۃ الحق اربعۃ سواء	مگر دوست داراں حق چار اشخاص ہیں
علی والثلاثۃ من بنیہ	ایک تو علی اور اس کے بیٹوں میں سے تین
ہم الاسباط لیس بہم خفاء	اس میں کوئی چھپی بات نہیں ہے
فسبط سبط ایمان و بر	ان میں سے ایک صاحب ایمان اور
وسبط غیبتہ کربلاء	نیکو کار ہے اور دوسرا کربلا میں مدفون ہے
وسبط لا تراہ العین حتی	وہ تیسرا فوت نہ ہوگا جب تک
یقود الخیل یتبعہا اللواء	لشکر کے آگے پرچم لہراتا ہوا خروج نہ کرے

یغیب لا یریٰ فیھم زمانا — اس عرصہ تک رضوی میں پوشیدہ ہے
عندہ عسل و ماء — اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا اس کے پاس
شہد اور پانی کی نہریں ہیں۔

فرقہ مختاریہ کا محمد بن حنفیہ کے بارہ میں یہ عقیدہ پختہ تھا کہ آپ دشمنانِ دین کے خوف سے روپوش ہیں اور کبھی مناسب وقت پر ظاہر ہوں گے۔ اس لئے "امامت" کی اب تین صورتیں پیدا ہو گئیں، ایک امام ظاہر، دوسرا امام غائب اور تیسرا امام منتظر، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تینوں صورتیں ایک ہی شخصیت کی ہیں۔ امام محمد بن حنفیہ امام ظاہر بھی تھے اور روپوش ہوئے تو امام غائب بھی ہیں اور آپ کی آمد ثانی کا انتظار بھی ہے اس لیے امام منتظر بھی ہیں۔ چونکہ اس موضوع کا تعلق آمد ثانی اور مہدویت سے بہت گہرا ہے اس لیے مناسب مقام پر ہم عقاید دوبارہ امامت پر مزید بحث کریں گے۔

مختار مارا گیا لیکن جو عقاید وہ اپنے متبعین کے ذہن میں راسخ کر چکا تھا اس نے ایک مستقل فرقہ کی صورت اختیار کرلی۔ امام محمد بن حنفیہ امام غائب اور منتظر رہے مگر جب اس شکل کا احساس ہوا کہ "غیبت" اور "انتظار" سے تو کام نہیں چل سکتا۔ امام غائب کا کوئی قائمقام خواہ عارضی ہو ضرور ہونا چاہیئے جس کا تعلق براہ راست امام غائب سے ہو اور جس کے ذریعہ معتقدین کو امام غائب کے احکام اور ہدایات ملتی رہیں تو "کیسانیہ" کی اصطلاح بھی وضع ہوئی دو صدی بعد "امامت" نے ایک علم کی صورت اختیار کرلی اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔

فرقہ مختاریہ خوب پھولا پھلا اور اس شجر کی کئی شاخیں یعنی فرقہ در فرقہ

پیدا ہوتے گئے ان کے عقائد میں حلول و تناسخ نے بھی جگہ لے لی۔ امام محمد بن حنفیہ کے بعد فرقہ مختاریہ کی ایک جماعت کا رجوع آپ کے بیٹے ابی ہاشم کی طرف ہوا۔ یہ فرقہ ہاشمیہ کہلایا۔ یہ بھی ابی ہاشم کی وفات کے بعد پانچ فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان میں سے ایک فرقہ "حربیہ" سے موسوم ہے جو عبداللہ بن عمرو بن حرب کندی سے منسوب ہے۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ابی ہاشم نے وصیت عبداللہ بن عمرو کے حق میں کی۔ صرف امامت ہی نہیں بلکہ ابی ہاشم کی روح نے عبداللہ میں حلول کیا۔ شہرستانی اپنی کتاب الملل والنحل میں کہتا ہے کہ :۔

"عبداللہ تناسخ کا قائل تھا اس کا دعویٰ یہ تھا کہ روح اللہ عیسیٰ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور آپ کی روح کا حلول مجھ میں ہوا ہے۔ اس لیے دعویٰ نبوت بحیثیت مثیل مسیحؑ اور الوہیت بلحاظ روح اللہ کیا۔"

فرقہ "حربیہ" کا زور عراق میں رہا، مگر عبداللہ خراسان میں مارا گیا تو اس کے متبعین میں یہ تفرقہ رونما ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ زندہ ہے اور دوبارہ آئے گا، دوسرا کہتا کہ فوت ہو گیا مگر اسکی روح اسحاق بن زید بن حارث الصاملی میں منتقل ہو گیا اس فرقہ کو حارثیہ کہتے ہیں۔

ان فرقوں اور ان کے عقاید پر اگر لکھا جائے تو ایک دفتر درکار ہے مختصر یہ کہ ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے امام کی آمد ثانی کا منتظر رہا۔ اور اگر یہ تسلیم کر لیا کہ وہ فوت ہو چکا ہے تو اس کی روح تو زندہ ہے وہ جس شخص میں منتقل ہوئی یا جس نے حلول و اتحاد کا دعویٰ کیا وہ امام تسلیم کیا گیا ہے۔ حضرت علی کی اولاد ایک تو بنو فاطمہ ہے اور یہ ہاشمی ہیں۔ اور دوسری اولاد علوی کہلائی۔ ہاشمیوں کے ہاتھ سے امامت نکلی تو علوی قابض ہوئے اور ان کے ہاتھ سے گئی تو غیر علوی قابض ہو گئے۔ چنانچہ ایسے امام بہت

ہوئے مگر ہمیں تذکرہ صرف ان حضرات کا مطلوب ہے جو کم از کم قریش تھے۔

عبداللہ بن زبیر بن عوام بن اسد کا مورث عبدالعزیٰ بن کلاب بن مرہ، عبد مناف کا بھائی تھا اور عبد مناف کے دو بیٹے عبد شمس اور ہاشم تھے، عبد شمس خاندان امیہ کا مورث ہے۔ حضرت زبیرؓ آنحضرت کی پھوپھی کے بیٹے تھے اور صدیق اکبر کی دختر "اسما" کے شوہر تھے جن کے بطن سے عبداللہ پیدا ہوئے۔ یہ پہلا مولود ہے جو مکہ سے مدینہ میں ہجرت کے بعد پیدا ہوا۔ آپ کی ولادت پر مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا اس لیے کہ یہود کہتے تھے کہ مسلمان عورتوں کے رحم بند ہیں حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے بھی ہیں۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ جب معاویہ ثانی تخت سے دست بردار ہو گیا تو عبداللہ بن زبیرؓ نے ارض حجاز میں دعویٰ خلافت کیا۔ آپ کی مدد آپ کے بھائی مصعب نے کی۔ مختار مصعب کے مقابلہ میں مارا گیا تو عبداللہ بن زبیرؓ کے قبضہ میں عراق کا اکثر حصہ بھی آگیا۔ اہل شام اور مصر نے جب مروان اول کو خلیفہ منتخب کیا تو ابن زبیر سے لڑائی ناگزیر امر تھا۔ ان ایام میں عبداللہ کی حکومت کو تقویت دینے کے لیے چند احادیث شائع ہو رہی تھیں کہ شام سے ایک فوج مکہ پر حملہ کے لیے آئے گی۔ مکہ اس وقت عبداللہ بن زبیر کا دارالحکومت تھا۔ شامی فوج مدینہ اور مکہ کے درمیان مقام "مرابق" پر زمین میں دھنس جائے گی۔ مکہ کا خزانہ "حبہ" کا منہ کھول دیا جائے گا اور امیر المومنین مسلمانوں کو مالا مال کر دیں گے۔ اور "رکن" اور "مقام" کے درمیان لوگ آپ کے دست حق

پرست پر بیعت کریں گے۔ ان میں سے آخری حصہ پیش گوئی تو عبداللہ بن زبیرؓ کے حق میں پورا ہوا۔ آپ نے "رکن" اور "مقام" کے درمیان بیعت المال اور خزانہ بھی اپنے متبعین میں فراخ دلی سے تقسیم کیا۔ مگر پہلا حصہ پورا نہ ہوا۔ شامی فوج نے مکہ کو محاصرہ میں لے لیا اور عبداللہ بن زبیرؓ یہاں لڑتے ہوئے کام آئے۔

یہاں تک تو پہلی صدی ہجری کے آواخر کے واقعات ہیں۔ اب ہم دوسری صدی ہجری میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہاشمی دعویداران خلافت و امامت و مہدویت کی قرابت حضرت علیؓ سے ذیل کے شجرہ نسب کو پیش نظر رکھنے سے واضح ہو جائے گی۔ اور اسی قرابت پر ان کے دعاوی مبنی تھے،

عبد مناف

ہاشم — عبد شمس

عبدالمطلب — امیہ

عبداللہ — عباس رض — ابوطالب — ابی لہب — حمزہ رض

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم — عبداللہ — جعفر — علی رض (ش ۴۰ھ / ۶۶۱ء) — عقیل رض

محمد علی — محمد

فاطمۃ زہرا رض — موسیٰ — منصور — عبداللہ سفاح — محمد بن حنفیہ رض (د ۸۱ھ / ۷۰۰ء) — حسین رض (د ۶۱ھ / ۶۸۰ء) — حسن رض (د ۵۰ھ / ۶۶۹ء)

عیسیٰ — محمد المہدی — علی زین العابدین رض (د ۹۴ھ / ۷۱۲ء) — حسن ثانی

عبداللہ

زید (د ۱۲۰ھ / ۷۳۴ء) — محمد الباقر رض (د ۱۱۸ھ / ۷۳۶ء) — محمد المہدی النفس الذکیہ (د ۱۴۵ھ / ۷۶۲ء) — ابراہیم

(د ۱۴۸ھ / ۷۶۵ء)

موسیٰ کاظم رض (د ۱۸۳ھ / ۷۹۹ء) — عبداللہ الافطح — اسماعیل

احمد — علی الرضا رض (د ۲۰۲ھ / ۸۱۸ء) — محمد

محمد الجواد التقی رض (د ۲۲۰ھ / ۸۳۵ء) — احمد

موسیٰ — علی الہادی رض (د ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء) — حسین

محمد القاسم (د ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء)

جعفر — محمد عسکری رض (د ۲۶۰ھ / ۸۷۴ء) — محمد — عبداللہ المہدی

القائم — محمد المہدی (امام غائب و منتظر) (د ۲۶۰ھ / ۸۷۴ء) — (خلفاء بنو فاطمہ)

بنو ہاشم کے دو قبائل بنو فاطمہ اور بنو عباس کی متحدہ کوشش سے ایک صدی کے بعد بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب بنو فاطمہ اور بنو عباس میں مسئلہ خلافت "متنازعہ" کا موضوع بن گیا۔ عبداللہ السفاح عباسی نے تو چند سال بنو امیہ کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے میں بسر کر دیے۔ یہ فوت ہوا تو اس کا بھائی منصور تخت خلافت پر متمکن ہو گیا۔ بنو عباس کا ایک داعی ابو مسلم خراسانی تھا جس کا سلسلہ نسب حکیم بوزرجمہر ایرانی وزیر نوشیرواں سے ملتا ہے، اس نے بنو عباس کا ساتھ اسی نیت و ارادہ سے دیا جس کے ساتھ مختار نے پہلے عبداللہ بن زبیرؓ اور بعدازاں محمد ابن الحنفیہ کا دیا تھا۔ ابو مسلم یہ چاہتا تھا کہ قریش کی خانہ جنگی کا فائدہ اٹھا کر پھر ایرانی حکومت اور مذہب قائم کر دے۔ مگر تخت کہاں خالی تھا۔ اس لیے اس نے بنو عباس کو آلہ کار بنانا چاہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کی کوشش سے بنو امیہ کی حکومت جو خالص عرب حکومت تھی شام میں ختم ہو گئی۔

حریف قبیلہ بنو فاطمہ کا ایک داعی مغیرہ بن سعید عجلی تھا۔ طبری اور ابن حزم نے اس کی سرگرمی کا تذکرہ لکھا ہے کہ اسی نے اعلان کیا کہ محمد المعروف النفس الذکیہ مہدی موعود ہے جس کی نسبت آنحضرت کی پیش گوئی ہے کہ اس کا نام میرا نام اور اس کے والد کا نام میرے والد کا نام ہو گا۔ مغیرہ کو خالد بن عبداللہ قسری نے جو اموی حکومت کی طرف سے والیٔ عراق تھا ۱۱۹ھ میں بغاوت کے جرم میں قتل کیا۔ مگر مغیرہ کی کوشش سے اکثر اہل عراق، بنو فاطمہ کے حق میں علم بغاوت بلند کرنے پر تیار ہو گئے اس وقت تک خود محمد النفس الذکیہ نے خود دعویٰ مہدیت کیا تھا اور

نہ خروج کیا۔ مغیرہ یہی کہتا رہا کہ امام برحق کا ظہور وقت مقررہ پر ہوگا اور وہ "رکن" اور "مقام" کے درمیان لوگوں سے بیعت لے گا۔ اگرچہ یہ پیش گوئی عبداللہ بن زبیرؓ کے حق میں پوری ہو چکی تھی مگر وہ امام برحق نہ تھا اس لیے کامیاب نہ ہوا۔ مغیرہ تو مارا گیا مگر فرقہ مغیرہ کی بنیاد رکھ گیا جس نے محمد النفس الذکیہ کے خروج کے وقت آپ کا ساتھ دیا۔ چونکہ عوام کو بنو فاطمہ سے خاص عقیدت تھی اس لیے جب النفس الذکیہ نے دعویٰ خلافت کیا تو ائمہ دین نے بھی تائید کی۔

منصور عباسی سخت پریشان ہوا، ایک تو ابھی خلافت عباسیہ کو استقلال حاصل نہ ہوا تھا۔ دوسرے عوام بنو فاطمہ کے حامی تھے اس نے کوشش کی کہ النفس الذکیہ کو میدان جنگ میں نہیں سیاسی چال سے شکست دے۔ محمد کو ایک خط لکھا کہ اگر اطاعت کرو تو تمہیں اور تمہارے کل خاندان کے افراد اور متبعین کو امان دیتا ہوں اور تمہاری اور ان سب کی حفاظت جان و مال کا ذمہ لیتا ہوں۔ ایک لاکھ درہم بطور وظیفہ بھی پیش نذر ہے اور جہاں خواہش ہو رہو میری طرف سے اجازت ہے۔

ابن خلدون نے یہ نامہ و پیام جو دو حریف دعویداران خلافت میں جاری رہا قلم بند کیا ہے۔ محمد النفس الذکیہ نے منصور کی پیش کش کا جواب دیا۔

"تم فرعون ہو اور تمہارے مطیع آل فرعون ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کے شائیہ ہیں جن پر تم نے فرعونوں کی طرح طرح طرح کے ظلم کیے۔ حالانکہ خلافت ہمارا حق ہے اور تم ہمارے سبب اس کے مدعی بنے اور تمہاری کامیابی ہمارے ہی باعث ہوئی، لوگوں نے سمجھا کہ تم ہماری امداد کر رہے ہو اس لیے تمہارا ساتھ دیا۔ تم نے تقویت حاصل کر کے ہمارا حق غصب کر لیا

تم مطیع تھے اب مختار بن بیٹھے"۔

▪ ہمارا باپ علی وصی اور امام ہے (محمد النفس الذکیہ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی تیسری پشت میں ہے) کسی کا سلسلہ قرابت ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا سابقیت اور فضل کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تم پر شرف دیا ہے اور برگزیدہ بنایا ہے، انبیوں میں ہمارے والد محمدؐ سب سے افضل ہیں اور سلف میں علی رضی اللہ عنہ جو سب سے پہلے اسلام لائے۔ ازدواج میں خدیجہ طاہرہ ہیں جنہوں نے سب سے اول قبلہ روح نماز پڑھی اور لڑکیوں میں بہتر دختران رسول اللہ ہیں اور ان میں فاطمہ سعیدۃ النسا عالمین ہیں۔ دین اسلام میں حسن اور حسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔ میں باعتبار نسب بہترین بنی ہاشم ہوں مجھ میں کسی عجمی کا میل نہیں۔ اور نہ ہی میں کنیزک زادہ ہوں اور نہ میرے سلسلہ نسب میں یہ عیب ہے۔ شروع سے میرے آباد اجداد اور امہات ممتاز چلے آئے ہیں، میں اس کا بیٹا ہوں جس کا مرتبہ سب سے اعلیٰ وارفع ہے (آنحضرت)، میں اس کا فرزند ہوں جس کو دوزخ میں کمتر عذاب ہوگا (ابوطالب)"۔

▪ میں اللہ تعالیٰ کو ضامن دے کر تمہیں امان دیتا ہوں بشرط اطاعت اور میں تم سے زیادہ مستحق خلافت ہوں اور عہد کو پورا کرنے والا ہوں تم مجھ سے پہلے بھی لوگوں کو امان دے چکے ہو ان لوگوں میں سے تم مجھے کس کی امان دیتے ہو، ابن ھبیرہ یا عبداللہ بن علی یا ابومسلم خراسانی کی ▪

خط کے آخری فقرہ میں النفس الذکیہ نے طنزاً اشارہ منصور کی بدعہدی کی طرف کیا کہ ان لوگوں کو تم نے فریب سے قتل کیا۔ ابومسلم خراسانی کے ارادوں کا جب حال منصور کو معلوم ہوا تو شام کی حکومت پیش کی۔ مگر خراسانی تاڑ گیا

کہ منصور اس کے اثر ورسوخ کو جو اس کا اہل خراساں پر تھا زائل کرنا چاہتا ہے۔ اور اہل خراساں اس کے اپنے بھائی ہی تھے۔ منصور نے کہلا بھیجا کہ خراساں کی حکومت بھی تمہاری ہے۔ یہاں اپنا کوئی نائب معتمد مقرر کر دو۔ شام میں ابھی تک اموی اثر ہے اور تمہارے سوا میں کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ اپنے رشتہ داروں کو بھی شام کی ولایت نہیں دے سکتا ممکن ہے کہ وہ وہاں علم بغاوت بلند کر دیں۔ تم فوراً میرے پاس بغداد میں پہنچو، نیز مجھے کچھ راز دارانہ باتیں تم سے کرنی ہیں جو تحریر میں نامناسب ہیں۔ ابو مسلم چکمہ کھا گیا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ خراساں تو میرا اپنا ہے شام کا ملک اگر قبضہ میں آ گیا تو طرفداران بنو امیہ کی مدد سے عباسیوں کو نیچا دکھا سکتا ہوں۔ یہ زود طبع دیدہ ہوشمند، مگر اس نے اتنی احتیاط کی اپنے ساتھ چند ہزار جانثار سپاہی بطور محافظ فوج بھی ساتھ لایا۔ منصور نے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ محافظ فوج کی ہر طرح دلجوئی کی ابو مسلم خراسانی کی سات روز شاہانہ دعوت میں بہت کچھ عزت افزائی بھی کی۔ ابو مسلم اب بالکل مطمئن تھا۔ ساتویں روز مہمان عزیز کو الوداع کرنا تھا، آخری ضیافت نہایت پر تکلف تھی۔ ابو مسلم کے ہمراہ چند جانثار سپاہی مدعو تھے۔ خلیفہ راز کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے خلوت کی ضرورت تھی۔ ابو مسلم کو ان سے الگ ایک کمرہ کی طرف لے گیا۔ گھات میں عباسی سپاہی تھے۔ ایک دفعہ ہی خراسانی پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس کا کام تمام کر دیا۔ خراسانی سپاہیوں کو بھگا دینا کون سی مشکل بات تھی۔

ہم نے ابو مسلم کا بالخصوص ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ اس لیے لکھا ہے کہ ابو مسلم نے اپنا ایک مذہب خراساں میں شائع کیا جو بعد میں

"خرمیہ" کہلایا۔ اس فرقہ کے لوگ ابومسلم کو مظہر الوہیت کہتے، اور کبھی ابومسلم کی وفات پر یقین نہیں کیا۔ کہتے کہ وہ مصلحتاً روپوش ہے اور کسی وقت سیاہ جھنڈوں کے ساتھ جو اس نے بنو عباس کے نام پر اپنے متبعین کا امتیازی نشان مقرر کیا تھا خروج کرے گا۔ ان سیاہ جھنڈوں کے ساتھ مہدی کا خروج بھی بعض احادیث میں مذکور ہے۔ اس مذہب نے ایرانیوں میں کئی مدعیان مہدویت پیدا کر دیے۔

نفس ذکیہ کا جواب الجواب منصور نے یہ دیا کہ:۔

"تمہارے فخر کا دار و مدار صرف عورتوں کی قرابت پر ہے۔ اور یہ ابلہ فریب باتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو چچاؤں اور باپوں اور عصبہ ولیوں کی طرح نہیں بنایا، چچا کو باپ کا قائمقام بنایا ہے بلکہ کتاب اللہ میں وہ قریب ترین ماں پر مقدم ہے (یہ دعویٰ محل نظر ہے) اگر اللہ تعالیٰ عورتوں کی قرابت کا پاس کرتا تو آمنہ (والدہ آنحضرت) ان میں سے اقرب اور سب سے بڑھ کر حق والی ہوئی اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے ان لوگوں کو جو گذر گئے پیدا کیا، اور تم نے فاطمہ ام ابی طالب اور اس سے پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے اس کی تو یہ حالت ہے کہ اس کا کوئی لڑکا اور لڑکی اسلام سے بہرہ ور نہیں ہوئی اور اگر اللہ تعالیٰ کو مردوں میں سے کسی کو بوجہ قرابت رسول اللہ دائرہ اسلام میں داخل کرنا منظور ہوتا تو عبداللہ (والد آنحضرت) کو یہ شرف عطا ہوتا بیشک وہ دنیا اور آخرت میں بہتر تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے

دین میں جس کو چاہا داخل فرمایا اور فرماتا ہے کہ انک لا تہدی من احببت ولکن اللہ یہدی من یشاء وھو اعلم بالمہتدین جب اللہ تعالےٰ نے آنحضرت کو مبعوث فرمایا، اس وقت آپ کے چار چچا زندہ موجود تھے۔ جب انذر عشیرتک الاقربین نازل فرمائی تو دو نے اسلام قبول کیا (حمزہ رض اور عباس رض) اور ان میں سے میرا باپ عباس ہے اور دو (ابی طالب اور ابی لعب) نے انکار کیا اور ان میں سے ایک ابی طالب تمہارا باپ ہے اسلئے اللہ تعالےٰ نے دونوں کا سلسلہ ولدیت آنحضرت سے منقطع کر دیا اور آنحضرت اور ان میں سے کوئی تعلق عزیزداری اور نصرت اور میراث قائم نہ کیا اور تمہارا یہ خیال خام ہے کہ تم خیر الاشرار (ابی طالب) کے بیٹے ہو۔ اللہ تعالےٰ کے ساتھ کفر کرنے میں کوئی صغیر نہیں ہوتا۔ اور شر میں کوئی بہتر نہیں ہوتا اور کسی مرد مومن کو زیب نہیں دیتا کہ کسی دوزخی کی اولاد ہونے پر فخر کرے۔ اور قریب ہے کہ تم خود دوزخ میں جاؤ گے ارشاد الٰہی ہے جو قریب تر زمانہ میں ظالم جان لیں گے کہ وہ کس انقلاب کی زد میں میں ہیں، تم نے لکھا ہے کہ حسن رض عبدالمطلب سے دوہرا معاملہ قرابت رکھتے تھے اور تمہیں رسول اللہ سے دو طرفہ تعلق قرابت ہے، بیشک خیر الاولین و الآخرین رسول اللہ ہیں، آپ کو ہاشم اور عبدالمطلب سے صرف ایک پدری تعلق تھا، اور تمہارا یہ زعم کہ تم بہترین بنو ہاشم ہو اور یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد و امہات ان میں زیادہ مشہور تھے اور یہ کہ تم میں کنیزک کا لگاؤ نہیں ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم نے کل بنو ہاشم سے آپ کو متنفر بنا دیا ہے۔ غور کرو لعنت ہے تم پر۔ کل اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دو گے۔ تم حد سے بڑھ گئے ہو اور تم نے اس سے بڑھ کر اپنا فخر جتایا ہے جو ذات و صفات میں تم سے افضل تھا ابراہیم ابن محمد رسول اللہ جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور بالخصوص تمہارے باپ کی اولاد میں سے کوئی افضل سوائے کنیزک زادوں کے نہیں۔ بعد وفات رسول اللہ تم میں علی بن حسین (امام زین العابدینؑ) سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہوا اور وہ کنیزک زادہ تھے۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان کا مرتبہ تمہارے دادا حسن بن حسین سے بڑا ہے۔ اور ان کے بعد تم میں سے محمد بن علی کی مثل کوئی نہیں ہوا۔ اور ان کی دادی کنیزک تھیں۔ اور جعفر تم سے بہتر ہے، تمہارا دعویٰ کہ تم رسول اللہ کے بیٹے ہو قطعاً غلط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ماکان محمد ابا احد من رجالکم" تم لوگ آنحضرت کی لڑکی کے لڑکے ہو اور بیشک یہ قرابت قریبہ ہے۔ مگر اس کو میراث نہیں پہنچ سکتی اور نہ یہ ولایت کی وارث ہو سکتی ہے اور نہ اس کو امامت جائز ہے تمہارے باپ علیؓ نے اس کی ہر طرح سے خواہش کی تھی۔ فاطمہؓ کو روز روشن نکالا اور در پردہ ان کو بیمار کیا اور رات کے وقت دفن کر دیا۔ بایں ہمہ لوگوں نے ابوبکر اور ان کے بعد عمر کے بسوا کسی کو منظور نہیں کیا۔ اس میں مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہے کہ نانا اور ماموں اور خالہ مورث نہیں ہوتے۔

"تم نے جو علیؓ کے سابق الاسلام ہونے پر فخر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ نے بوقت وفات ابوبکر کو امام بنایا۔ بعد ازاں لوگ ایک کے بعد دوسرے کو امام بناتے گئے۔ اور علیؓ کو منتخب نہ کیا۔ حالانکہ یہ بھی ان چھ بزرگوں میں سے تھے جن کو عمر نے نامزد کیا تھا۔ آپ کو خلافت کے لائق نہ سمجھا، عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے عثمان کو ان پر مقدم کر دیا۔ طلحہؓ اور زبیر رضؓ آپ سے لڑے (جنگ جمل میں) اور سعد نے آپ کی بیعت سے انکار کیا۔ اور معاویہ کی بیعت کر لی، تمہارے باپ نے خلافت کی تمنا کی اور لڑے (جنگ صفین میں) اور آپ سے آپ کے مصاحب علیحدہ ہو گئے اور حکمین (عمرو بن العاص اور ابوموسیٰ اشعری) مقرر کرنے سے پہلے ان کے ہواخواہ (خوارج) آپ کے استحقاق میں شک و شبہ کرنے لگے حکمین نے آپ کی معزولی پر اتفاق کر لیا۔ پھر آپ کی شہادت کے بعد حسن رضؓ خلیفہ ہوئے، امامت اور خلافت کو معاویہ کے ہاتھ کپڑوں اور روپیوں کے عوض فروخت کر دیا۔ اور اپنے بدخواہوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا۔ بس اگر تمہارا اس میں کچھ حق بھی تھا تو تمہارے باپ نے فروخت کر ڈالا۔ اور قیمت وصول کر لی۔ پھر تمہارے چچا حسینؓ نے ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر خروج کیا۔ ان لوگوں نے آپ کو قتل کیا، خرما کی ڈالیوں پر سولی دی، آگ میں جلایا، شہر بدر کیا، ہم نے تمہارے خون کا بدلہ لیا۔ اور تمہیں ان کی املاک کا مالک بنایا، تمہارے باپ دادا کا نام بلند کیا اور فضیلت دی، کیا تم اس احسان کے ذریعہ ہمیں معقول کرتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم لوگوں کی بزرگی ایام جاہلیت (بہ حیثیت آنحضرتؐ سے پیشتر) حجاج کو پانی پلانے (سقایہ) اور ولایت زمزم پر منحصر تھی۔ تمہارے باپ علی نے اس استحقاق

کے بارہ میں ہم سے جھگڑا کیا۔ عمرؓ نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا۔ آنحضرتؐ کے بعد بنی عبدالمطلب میں سے کوئی شخص سوائے عباسؓ باقی نہ تھا۔ اس لیے وراثت چچا کی طرف منتقل ہو گئی۔

اس لفظی مجادلہ میں فریقین حق خلافت و امامت قرابت آنحضرتؐ قرار دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی بنو عباس اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔ جب اہل تین خلفا کا انتخاب اس استحقاق کو نظر انداز کرنے کے بعد ہوا ظاہر ہے کہ امت نے یہ کوئی حق تسلیم نہ کیا۔ اور جب منصور یہ کہتا ہے کہ آنحضرتؐ نے بوقت وفات ابوبکرؓ کو امام بنایا تو دبی زبان سے یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ حق امامت حق قرابت پر مبنی نہیں تھا۔ بہر حال جب معقول دلائل سے کام نہ چلا تو برہان قاطع تلوار نے فیصلہ کر دیا۔

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست — کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند

اس مجادلہ میں محمد النفس الذکیہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں امام مہدی موعود ہوں اور میرے بارہ میں آنحضرت کی احادیث ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متبعین یا داعیان نے آپ پر احادیث چسپاں کر دیں۔ جو غالباً ان لوگوں نے وضع کیں اور ان احادیث کو بھی آپ کا مصداق قرار دیا جو ابن زبیرؓ کے بارہ میں شائع ہو چکی تھیں۔

منصور کے بیٹے کا نام محمد المہدی ہے اور منصور کے بھائی موسیٰ کا بیٹا عیسےٰ اس وقت افواج عباسیہ کا سپہ سالار تھا۔ امام مہدی (عباسی) اور حضرت عیسےٰ (عباسی) کا مقابلہ میدان جنگ میں نفس ذکیہ سے ہوا۔ نفس ذکیہ موت کا ذائقہ شناس ہوا۔ میدان مہدی (عیسیٰ) کے ہاتھ رہا۔ نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم نے بصرہ سے خروج کیا۔ مہدی (عیسےٰ) نے

اسے بھی شکست دے کر مارا۔ منصور عباسی کے بعد اس کا بیٹا محمد المہدی تخت خلافت پر متمکن ہوگیا۔ لیکن اس نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں مہدی موعود ہوں۔ اس کے بعد اس کا بیٹا "ہادی" تخت نشین ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مہدی و ہادی نام اس غرض سے والدین نے نہیں رکھے تھے۔ کہ لوگ ان کو مہدی موعود سمجھ کر ان کی اطاعت کریں۔ اور خود ابن زبیرؓ اور محمد نفس ذکیہ نے بھی ایسا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ البتہ بعض احادیث کو ان کے متبعین نے ان کی شخصیت پر چسپاں کیا۔ مگر مہدی موعود کی اصطلاح یا تو اس وقت تک وضع ہی نہ ہوئی تھی یا اس کا صاف صاف ممیز تصور جیسا کہ ہمارے زمانہ میں ہے دوسری صدی ہجری میں نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاری میں "مہدی" کے بارہ میں کوئی حدیث نہیں۔ یا تو اسے ایسی کوئی حدیث نہیں ملی اور اگر ملی تو اس نے صحیح قرار نہ دی محض سیاسی اختراع سمجھ کر مسترد کر دی۔ حالانکہ امام بخاری دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی کے نصف تک (۱۹۴-۲۵۶ھ) تک موجود تھا۔ اس لیے قرین عقل یہی ہے کہ امام بخاری کے آخری وقت تک "مہدی" کی اصطلاح وضع نہ ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اصطلاح کب اور کس نے وضع کی؟ اس کی تحقیق کے لیے ہمیں پھر سے ابو مسلم خراسانی کی طرف رجوع کرنا چاہیے شہرستانی لکھتا ہے کہ:-

"ابو مسلم کا مذہب کیسانیہ تھا جو مختار سے منسوب ہے"۔ (ہم بیان کر چکے ہیں کہ کیسانیہ کی ایک شاخ "حربیہ" ہے جو عبداللہ بن عمرو بن حرب کندی سے منسوب ہے اور اس مذہب کے عقاید بھی بیان کر چکے ہیں) ابتدا میں ابو مسلم کی تعلیم و تربیت اسی مذہب پر ہوئی"۔ (جس میں الوہیت

وحلول وتناسخ نمایاں عقیدہ ہے" اس نے کوشش کی کہ کسی طرح سے امام جعفر صادق رضؓ کو اپنے دام تزویر میں لائے" (ٹھیک اسی طرح جس طرح مختار نے زین العابدین کو پھنسانا چاہا تھا) "مگر جب ادھر سے ناامید ہوا تو ابوالعباس بنی محمد کی طرف رجوع کیا۔ اسی کی کوشش سے بنو امیہ کا تختہ حکومت شام میں الٹ گیا۔ اور خلافت پر قبضہ بنو عباس کا ہو گیا۔ ابومسلم خلیفہ عباسی منصور کے اشارہ پر مارا گیا مگر اس کی نسبت خراسانی جانثاروں کا یہ عقیدہ پختہ تھا کہ وہ مظہر الوہیت ہے اور زندہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابومسلم اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔"

اقوام آریا، ایرانی، ہندوستانی، یونانی وغیرہ ہمیشہ سے دیوتا پرست رہے ہیں اور اپنے راجوں اور دینی پیشواؤں رشیوں منیوں کو "اوتار" مظہر الوہیت سمجھ کر ان کی پوجا بھی کرتے رہے۔ توحید کا صحیح صحیح تصور ان کے ذہن میں نہ کبھی تھا اور نہ آج تک ہے۔ یونانیوں اور رومیوں نے مسیحؑ کو بحیثیت ایک دیوتا اور خدا اور خدا زادہ ہی تسلیم کیا۔ اور اسی عقیدہ پر آج تک قائم ہیں۔ حالانکہ مسیحؑ یہودی تھے اور اس شرک سے آپ کو [illegible] کی نسبت بھی نہیں۔ جب ایرانیوں نے اسلام قبول کیا تو یہ عقیدہ جو وراثتاً ان کے ذہن میں پختہ ہو چکا تھا محو نہ ہوا۔

بنو ہاشم کے داعیوں نے وہی روش اختیار کی جو پولوس یونانیوں اور رومیوں میں مسیحؑ کے نام پر کر چکا تھا۔ ایرانیوں کو دعویداران خلافت وامامت کا گرویدہ بلکہ ان سے والہانہ محبت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا کہ ان کو دیوتا اور اوتار کی حیثیت سے پیش کیا۔ دیوتا مرنا نہیں جانتے وہ بشری صورت میں خدا ہوتے ہیں۔ وہ صرف روپوش ہو جاتے ہیں۔

اور پھر کسی مناسب وقت پر ان کا ظہور ہوتا ہے اور جب یہ عقیدہ پختہ ہوگیا اور آریا ذہنیت میں پہلے ہی اتنا راسخ تھا کہ ان کی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا تو "آمد ثانی" کا انتظار بے صبری سے کیا جاتا۔ اور جب کوئی مدعی کھڑا ہو جاتا تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا، وہ خود خواہ لاف نبی سے کام نہ لیتا مگر "مریداں می پرانند" کی صورت پیدا ہو جاتی اور ایک نئے فرقہ یا مذہب کی بنیاد پڑ جاتی۔ عرب بالخصوص قریش کے ذہن میں تو دیوتا کا روپ دھارنے کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن نومسلم مجوسی اس سوانگ سے خوب واقف تھے۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے شروع میں کوفہ میں نومسلم مجوسی کثرت سے آباد ہو چکے تھے، بنو ہاشم دعویداران خلافت اور امامت تھے، لیکن یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بنو امیہ کا پشت پناہ تمام عرب تھا اور اموی خلافت خالص عرب حکومت تھی بنو ہاشم کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ انہی نومسلم مجوسوں کی مدد سے اموی حکومت ختم کر کے اپنا راج پاٹ قائم کرتے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی کوفہ کو مدینہ کی جگہ مستقر خلافت اسی لیے تجویز فرمایا تھا کہ یہ مقام ایران سے نزدیک تر ہے۔ بہرحال جب کبھی بنو ہاشم کی تائید ہوئی اسی شہر کوفہ سے اس کی ابتدا ہوئی۔

ایرانی بنو ہاشم کی تائید بظاہر اس لیے کر رہے تھے کہ ان کی قرابت قریبہ آنحضرت سے ہے۔ لیکن اس کی ایک سیاسی غرض بھی تھی۔ بنو امیہ کی خلافت خالص عرب حکومت تھی اور اسی عرب حکومت نے ایران کی قومی حکومت کے ساتھ اس کی تہذیب و تمدن اور مذہب مٹا دیا تھا۔

ان میں بعض افراد کے دل میں قومی جذبہ انہیں اس بات پر ابھار رہا تھا کہ پھر سے گذشتہ شان وشوکت وعظمت بحال کریں۔ اور یہ ممکن نہ تھا جب تک عرب حکومت ان پر مسلط تھی اور اس وقت اس کی نمایندگی بنو امیہ کر رہے تھے۔

قاسم زادہ ایرانی نے اپنی کتاب "جلوہ ریزی روح ایران" میں صاف صاف الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ ایرانیوں کو نہ تو بنوامیہ سے کوئی خاص دشمنی تھی اور نہ بنو ہاشم کا عشق تھا۔ وہ تو عرب حکومت کے دشمن تھے، خواہ اس کی نمایندہ اموی یا عباسی یا فاطمی حکومت تھی۔ ان میں خاندانی رقابت کا فائدہ انہوں نے اٹھایا۔ اگر بنو فاطمہ کا ساتھ دیا تو اس لیے کہ اموی حکومت تباہ ہو اور اگر بنو عباس کا ساتھ دیا تو اس لیے کہ دونوں ہلاک ہوں، اور رفتہ رفتہ قوت اور اقتدار ایران میں منتقل ہو جائے۔

مولف "دبستان مذاہب" نے واقعات کی بنا پر لکھا ہے کہ اس کے اپنے زمانہ میں (اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں) ایسے مجوسی بھی تھے جن سے ملاقات اور رفتہ رفتہ دوستی کا شرف مؤلف کو حاصل رہا۔ کہ بظاہر مسلمان تھے اور اسلامی ناموں کے ساتھ مسلمانوں میں ملے جلے رہتے مگر دل میں ژند اوستا رچا ہوا تھا۔ اور عوام میں خاموشی کے ساتھ اپنے ہی عقاید شائع کرتے تھے، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ خلافت عباسیہ کے وقت اس قماش کے لوگ جن کی سرگرمی کا مرکز کوفہ تھا بغداد اور بصرہ میں ایسی احادیث شائع کر رہے تھے جو ان کی اپنی وضع کردہ تھیں۔ اور ان کی احادیث ژند اوستا ہی کی باتیں تھیں۔ ایسی احادیث پہلی صدی

ہجری کے اواخر ہی سے شائع ہو رہی تھیں۔ دوسری اور تیسری صدی میں تو دنیا اسلام کے طول و عرض میں کثرت سے شائع ہو چکی تھیں۔ بہت عرصہ بعد مسلمانوں کو اس کا علم ہوا۔ ان لوگوں کو مسلمانوں نے "زندیق" سے مخاطب کیا۔ جو معرب ہے "زند" کا اور یہ پارسیوں کی مقدس کتاب "اوستا" کی مقدس زبان ہے۔ واضعان احادیث تو اور بھی حضرات تھے واعظ اپنی گرم بازاری کے لیے اور اکثر ثقہ لوگ فضائل اور ترغیب کے لیے نیک نیتی سے حدیثیں بے تکلف وضع کرتے تھے، اس کا مذکور ملا علی قاری نے اپنی کتاب "موضوعات کبیر" میں مفصل کیا ہے چودہ ہزار احادیث صرف ان زندیقوں کی اختراع تھے۔ زندیق عبدالکریم وضاع جب گرفتار ہوا تو اس نے تسلیم کیا کہ چار ہزار احادیث صرف اسی اکیلے نے وضع کیں اور یہ بھی کہا کہ جو چاہو مجھ سے سلوک کرو وہ میرا مقصد حاصل ہو چکا ہے ملک کے طول و عرض میں یہ احادیث شائع ہو چکی ہیں جس میں میں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا اور اب تمہارے مٹائے سے مٹ نہیں سکتی۔

اگرچہ یہ صحیح حدیث "تواتر" سے منقول ہو رہی تھی کہ آنحضرتؐ نے منع قرار دیا تھا کہ قرآن کے سوا کوئی اور حدیث جو مجھ سے منسوب ہو قلم بند نہ کی جائے۔ مگر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ موضوعات کی کثرت نے مسلمانوں میں فرقہ بندی کے ساتھ شر انگیز تفرقہ ڈال دیا اس لیے بعض دور اندیش حضرات نے احادیث کی تحقیق اور بھی بلحاظ روایت شروع کر دی۔ امام بخاری نے کئی لاکھ شائع شدہ احادیث جمع کیں۔

انتخاب کے بعد کل ۷۳۹۷، احادیث "جامع صحیح" میں قلم بند کیں اور اگر "تکرارات" نظر انداز کی جائیں تو ان کی تعداد ۲۷۶۱ رہ جاتی ہے۔ ورایتاً کسی حدیث کو نہیں پرکھا گیا۔ لہٰذا اس کی بھی ضمانت نہیں کہ تمام احادیث جو "جامع صحیح" میں ہیں امام صاحب کی انتخاب کردہ ہیں۔ الحاقی نہیں یا ان میں ردو بدل کبھی نہیں ہوا۔ جبکہ بقول علامہ ابن خلدون اس وقت زیادہ تر اہل قلم عجمی ہی تھے۔

"مہدی" کے بارہ میں امام بخاری تو خاموش ہیں اور قیاس غالب یہی ہے کہ امام صاحب کے وقت یہ اصطلاح وضع نہ ہوئی تھی اور اگر ہوئی تو اس کا علم نہ تھا۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مہدی کے ظہور یا آمد ثانی کا عقیدہ حضرت شیعان علی ہی میں محدود رہا اور ان میں اکثریت اہل ایران کی ہے۔ اہل سنت و الجماعت بہت عرصہ بعد اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے اور آج بھی شیعان علی کے ہمنوا ہیں۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ جب بنو فاطمہ اور بنو عباس اور نو مسلم ایرانیوں کی متحدہ طاقت اور سیاسی ریشہ دوانی سے جس کا جال داعیان بنو ہاشم نے ملک کے طول و عرض میں بچھا رکھا تھا بنو امیہ کی حکومت کا تختہ شام میں الٹ گیا تو بنو فاطمہ اور بنو عباس خلافت اور امامت کے لیے دست و گریباں ہوئے۔ ایرانی دونوں جانب اپنے مفاد کے لیے اور ممکن ہے کہ بعض خلوص نیت سے طرفدار تھے۔ ہم صرف تین اشخاص کو منتخب کرتے ہیں ان میں سے ایک ابومسلم خراسانی تھا اور دوسرا مغیرہ بن سعید اور تیسرا ابو منصور تھا۔ اول الذکر دو کے مختصر حالات ہم بیان کر چکے ہیں۔ ابومسلم تو بنو عباس کا داعی تھا اور موخر الذکر دو بنو فاطمہ کے داعی تھے۔ دونوں

قبیلہ عجمی کے "موالی" تھے،

اصطلاح "موالی" کا مفہوم بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے۔ اکثر اہل قلم کو مغالطہ ہوا ہے کہ اس اصطلاح کا اطلاق عجمی لوگوں پر ہوتا ہے جو عربی حکومت کے کسی قبیلہ کے غلام تھے اور پھر خدمات کے صلہ میں آزاد کیئے گئے۔ کچھ شک نہیں کہ بعض حالات میں ایسے لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بدعت اموی حکومت میں رائج ہوئی۔ قرآن میں تو "انما المومنون اخوۃ" ہی ہے۔ اور آنحضرت نے مہاجرین وانصار میں "مواخاۃ" قائم کی مگر یہ سب مدنی اور مکی عرب ہی تھے جب غیر عرب حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اور اشاعت اسلام کا سہرا بھی اموی خلافت کے سر ہے تو عرب وعجم میں "مواخاۃ" نہیں بلکہ "موالات" قائم کی گئی۔ اس لیے کسی عربی قبیلہ کے دوست عجمی موالی کہلائے، عجمیوں کو بنوامیہ کے خلاف سخت متعصب واقع ہوئے تھے یہ شکایت بھی تھی کہ باوجود قبول اسلام عرب ان سے برادرانہ سلوک نہیں کرتے۔ اور یہ شکایت بجا تھی۔

تینوں ابومسلم اور مغیرہ اور ابومنصور تین فرقوں کے بانی ہیں۔ ابومسلم کا مذہب خرمیہ تو خراسان میں پھولا پھلا اور بابک خرمی اور حکیم مقنع جیسی شخصیتیں اسی مذہب پر تھیں۔ عباسی خلیفہ محمد المہدی سے مستعصم باللہ تک کو بار بار ان کی سرکوبی کے لیے لشکر کشی کرنی پڑی مگر یہ بھی جب حالات ذرا سازگار ہوتے علم بغاوت بلند کرتے۔ خلیفہ محمد المہدی اور اس کے جانشین ہادی نے ان کو چن چن کر قتل کیا مگر ان میں کمی واقع نہ ہوئی۔

ابومنصور امام ابوجعفر الملقب بہ الباقر کا ہمعصر تھا اور آپ کی امامت کا ایسا ہی قائل تھا جیسے مختار محمد ابن الحنفیہ اور ابومسلم عباسیہ کا۔ جب تک

امام زندہ رہے اس نے اپنے عقیدہ کی تبدیلی کا اظہار نہ کیا آپ کی وفات (سنہ ۱۱۷ھ) پر خود دعویدار امامت ہوا۔ فرقہ جس کی طرح ڈال چکا تھا پہلے باقریہ پھر بعد وفات امام "منصوریہ" سے موسوم ہوا۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ امام باقر پانچویں امام ہیں لہذا "مہدی" ہیں۔ یہ فرقہ امامیہ "اثنا عشریہ" کی شاخ بھی کہی گئی ہے کیونکہ وہ بھی امام باقر رح کو پانچواں امام برحق تسلیم کرتے ہیں ابو منصور امامت پر قانع نہ رہا اس نے وہی دعویٰ الوہیت کیا جو مسیح سے منسوب کرتے ہیں۔ ابو منصور نے اپنے متبعین میں یہ بے پر کی اڑائی کہ میں آسمان پر اٹھایا گیا، مجھے روایت حق کا مشاہدہ ہوا۔ حق اللہ تعالےٰ نے میرے سر پر تھپکی دی اور سریانی زبان میں فرمایا کہ "اے میرے بیٹے زمین پر جا۔ آسمان سے میرا نزول زمین پر ہوا۔ کسف ساقطہ میں ہوں (اشارۃ ایۃ ان یروا کسفا من السماء ساقطا الدیۃ ۴۴) جو میرے تابع ہے اس کے لیے تو باراں رحمت ہے اور جو مخالف ہے اس کے لیے عذاب ہے، نبوت ہرگز منقطع نہیں ہوئی، یہ ابدی ہے اور جاری رہے گی، اللہ تعالےٰ نے پہلے حضرت عیسےٰ کو خلق فرمایا پھر نقش ثانی حضرت علی رض ابن ابی طالب کو، اب نقش ثالث مجھے۔"

اس وقت یوسف بن عمر ثقفی بنو امیہ کی طرف سے والی عراق تھا۔ فرقہ منصوریہ کے لوگوں نے یہاں بڑی بونگ مچا رکھی تھی ابو منصور کو گرفتار کیا اور پھانسی دی، یہ صحیح معنی میں مثل مسیح تھا یا آپ کا نقش ثالث کہ مسیح تو دار پر ادھرا ہوئے اور یہ پھانسی پا گیا۔ اس کی شخصیت اقانیم ثلاثہ امامت اور نبوت اور الوہیت کی جامع تھی۔

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ "مہدی" کا تصور خالص مجمی ہے۔

اور آریا ذہنیت کے ہی مناسب ہے، تاریخی حقیقت بھی یہی ہے کہ
ایرانی پھر سے اپنی شان و عظمت کا خواب دیکھ رہے تھے جو آخر شرمندہ
تعبیر نہ ہوا۔ خلافت عباسیہ پر رفتہ رفتہ ایرانی چھا گئے۔ خلیفہ منصور
عباسی کی تمام تر توجہ اور ہمت اس بات پر مرکوز رہی کہ عربوں کا زور توڑ
دیا جائے جو شروع سے بنو امیہ کے پشت پناہ تھے۔ اس کے حرم
سرائے میں کوئی خالص عرب ملازم نہیں رہ سکتا تھا۔ عرب جس نسبت
سے کمزور ہوتے گئے اسی نسبت سے عجمی زور پکڑتے گئے۔ آٹھویں
تاجدار عباسی معتصم نے جب دیکھا کہ ایرانی ہر طرف چھا رہے ہیں تو
ترکوں کی بھرتی شروع کر دی، اسے بھی اس کا احساس نہ ہوا کہ عربوں کو
ایرانیوں کے مقابلہ میں کھڑا کرے۔ عرب کے قومی شاعر دعبل خزاعی نے
آٹھ کے عدد سے ایک بات پیدا کی ہے۔

ملوک بنی عباس فی الکتب سبعة
ولم یاتنا فی ثامن منهم الکتب

کذلک اهل الکهف سبعة
غداة ثوروا فیها وثامنهم کلب

وانی لازهی کلبهم عنک رغبة
لانک ذو ذنب ولیس له ذنب

ملوک بنی عباس تو در اصل سات ہی ہیں
اور سات کا عدد ہی کتاب اللہ میں استعمال
ہوا ہے اور آٹھ کا عدد نہیں اسی وجہ
سے اصحاب کہف خوابیدہ سات ہیں
البتہ ان کا کتا آٹھواں ہے مگر اس
کتے اور آٹھویں خلیفہ عباسی میں فرق
یہ ہے کہ وہ بیشک دم (ذنب) رکھتا
ہے لیکن ڈنگ (ذنب) نہیں مارتا
اور یہ دم کٹا کتا ڈنگ مارنے سے نہیں
چوکتا۔ ذنب کے معنی گناہ بھی ہیں

کا گنہگار نہیں اور یہ گنہگار ہیں۔

معتصم فوت ہوا تو جانشین واثق مابعد ہوا۔ حبیب وعیل کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو کہا

الحمد للہ لا صبر و لا جلد
ولا عزاء اذا اهل البلاء رقدوا

اللہ تعالیٰ کا، صبر و شکیب کا موقع نہیں
ماتم پرسی کی اس وقت حاجت نہیں
جب اہل ملا سو رہے ہیں۔

خلیفة مات لم یحزن له احد
واخر قام لم یفرح به احد

ایک خلیفہ مرگیا تو کسی کو اس کے مرنے
کا غم نہ ہوا دوسرا اس کی جگہ کھڑا ہوا
تو کسی کو خوشی نہ ہوئی۔

معتصم نے بغداد کی جگہ شہر سر من رأی بسایا مخفف ہو کر سامرا رہ گیا۔ ابتدا میں یہ ایک چھاؤنی تھی اس لیے اس کو عسکرہ بھی کہتے۔ شیعان علی امامیہ کا گیارہواں امام حسن رض (۲۵۴ھ / ۸۶۸ء) اسی لیے عسکری کہلائے آپ کا بیٹا محمد المہدی رض تھا باپ کی وفات پر اس کی عمر پانچ یا آٹھ سال تھی۔ روایت یہ ہے کہ بنو عباس کے خوف سے سامرا کے ایک غار میں چھپ رہے اور پھر باہر نہیں نکلے شیعہ اثنا عشریہ اسی بارہویں امام کو غائب اور منتظر اور مہدی موعود کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پانچ یا آٹھ سال کے لڑکے نے باپ کی زندگی میں کبھی دعویٰ مہدویت نہیں کیا اور اس سے پیشتر کسی امام سے یہ دعویٰ منسوب نہیں۔ اور ہم محمد النفس الذکیہ اور منصور عباسی کے تحریری مجادلہ میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی فریق نے استحقاق خلافت و امامت کی تائید میں یہ نہیں کہا کہ احادیث میں جس مہدی موعود کی پیش گوئی کی ہے اس کا مصداق میں ہوں وہ صرف اپنا حق قرابت جو ان کو آنحضرت ؐ سے

تھا بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ کسی ہاشمی نے تیسری صدی کے آخر تک دعویٰ مہدویت نہیں کیا۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ "مہدی" کا تصور ایرانی ذہن میں تھا۔ ابتدا میں یہ اصطلاح واضح نہ ہوئی تھی مگر جوں جوں یہ تصور صاف صاف ممیز ہوتا گیا روایات بھی اس پر چسپاں ہوتی گئیں محمد المہدی کی غیبت کے بعد اس کی آمد ثانی فرقہ امامیہ کا خاص عقیدہ ہے جس کی آج کثرت ایران میں ہے اور مذہب اثنا عشریہ راج دھرم ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ آج بھی (چودھویں صدی عیسوی) اثنا عشری سالانہ اس غار کے منہ پر جمع ہوتے ہیں اور امام غائب کو دعوت خروج دیتے ہیں۔ محمد المہدی رض کی آمد ثانی کا انتظار آج بھی ہو رہا ہے، اہل سنت والجماعت اتنا تو تسلیم کرتے ہیں کہ احادیث میں "مہدی" کا مذکور ہے اور وہ مہدی آخرالزماں حضرت عیسےٰ کے نزول کے ساتھ خروج کرے گا۔ غالباً وہ اس محمد المہدی کی آمد ثانی کے منتظر نہیں۔ بہرحال کسی مہدی کے منتظر ضرور ہیں۔

خلافت عباسیہ روبزوال تھی کہ "عبداللہ المہدی" امام جعفر صادقؓ کی پانچویں پشت میں شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ کی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شیعہ امامیہ اس کو امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسماعیل کی اولاد تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اسماعیل امام صاحب کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا۔ اس لیے امام صاحب نے اپنے دوسرے بیٹے موسیٰ کاظم رض کو اپنا جانشین نامزد کیا جو دوازدہ اماموں میں سے ساتواں امام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ المہدی دراصل میمون القداح کی نسل سے ہے یعنی ہاشمی نہیں عجمی ہے، اس دعویٰ کو سمجھنے کے لیے ایک مشہور شخصیت ابوالخطاب

محمد بن ابی زینب علوی اجدع کے حالات کا بھی کچھ علم ہونا چاہیے۔ امام محمد باقرؓ کے بعد شیعان امامیہ دو فرقوں میں بٹ گئے ایک فرقہ محمد النفس الذکیہ کا طرفدار تھا جس نے خلیفہ منصور کے مقابلہ میں دعویٰ خلافت کیا۔ دوسرا امام جعفر صادق رضؓ کا، امام صاحب نفس ذکیہ کا دعویٰ تسلیم نہیں کرتے تھے مگر خود بھی دعویدار خلافت نہ تھے، امام صاحب کا پُرجوش معتقد ابوالخطاب تھا اس سے ایک فرقہ خطابیہ منسوب ہے۔ اکثر شیعہ فرقے اسی کی شاخیں ہیں۔ یہ امام صاحب کا شاگرد بھی تھا۔ عبدالقادر بغدادی اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں لکھتا ہے کہ

"خطابیہ اور اس کی چار شاخیں (معمریہ اور بزیغیہ اور عمریہ اور مفضلیہ) خلفاء راشدین ابوبکر و عمر و عثمان کو غاصب قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی اسی گناہ کے مرتکب ہوئے اولاد علی سے امامت چھین کر ابوالخطاب وغیرہ کے حوالہ کی بلکہ بعض کا عقیدہ ہے کہ ابوالخطاب امام جعفر صادق سے بھی اعلیٰ مرتبہ کا مالک ہے"۔

ابوالخطاب سے دو باتیں خاص طور پر منسوب کی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی ابتدا اسی نے کی ایک "تقیہ" اور دوسرا دعویٰ الوہیت دعویٰ الوہیت تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ البتہ یہ نئی بات شاید ہو کہ امام وقت اللہ ہوتا ہے اور اس کے متبعین اس کے بندے ہیں۔ بہرحال یہ عقیدہ دنیائے اسلام میں "تقیہ" کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔

ابوالخطاب نے اگرچہ امام جعفر کو بہت اکسایا کہ دعویٰ خلافت کریں مگر امام صاحب نے دھتکار دیا۔ اور اس کے عقاید سے بیزاری ظاہر کی۔ ابوالخطاب نے کچھ جمعیت فراہم کی اور کوفہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ محمد المہدی

عباسی اور عیسیٰ بن موسیٰ سپہ سالار افواج عباسیہ نے شکست فاش دی اور ابوالخطاب ۱۳۸ھ میں مارا گیا۔ اس کے شاگردوں میں سے ایک شخص میمون القداح، طبرستانی تھا۔ امام جعفر صادق رض کی وفات ۱۴۸ھ کے بعد اس نے محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کو گانٹھا۔ اس نے حسب و نسب میں ایک نیا شاخسانہ نکالا اور یہ پختہ عقیدہ فرقہ خطابیہ اور اس کی تمام شاخوں کا ہے کہ حقیقی بیٹا روحانی ہے نہ کہ جسمانی، جسمانی تو ایک مرد اور عورت کے نکاح کا نتیجہ ہے لیکن ایک معلم جو شاگرد کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اس پرورش سے زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے جو بہائم بھی اپنے بچوں کی کرتے ہیں۔

نصیرالدین طوسی کا تعلق فرقہ اسماعیلیہ سے ہے وہ لکھتا ہے کہ امام کی اولاد چار قسم کی ہے ایک روحانی یا معنوی۔ جیسے سلمان فارسی کہ آنحضرت نے اس کے بارہ میں فرمایا "سلمان من اہل بیتی" دوسری جسمانی یا شکل میں تیسری روحانی اور جسمانی جیسے حسن ابن علی رض اور روحانی درحقیقت "، جیسے امام حسین رض

رشیدالدین ایرانی مورخ لکھتا ہے کہ

"امام جعفر صادق نے اسماعیل کے بیٹے محمد یعنی اپنے پوتے کو میمون القداح کے پاس طبرستان میں بھیج دیا، میمون کا بیٹا عبداللہ تھا۔ اس نے محمد کو اس کی تربیت میں دیا۔ اور عبداللہ کو محمد بن اسماعیل کا بیٹا مشہور کیا کہ وہ محمد بن اسماعیل کا صلبی ہے۔ جب عبداللہ سترہ برس کا ہوا تو میمون نے اس کی امامت کا اعلان کر دیا۔ اور کسی شیعہ نے اعتراض نہ کیا۔

اس طرح خلفاء بنو فاطمہ اگر "من ولد القداح" ہی تھے مگر بنو فاطمہ ہی کہلائے۔

طوسی کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل نہ ہوا کہ اگر اس کا نظریہ تسلیم کیا جائے تو اصحاب رسول اللہ آنحضرت کے زیر تعلیم و تربیت سب آنحضرت کی اولاد ہی کہلائے۔ اور وہ اس نص قرآنی کا کیا جواب ہے کہ "ما کان محمد ابا احد من رجالکم" اور یہ کہ "وما جعل ادعیاءکم ابناءکم ذالکم قولکم بافواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ادعوھم لاباءھم ھو اقسط عند اللہ، فان لم تعلموا اباءھم فاخوانکم فی الدین وموالیکم" (۳۳/۵)

تمہارے پالک تمہارے بیٹے نہیں ہیں جو ان کو اپنے بیٹے کہتے ہیں یہ اُن کی منہ کی بکواس ہے اور اللہ کا ارشاد سچا ہے اور وہی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی فرماتا ہے ان کو ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک صحیح تر ہے اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوست ہیں۔

رشید الدین کی بھی تحقیق ناقص ہے۔ خلفاء مصر میں سے اکثر بنو فاطمہ ہی تھے۔ علامہ ابن خلدون اور مقریزی، اور ابن رشید اور ابو القاسم جیسے مورخین نے اُن کے حسب نسب کو تسلیم کیا ہے لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ ان میں سے ایسے بھی تھے جو بنو فاطمہ نہ تھے اور کسی نہ کسی داعی کی اولاد تھے۔ اور اس راز سے صرف یہی لوگ واقف تھے کہ کون صحیح النسب فاطمی ہے اور کون "من ولد القداح" یا کسی اور داعی بیٹا ہے۔

اسماعیلی عقاید کے مطابق امامت دو قسم کی ہے، ایک امام مستودع اور دوسرا امام مستقر۔ دونوں کو امامت کے پورے اختیار حاصل ہیں۔ مگر ان میں فرق یہ ہے کہ امام مستقر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ امامت کے

اختیارات بذریعہ وصیت جسے چاہے سونپ دے، امام مستور ع
یہ اختیارات اپنی اولاد یا کسی کے نام منتقل نہیں کر سکتا - اس کی ضرورت
اس لیے پیش آئی کہ فرقہ شیعہ امامیہ کے دوازدہ امام تو ہمیشہ امن پسند
رہے اور دین کی نشرواشاعت میں مشغول تھے اور سیاسیات سے بالکل کنارہ کش رہے۔ اس
لیے بنو عباس نے جو اس وقت برسر حکومت تھے ان سے تعرض نہ کیا۔ مگر ان پر کڑی نگرانی ضرور
تھی لیکن اسماعیل بن امام جعفر صادق کی اولاد کے حالات مختلف تھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابوالخطاب
کے شاگرد میمون القداح نے محمد بن اسماعیل کو امام جعفر صادق کی وفات کے بعد سیاسیات میں
الجھا دیا۔ القداح نے اپنی اولاد کو بنو فاطمہ اس لیے ظاہر کیا کہ آنچ آئی تو ان پر آئے گی
حقیقی بنو فاطمہ تو بچ رہیں گے فرقہ اسماعیلیہ شروع سے رازداری
سے کام لیتا رہا اور یہ رازداری آج بھی ویسی ہے۔ بیرونی دنیا کو اس
راز درون پردہ کا علم نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے۔ ضرورۃً "امام ناطق" اور
"امام صامت" کی اصطلاح وضع کی گئی، حقیقی فاطمی امام تو صامت عرصہ
تک رہے، ناطق بھی جانثار تھے جو نقلی فاطمی تھے۔ حکومت وقت
ان کو قتل کر کے مطمئن ہو جاتی۔ اور اس پر یہ راز نہ کھلتا کہ اصلی تو پس پردہ
موجود رہے اور خاموشی سے سرگرم عمل رہے۔ طرفداراں بلکہ جاں نثاراں
بنو فاطمہ نے یہ مناسب سمجھا کہ اولاد علی بالخصوص بنو فاطمہ کی جانوں
کی حفاظت کی جائے اس لیے جب تک عباسیوں کا زور رہا ان کو
چھپائے رکھا اور خود امامت کے فرض ادا کرتے رہے۔ یہ بھی
ظاہر ہونے نہ دیا کہ وہ خطابی ہیں یا قداحی، لوگ ان کو فاطمی ہی
یقین کرتے رہے اس طرح وہ اپنی جانیں قربان کرتے رہے
ان کے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ وہ کسی امام غائب یا منتظر کے

"ابن" یا "اب" ہیں۔ ہمارے موضوع سے یہ بحث خارج ہے ۔ عام واقفیت کے لئے ہم نے یہ تاریخی حالات بھی لکھ دیئے ہیں ۔

عبداللہ المہدی پہلا فاطمی خلیفہ ہے جو شمالی افریقہ میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا ۔ اب ہم تیسری صدی ہجری میں داخل ہو گئے ۔ اس کا ایک داعی ابو عبداللہ حسین کسی وقت بصرہ میں محتسب تھا ۔ یہ "شیعہ" کے لقب سے مشہور ہے ۔ قبائل بربر میں یہ کام کرتا رہا ۔ لوگ اس کے تقدس پر فریفتہ تھے ۔ گوشہ خلوت میں مجاہدہ اس حد تک تھا کہ باہر کم نکلتا ۔ اس وقت آل اغلب افریقہ میں صاحب حکومت تھے ۔ ابو عبداللہ نے کافی جمعیت فراہم کر لی تھی اور کبھی اس کے متبعین کی جھڑپیں بھی حکومت وقت سے ہو جاتی ۔ آل اغلب نے کوشش تو بہت کی یہ فتنہ دب جائے مگر کامیاب نہ ہوئے آخری اغلبی حکمران زیادت اللہ نے کھلے میدان میں شکست کھائی اور طرابلس کی طرف بھاگ گیا ۔ اغلبی مقبوضات پر ابو عبداللہ کا قبضہ ہو گیا ۔ یہ پہلے ہی اعلان کر چکا تھا کہ امام مکتوم یا غائب کے ظہور کا وقت آگیا ہے اپنے خاص مصاحبین کے ذریعہ عبداللہ کو دعوت دی ۔ تاجر کے لباس میں یہ سب افریقہ میں وارد ہوئے ، عباسیوں نے یہ بھی اڑتی سی خبر سن لی ۔ اور والیوں کے نام عبیداللہ کا حلیہ لکھ کر احکام صادر کر دیے کہ جہاں ملے گرفتار کیا جائے ۔ ایک دفعہ گرفتار بھی ہوا مگر ابو عبداللہ غافل نہ تھا ، صاف بچا کر نکال لایا ۔

ابو عبداللہ نے عبیداللہ کا جلوس نکالا ۔ آگے آگے آپ تھا اور بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کر رہا تھا کہ اچھی طرح دیکھ لو یہی تمہارا

"انا مہدی موعود" اور "انا سیح"، روتا جاتا تھا اور یہی فقرہ بار بار دہراتا
عبداللہ کی خلافت اغلبی مقبوضات پر باستقلال قائم ہو گئی بحرالشام
(روم) کے جزائر اور صقلیہ (سسلی) میں بھی اس کی حکومت تسلیم
کی گئی۔ اس وقت تک مدارالہام ابوعبداللہ اور اس کا بھائی
ابوالعباس تھے۔ مگر اب عبیداللہ نے عنان خلافت اپنے ہاتھ
میں لے کر ان کے اختیارات سلب کر لیے۔ وہ اس وقت
تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ امام عموماً صامت ہی ہوتا ہے
ناطق اور ہی ہوتے ہیں۔ جب ان کا ناطقہ بند ہوا تو علم بغاوت
بلند کیا۔ اور عبیداللہ کے قتل کا منصوبہ باندھا۔ لیکن عبیداللہ
نے انہیں گرفتار کر کے قتل کروادیا۔ اور ان کا انجام بھی ابومسلم
خراسانی کی طرح ہوا۔

مصر کے سوا تمام شمالی افریقہ عبیداللہ کے قبضہ میں آ گیا۔
اس نے سمندر کے کنارہ "مہدیہ" بسایا جو اس کا دارالخلافت قرار
پایا۔ چوبیس برس سلطنت کے بعد ۳۲۲ھ میں فوت ہوا۔
اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

امام جعفر صادق

اسماعیل | موسیٰ کاظم

محمد المکتوم

جعفر مصدق

عبد الحبیب

عبید اللہ المہدی (۲۹۷ھ / ۹۰۹ء)

القائم ابوالقاسم (د ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء)

المنصور (د ۳۳۴ھ / ۹۴۶ء)

المعز لدین اللہ (د ۳۴۱ھ / ۹۵۲ء)

العزیز باللہ (د ۳۶۵ھ / ۹۷۵ء)

الحاکم بامر اللہ (د ۳۸۶ھ / ۹۹۶ء)

الظاہر لاعزاز دین اللہ (د ۴۱۱ھ / ۱۰۲۰ء)

المستنصر باللہ (د ۴۲۷ھ / ۱۰۳۵ء)

المستعلی باللہ (د ۴۸۷ھ / ۱۰۳۵ء) | ابوالقاسم احمد

الآمر باحکام اللہ (د ۴۹۵ھ / ۱۱۰۱ء) | الحافظ لدین اللہ (د ۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء)

الظافر بامر اللہ (د ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء) | یوسف

الفائز بنصر اللہ (د ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء) | العاضد لدین اللہ (د ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء)

سلطان صلاح الدین ایوبی نے آخری فاطمی خلیفہ العاضد کی وفات

کے بعد پھر سے عباسی خلافت مصر میں قائم کر دی اگرچہ یہ بھی چند روزہ ہی تھی۔

اب "مہدی" کا تصور کم از کم ایرانی ذہنیت میں بالکل واضح تھا۔ امامیہ تو محمد المہدی امام غائب کے منتظر رہے اور ہیں مگر اس کا فائدہ دوسرے مدعیان مہدویت نے خاطر خواہ اٹھایا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب کی حدود میں تو کسی نے دعویٰ مہدویت نہ کیا۔ لیکن ایرانی بنو ہاشم کے کسی نہ کسی دعویدار خلافت کو اسی صورت میں پیش کرتے رہے جو کامیاب نہ ہوئے۔ شمالی افریقہ کی زمین نے مہدویت کا شگوفہ کھلایا۔ عبداللہ المہدی کے حالات جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے ہم لکھ چکے ہیں۔ ایک اور "مہدی" کا ذکر بغیر اس مقام پر مناسب ہے، اس کا ظہور بھی افریقہ میں ہوا۔ افریقہ میں عقیدہ مہدویت کچھ ایسا پختہ ہو چکا تھا کہ ہمارے زمانہ میں بھی "سوڈان" سے مہدی اٹھا مگر اس کا ذکر ہم سردست نہیں کرتے۔

ہم تین صدیاں اور پیچھے چھوڑ آئے ہیں جس میں قابل ذکر مہدی نہیں ہوا۔ چھٹی صدی ہجری میں شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں "مرابطین" کی حکومت تھی جو ۵۴۱ھ تک قائم رہی، ان ایام میں ایک شخص محمد بن عبداللہ بن تومرت علوی مغربی افریقہ کے شہر "سوس" کے باشندہ کو تحصیل علم کا شوق علماء اسلام کی صحبت میں لے گیا۔ یاد رہے کہ بنو فاطمہ حضرت علی اور فاطمہ زہرا کی اولاد ہیں اور علوی حضرت علی کی دوسری ازواج کی اولاد ہیں۔ یہ شخص امام محمد الغزالی کی خدمت میں بھی کچھ عرصہ رہا۔ فارغ التحصیل ہو کر وطن کی طرف مراجعت کی عیش پرست علماء اور

صاحبان حکومت کے خلاف وعظ کرتا رہا۔ اور ان جہلا کے خلاف جو اولیاء اللہ کی قبور کا بھی احترام کرتے ہیں ایک تحریک شروع کر دی اس لیے اس کے متبعین کو لوگوں نے "موحدین" کا امتیازی لقب دیا۔ یہ شخص احادیث کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ احادیث میں جس مہدی کے ظہور کا ذکر ہے وہ میں ہوں۔ لوگ اس کے گرد پروانہ وار جمع ہوئے پہلے ہی اس کے زہد و تقویٰ کے گرویدہ بہت تھے۔ بالخصوص بربری اقوام تو اسی کے ہو رہے۔ اس کا پہلا مقابلہ مرابطین سے ہوا۔ افریقہ میں ان کی حکومت کا خاتمہ کر کے مراقش پر قابض ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ غلطی خوردہ ہو نیت نیک تھی۔ اس نے ایک تاجر کے لڑکے عبدالمومن کو اپنی فوج کا سپہ سالار اور اپنا جانشین نامزد کیا۔ اس نے ہسپانیہ میں بھی "موحدین" کی حکومت قائم کر دی۔ ۱۱۲۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا موحدین کی حکومت ۱۲۶۹ء تک قائم رہی۔

مہدی تو اور بھی گذرے ہیں اور غالباً یہ سلسلہ تا جہاں باقیست جاری رہے گا۔ ہم نے صرف چند مشہور شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اس سے پیشتر کہ ہم اپنے انتخاب کردہ مہدی کے حالات یہاں بیان کریں قارئین کرام کے فائدہ کے لیے علم النفس کا ایک اہم مسئلہ جس سے مہدویت کی حقیقت بھی کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے بیان کرتے ہیں۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ اُمم سابقین میں تناسخ اور حلول اور آمد ثانی کا عقیدہ غالباً تاریخی زمانہ سے بھی پہلے کا پختہ ہو چکا ہے۔ یہ مسلمان ہوئے تو اس عقیدہ کو ترک نہ کر سکے۔ اور یہ عقیدہ آج بھی ایرانی ذہنیت میں اتنا راسخ ہے کہ مٹائے سے نہیں مٹ سکتا۔ اگر یہ لوگ اپنے دیوتاؤں اور اوتاروں تک ہی اسے محدود رکھتے تو آج ہمیں تاریخ "مہدویت" لکھنے

کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مسلمان ہوئے تو بنو ہاشم میں سے دعویداران خلافت کو بھی اسی رنگ میں دیکھا یا پیش کیا۔ نفسیات کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ جب کوئی عقیدہ کسی قوم یا جماعت میں پختہ ہو جاتا ہے اور صدہا سال سے وراثت میں منتقل ہوتا رہتا ہے تو "ذرع اجماع" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ قوم یا جماعت ہر ایک واقعہ کو بالخصوص ایسے واقعات کو جو کسی وجہ سے جاذب توجہ ہوتے ہیں اسی عقیدہ کے رنگ میں دیکھتی ہے۔ بیدل عقیدہ "تناسخ" پر بحث کرتا ہوا مثنوی عرفان میں لکھتا ہے کہ

ای دلت کارخانہ نیرنگ
غنچہ ات گلفروش چندیں رنگ
ہیچ گل زیں بہار رنگ نہ بست
کز براہ شعور سنگ نہ زیست

تیرا دل کارخانہ نیرنگ ہے
تیرا غنچہ دل کتنی رنگینیوں کی گلفروشی کر رہا ہے
جو بھی خیال یا تصور میں پیدا ہوتا ہے اگرچہ
بہار فطرت کا حسین رنگین پھول ہی ہوتا ہے
لیکن اس کے حسن اور رنگینی میں سنگ راہ اور
اور امور بھی ہیں۔ اس سنگ خارا سے پار شعور
قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ غرض ظہور تو یہ
ہے کہ ہر ایک شے کو اس کے اصلی رنگ
میں دیکھا جائے یعنی مشاہدہ حق ہو۔

اصل ہر حق و باطل است یکے
جادہ بسیار و منزل است یکے

جسے ہم حق و باطل سے تعبیر کرتے ہیں اور
اور ان میں امتیاز پیدا کرتے ہیں دونوں کی
اصل ایک ہی حقیقت ہے۔ اور یہی اصل
منزل ہے اس منزل کی طرف بے شمار

راستے جلتے ہیں۔ اور راہرو جو بھی راستہ اختیار کرتا ہے حق ہی سمجھتا ہے اور دوسرا دوسرے راستہ کو حق کہتا ہے اور دوسرے راستوں کو باطل قرار دیتا ہے۔

این ہمہ جادہ است منزل نیست
لیک رہرو تمیز د قابل نیست

یہ سب راستے ہی ہیں۔ منزل نہیں ہیں، لیکن راہرو میں اتنا شعور نہیں کہ سمجھے راستہ اور منزل میں مابہ الامتیاز کیا ہے، اس لیے جادہ اور منزل میں فرق نہیں کرتا۔ راستہ ہی کو منزل تصور کرتا ہے۔

اگر این عبرت تناسخ خام
در جہان ظہور بودے نام

راستہ گذرگاہ ہوتا ہے جسے عبور کر کے رہرو منزل پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے تمام راستے جو منزل مقصود کی طرف جاتے ہیں عبرت میں ٹھہرنے کا مقام نہیں ہیں۔

قوم دیگر ہم از وقوع خیال
می شد آئینہ دار این تمثال

اگر اس جہان ظہور میں "تناسخ" ہی اصل منزل ہوتی تو یہ حقیقت ہوتی۔ جو بدل نہیں سکتی۔ اس لیے ہر ایک قوم کا یہی عقیدہ ہوتا اور ایک قوم کے آئینہ عقاید میں یہی صورت نظر آتی۔

این نہال آنچہ برفراشتہ اند
در زمین ہای ہند کاشتہ اند

اس آواگون درخت سے جو کچھ پھل حاصل ہو سکتا۔ بیج ہندوستان کی زمین ہی میں لویا

گیا ہے اور یہاں کے لوگ "چوراسی" یوگ کا جانتے ہیں۔

ازگروہے دگر بریں آثار
نیست آگاہ خفتہ تا بیدار

دوسری قوموں میں خواہ جاہل ہو یا عالم، ہشیار ہو یا غافل کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں (ہے)

نہ نصاریٰ است زیں مقام آگاہ
نہ خیال یہود دارد راہ

نہ تو مسیحی ہی اس عقیدہ سے واقف ہے اور نہ یہودیوں کے ذہن میں یہ بات کبھی آتی ہے

در مزاج یہود اگر ساریست
حکم توراۃ یک قلم جاریست

یہودیوں کے نفوس میں اگر کسی شے کا نفوذ ہے تو وہ توراۃ ہی کے احکام ہیں اور بس۔

در نصاریٰ نمی شود مشہود
جز خیالے کہ عیسیٰ فرمود

نصاریٰ کے عقاید میں بھی وہی بات مشاہدہ ہوتی ہے جو حضرت عیسیٰ کے ارشادات ہیں

ہر یکے راز درس قایل خویش
سبق علم بردلست بر پیش

جو کچھ ان کے انبیاء یا رشی منی یعنی انسان کامل نے انکو درس دیا اسے ہی سبق علم از بر کیا۔

تا عقاید حجاب را ندرید
برہمن کعبہ را بخواب ندید

جب تک عقاید کی پردہ دری نہیں ہوئی برہمن کو کعبہ خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتا

تا مسلماں مدارج دیں خواند
بے خیال از کاشی ماند

جب سے مسلمان دین کے مدارج سے واقف ہوئے "کاشی" کے خیال سے بے پروا ہو گئے۔

قصص انبیائے فرقانی
بیدیاں راست محض نادانی

قرآن میں انبیاء کے قصے جو بھی مذکور ہیں ان سے وید شاستر والے محض جاہل ہیں۔

حالت دیوتائے شاستری
مسلمیں را گواہ بے خبری

شاستروں میں جو دیوتاؤں کے حالات لکھے ہیں ان سے مسلمان بے خبر ہیں

زیں حقیقت بزمرہ اسلام
نرسائید پیک علم پیام

ان دیوتاؤں کی حقیقت کے بارہ میں کا مدعلم
جو اللہ کا پیغام لے کر آیا یعنی آنحضرتؐ
نے مسلمانوں کو کوئی پیام نہیں دیا بلکہ تردید کی۔

نسخ در امت محمدؐ نیست
بزم مقبول جائے مرتد نیست

تناسخ کا عقیدہ امت محمدیہ میں نہیں ہے
مقبول بارگاہ الٰہی کی بزم میں کسی مرتد
کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔

خاں وفا جو ہر کرم بنیاد
ہمہ را وعدہ قیامت داد

اس رسول امیں رحمۃ اللعٰلمین نے سب کو
اعمال کی جزو سزا کا وقت موعود قیامت
کا دن بنایا۔

بر مسلمان زفکر در اندیش
اگر آید قیامت آید پیش

مسلمان کے ذہن میں قیامت کا نقش اتنا
گہرا ہے کہ جو کچھ ان کے سامنے ظہور میں
آتا ہے اس کی دوربینی اس میں قیامت
کا جلوہ ہی دیکھتی ہے ۔

مومناں را ظہور ایں آیات
نبود جز بموقف عرفات

ہر ایک مومن مسلمان کا ایمان اس پر
پختہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کا مقام
عرفات ہے ۔

گر مکافاتے از عمل بیند
خویش را ہم دراں محل بیند
علم ما را بحکم رحمت فرد
مبتلائے خیال وہم نہ کرد

اگر اس دنیا میں کسی ناشائستہ عمل کا نتیجہ مشاہدہ
کرتے ہیں تو اپنے آپکو اسی حشر ہی میں دیکھتے ہیں۔
رحمت اللعٰلمین کے ارشاد کے مطابق جو علم ہمیں
حاصل ہوا ہے اس نے ہمیں توہمات کی بھول بھلیوں
میں سرگردانی سے بچا لیا ۔

اہل اسلام ہر کجا زادند ... مسلمان خواہ کہیں پیدا ہو ان توہمات
زیں خیالات فارغ افتادند ... سے بے نیاز ہیں۔

عقیدہ اور شے ہے اور علم اور چیز ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں
جب کوئی پختہ عقیدہ وراثت میں منتقل ہوتا ہے خواہ کیسا ہی
نامعقول ہو لوگ اسے علم کا درجہ دیتے ہیں لیکن اس کے
علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ کسی ایک شخص کا تصور خواہ محض
وہم ہو اگر اسے یقین ہے کہ یہ حق ہے تو اور اشخاص اس سے متاثر
ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ دراصل قوت "یقین" کا اثر ہے۔

اتنی صدیوں سے مہدی کی آمد کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ باوجود
اس حقیقت کے کئی مہدی آئے اور گذر گئے یہ عقیدہ متزلزل نہ ہوا
اور آج بھی اپنی پوری شان میں مشاہدہ ہو سکتا ہے، اس کی ایک
ہی وجہ ہے کہ یہ عقیدہ اب قومی وراثت ہو چکا ہے اور جو بھی
اس وراثت کے نبھانے والا کھڑا ہوا اگر ساری قوم نہیں تو ایک جماعت
نے اس کا دعویٰ ضرور تسلیم کیا۔ اور یا تو اس کی آمد ثانی کے انتظار
میں ہے یا ایک نئے مذہب یا فرقے کو اس سے منسوب کرتے
ہوئے اس کا نام زندہ رکھتی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ

بازآمدن عیسیٰ و مہدی ایں جا ... از تجربہ مزاج اعیاں وراست

لیکن برہان عقلیہ کو کون سنتا ہے۔ علم آزادی فکر سے حاصل
ہوتا ہے۔ لیکن عقیدہ قوت فکریہ کو جکڑ رکھتا ہے۔ اور یہ بیلاب
ہو کر رہ جاتی ہے اس عالم گیر ودار میں زیادہ عقائد ہی کی جنگ ہے
اور ہر ایک شخص اسے بزور منوانا چاہتا ہے راہِ اصل منزل سے اکثریت دور ہی نہیں بلکہ
بھٹک رہی ہے۔

سلمان فارسی

سلمان فارسی کے بارہ میں روایات میں سخت اختلاف ہے۔ ابن اثیر "اسد الغابہ فی سیرۃ الصحابہ" میں اس کو بھی اصحاب رسول اللہ کے زمرہ میں ذکر کرتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ اس کی عمر چھ سو سال تھی جب آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اگرحضرت عیسٰے کو نہیں دیکھا لیکن حواریوں کا زمانہ پایا۔ اور انجیل کی بشارت درباره بعثت رسول معظمؐ کا اسے علم تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آنحضرتؐ کا ظہور کھجوروں والے شہر یثرب سے ہوگا۔ چنانچہ وہ آنحضرتؐ کی بعثت کا منتظر رہا۔ حواریان مسیحؑ کے بعد وہ ہر ایک صدی میں مسیحی احبار و مشائخ اور رہبانوں کی خدمت میں رہا جب ایک راہب فوت ہو جاتا تو حسب وصیت اس راہب متوفی دوسرے راہب کی خدمت میں رہتا، ■ بھی آنحضرت ﷺ کی بعثت کے منتظر تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ناول "جویائے حق" میں یہی روایات بیان کی ہیں۔ آخر سلمان بحالت غلامی ایک یہودی سوداگر کے ہاتھ پڑا۔ اس کی رہائش "یثرب" کے مضافات میں تھی۔ یثرب آنحضرتؐ کی مناسبت سے اب

"مدینۃ النبی" سے موسوم ہے۔ کچھ عرصہ بعد آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی سلمان تو کئی صدیاں اسی انتظار میں تھا۔ شہرہ سنا تو خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے یہودی کی غلامی سے روپیہ دے کر آزاد کرایا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ جب کفار مکہ نے دیگر حلیف قبائل کی مدد سے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ منورہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ تو سلمان ہی نے تجویز "خندق" کھودنے کی بتائی۔ چنانچہ خندق اسی کی زیر نگرانی کھودی گئی اور محاصرین شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ قرآن میں "غزوہ احزاب" اور روایات میں "غزوہ خندق" کے نام سے موسوم ہے اس سے پیشتر عرب اس فن حرب سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ محاصرین کہتے کہ محمدؐ نے حرب میں یہ بدعت اختراع کی ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار مدینہ میں "مواخاۃ" قائم کی سلمان فارسی نہ تو مہاجر تھے اور نہ انصار کے زمرہ میں آتے اس لیے یہ اکیلے رہ گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "سلمان من اہل بیتی"۔ عربی محاورہ کے مطابق اس کا اردو میں ترجمہ یہ ہوا "کہ سلمان میرے گھر والوں میں سے ہے اور لسان قرآن میں بھی "اہل بیت" کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن عجمی لقب میں اہل بیت سے "پنج تن" یعنی آنحضرتؐ اور حضرت علی رضؓ اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ اور امامین حسن رضؓ اور حسین رضؓ مراد ہیں۔ اس معنی میں سلمان "چھٹا تن" ہوئے۔

ایک اور روایت ہے کہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ

وآخرین منھم لما یلحقوا بھم وھو العزیز الحکیم ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ کی آیات سناتا ہے اور پاک کرتا ہے جو ابھی تک ظاہر گمراہی میں ہیں (جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے، یہ ہے فضل اللہ کا جسے چاہے عنایت فرماتا ہے اور فضل عظیم کا مالک ہے) تو اصحاب رسول کریم نے دریافت کیا کہ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جو ہم سے بعد میں آکر ملحق ہوں گے۔ آنحضرت نے سلمان فارسی کے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اس کی قوم کے لوگ ہیں۔ اور ان میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جو ایمان کو اگر ثریا میں ہوگا۔ یا ثری میں سے لے آئے گا۔

اس روایت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں ایک تو ایرانیوں کی فضیلت عربوں پر، کیونکہ آیات میں لفظ "فضل" استعمال ہوا ہے، دوسرے ایک شخصیت کا ظہور جو علم و فضل میں سب سے بڑھ کر ہوگا۔ اور یہ ایرانی ہے روایات اور بھی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کے سلمانؓ خاص منظور تھے۔ آپ نے انہیں کوفہ یا بصرہ یا ایران کے کسی صوبہ کا والی بھی مقرر فرمایا تھا۔ اور ایک دفعہ شیر کے پنجہ سے کسی جنگل میں چھڑایا تھا چنانچہ جب ہمایوں پسر بابر بادشاہ شیر شاہ کے مقابلہ میں شکست کھا کر صفوی شاہ ایران کے ہاں بغرض امداد آیا تو اس واقعہ کا اشارہ کیا جو ایک قطعہ میں لکھ کر شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

دشمنم شیر است و عمری پشت در من کردہ است | جائے از کیں دعوات روئے با من کردہ است
التماس از شاہ دارم کہ با من آں کند | آنچہ با سلماں علی در دشت ارزن کردہ است

روایات تو ہم نے بالاختصار بیان کر دی ہیں، یہ فیصلہ اب قارئین کرام

خود کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت تاریخ اور روایات میں گم ہو کر رہ گئی ہے ۔ لیکن اگر حقائق کو حقائق کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سلسلہ میں بعض گتھیاں ایسی ہیں جن کا سلجھانا آسان نہیں نظر آتا ۔ ایران اور عرب کا تصادم خلافتِ راشدہ کے دور میں ہوا ، خاص طور پر عہد ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں۔ بلاشبہ عہد حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں ایرانی مدینہ میں نظر آتے ہیں ، لیکن اس سے پیشتر کسی ایرانی کی مدینہ شریف میں رہائش کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ۔ لیکن یہ تو عام بات ہوئی ، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا جہاں تک تعلق ہے ، نہ ان کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ ان کی تاریخی شخصیت سے ، نہ ان کے قیام مدینہ سے ۔ جس طرح عہد رسالت میں ان کا نام ہمیں نظر آتا ہے ، اسی طرح عہد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی وہ نمایاں نظر آتے ہیں ۔ بہرحال یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر تفصیل سے اس موقع پر گفتگو نہیں کی جا سکتی اس کے لئے ایک الگ مجلس جمانی پڑے گی ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات شیعہ امامیہ نے سلمان کو وہ حیثیت کبھی نہیں دی جو مدعیان نبوت و تہدوبیت نے روایات و حکایات کی بنا پر اپنے مفاد کے لیے جائز سمجھی ۔ شیعہ امامیہ اپنے بارہویں امام محمد المہدی کی آمد ثانی کا انتظار کر رہے ہیں ۔ اور جب تک یہ انتظار باقی

ہے۔ وہ کسی اور شخص کے دعویٰ نبوت و مہدویت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ اہل سنت والجماعت بالخصوص اہل حدیث مہدی کے منتظر ہیں۔ لیکن ان میں ظہور مہدی کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض جو شیعہ امامیہ کے زیر اثر ہیں امام محمد المہدی ابن امام حسن عسکریؒ کی آمد ثانی کے منتظر ہیں۔ اور بعض کسی اور شخص کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں جس کا حلیہ احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ نزول عیسےٰ بھی تسلیم کرتے ہیں اور حضرت عیسےٰ کے بارہ میں ان کا وہی عقیدہ ہے جو مسیحی دنیا کا ہے کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور کسی مناسب وقت دمشق کے جامعہ کے منارہ شرقی پر اتریں گے۔
لیکن ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو ان احادیث کو موضوع قرار دیتی ہے جن میں مہدی کے ظہور کا مذکور ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے "مقدمہ" میں اس پر شرح و بسط کے ساتھ تنقید کی ہے اور اصول حدیث کے رو سے تمام روایتوں کی تنقیح کر کے غلط بتایا ہے۔ سر سید احمد خاں غفرلہ نے اسی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر "مہدی آخرالزماں" کے عنوان سے "تہذیب الاخلاق" میں ایک مفصل مقالہ لکھا اور ان تمام احادیث کو سخت مجروح کیا۔

اگرچہ تمام مدعیان مہدویت جو تاریخی شخصیتیں ہیں زیادہ تر سیاسیات میں الجھی رہیں اور اس عقیدہ کا خاطرخواہ فائدہ اٹھایا۔ لیکن ایک شخصیت جس کا ہم نے انتخاب کیا ہے کبھی دنیوی مفاد کے لیے اس دعویٰ کے ساتھ کھڑی نہیں ہوئی۔

سید محمد جونپوری اگر چاہتا تو کسی ریاست کا خود مختار سلطان ہو سکتا تھا۔ مگر اس نے ہمیشہ دنیوی جاہ وحشمت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ "دنیا بجاۂ تکبیر زدہ او زدہ دست پا" اس کے حالات سے واضح ہو جائے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

سید محمد جونپوری

رحمت اللہ علیہ!

سید محمد جس کے حالات ہم لکھ رہے ہیں جونپور میں پیدا ہوا اس وقت دہلی میں خاندان تغلق روبزوال تھا۔ دکن میں بہمنیہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ گجرات میں سلطان محمود بیگرہ حکمران تھا۔ سلطان حسین دانا پور میں والیٔ ریاست تھا جس کی حدود میں قصبہ جونپور واقع تھا۔ سلطان اور اس کی ریاست ہندو راجہ دلیپ رائے کی باجگذار تھی ان ایام میں ہندوستان ہندو راجاؤں اور مسلمان نوابوں کی ریاستوں ہی میں تقسیم تھا۔ جن میں اقتدار یا ہوس ملک گیری کے لیے آتش جنگ مشتعل رہی۔

سید محمد چار سال کا بچہ تھا کہ باپ شیخ دانیال کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ رسم تسمیہ خوانی ادا ہوئی تو اشراف داعیان جونپور کو پُرتکلف دعوت دی سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں علوم درسیہ مروجہ سے فراغت حاصل کی، اس چھوٹی عمر میں یہ حال تھا کہ بڑے بوڑھے اس کی باتیں سن کر دنگ رہ جاتے۔ موشگافی اور حقائق عقلیہ میں اور مجادلہ اور مباحثہ میں مشہور تھا۔

شیخ دانیال اسے "اسد العلماء" کہتے علوم ظاہری سے کچھ تسلی نہ ہوئی تو سلسلہ چشتیہ میں شیخ دانیال ہی کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ جوانی کا عالم تھا ظاہر تو علوم مروجہ سے آراستہ ہی تھا اب تصوف اور زہد و تقویٰ سے باطن پیراستہ ہو گیا۔ یعنی نور علیٰ نور ہو گیا۔ شیخ نے خرقہ خلافت عطا فرمایا تو مرید کثرت سے حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ تھوڑے عرصہ میں تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جوانی میں بزرگی کا شہرہ دور و نزدیک ہو گیا۔ سید یا تو گوشہ خلوت میں ذکر و فکر میں مشغول رہتا یا مجلس وعظ گرم رکھتا۔ کچھ ایسی قوت مقناطیسی اس میں تھی کہ ہر ایک شخص جو نام سنتا خود بخود کھچا چلا آتا مجلس وعظ میں حاضرین دم بخود بیٹھے رہتے اور اہل دل وجد میں آجاتے۔

سید کی بزرگی کا شہرہ سلطان حسین کے کانوں تک بھی پہنچا۔ امیر خسرو کے بعد سلطان علم موسیقی میں بھی ماہر تھا۔ کئی راگنیاں ایجاد کیں۔ ان میں سے "جونپوری" اور گوڑ سارنگ آج بھی ہندوستانی ماہران فن کی محبوب راگنی ہے۔ اور اکثر گائی جاتی ہے۔ ایک روز سیر و شکار کے بہانہ سے جونپور میں وارد ہوا۔ اور سید کی درگاہ پر حاضر ہوا۔ اصل غرض تو یہی تھی۔ اور یہیں کا ہو رہا۔ حلقہ مریداں باصفا میں داخلہ کے بعد چند روز سید کی خدمت میں رہکر عرض کی کہ مجھ خادم کی دلی آرزو یہ ہے کہ آپ کے قدموں میں پڑا رہوں۔ میری سعادت دارین اسی میں ہے۔ لیکن کاروبار سلطنت ناممکن ہو جائے گا۔ چونکہ آپ سے مفارقت بھی گوارہ نہیں کر سکتا اس لیے یا تو ارشاد فرمائیں کہ انتظام سلطنت کسی اور کے سپرد کردوں اور خود بخدمت والا یہیں حاضر رہوں یا

یا آپ میرے ہمراہ رہیں - سید نے آخر الذکر درخواست منظور فرمائی اس کے بعد سلطان کے ہمراہ رہا -

کچھ عرصہ اسی طرح گذر گیا - اس اثنا میں سید کو قرب وجوار کے شہروں میں واعظ کا اچھا موقعہ مل گیا یہ سلطان کی حدود میں پابند نہ تھا - ریاست کے باہر بھی کبھی کبھی جاتا اور جہاں جاتا وہاں کے لوگ اکثر حلقۂ ارادت میں داخل ہوتے - سید کے ہمراہ کچھ مرید بھی ہمیشہ رہتے ایک روز سید دلیپ رائے کی راجدھانی میں آدھمکا، سید نہ صرف مسلمانوں ہی کو راہ ہدایت پر رہنمائی کر رہا تھا - بلکہ اس کی زیادہ تر توجہ ہندوؤں میں اشاعت اسلام کی طرف رہی -

دلیپ رائے ایک بہادر راجہ تھا - یہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ کوئی والئ ریاست چین سے زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا - اسے بھی آئے دن اندرونی خرخشوں اور بیرونی حملوں کا دھڑکا لگا رہتا - وہ اعلیٰ پایہ کا منتظم بھی تھا اور اکثر اپنی ریاست کے طول وعرض میں دورہ کرتا ہوا نظر آتا - اس وقت ہندو مذاہب تو بے شمار تھے مگر سب بت پرست تھے - دلیپ رائے بھی اسی زمرہ میں داخل تھا - ان ریاستوں میں جہاں ہندو راجے راج کرتے تھے بت پرستی کا بازار خوب گرم تھا دلیپ رائے جتنا اپنے مذہب میں پکا تھا اتنا ہی اسے بت شکن مسلمانوں سے نفرت تھی مگر یہ اس کا اعلیٰ سیاسی تدبر تھا کہ اگرچہ اس کی راج دہانی میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی مگر اس نے مسلمانوں کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا - اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے گرد وپیش مسلمان نوابوں کی ریاستیں تھیں - اگرچہ عموماً خانہ جنگی میں

مبتلا رہتے مگر جب کبھی کسی مسلمان نواب کی لڑائی کسی ہندو راجہ سے
چھڑ جاتی تو یہ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے۔ ہندوؤں میں اشاعت
مذہب تو ممنوع ہے۔ یہ ان کا قومی دھرم ہے اور غیر قوم کا آدمی
اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ریاستوں میں ہندو برطیب خاطر اسلام
قبول کر رہے تھے مگر دلیپ رائے کی ریاست میں شاید ہی کوئی ہندو
اسلام کے آغوش میں آتا۔ سید محمدؒ نے اس کی بساط الٹ دی۔ غالباً
سید پہلا مبلغ اسلام اور واعظ تھا جس نے دلیپ رائے کی راجدہانی
گوڑ میں دلیرانہ قدم رکھا اور سلسلہ وعظ شروع کر دیا۔ یہاں کوئی مسلمان
نہ تھا جو سید کے حلقہ ارادت میں داخل نہ ہوا ہو۔ ہندو اگرچہ پنڈتوں
کے مشورہ کے مطابق دور دور ہی رہے مگر جو آجاتا وہ اسلام قبول کر کے
ہی جاتا۔ برادری سے خارج ہوتا تو مسلمانوں سے رشتہ اخوت جوڑتا
یہ وقت نہ صرف دلیپ رائے کے لیے انتہائی پریشان کن تھا بلکہ سید
بھی مطمئن نہ تھا۔ سید چاہتا تھا کہ اس کی مجلس وعظ میں ہندو کثرت
سے شریک ہوں۔ اور یہ نہ ہوا۔ چند روزہ قیام کے بعد یہ پھر سلطان
حسین کے پاس آگیا۔

اس وقت سید کا واحد مقصد زندگی یہ تھا کہ تمام ہندوستان
بت پرستی کی آلائش سے پاک ہو۔ اس لیے اس نے اب اپنے مبلغ
بالخصوص ہندو ریاستوں میں بھیجنے شروع کر دیئے۔ یہ ایک جماعت تھی
جس کی تربیت سید کے زیر تعلیم ہوئی۔ اس کو فوج "بیراگیاں" سے موسوم
کیا گیا۔ اس کے ساتھ سید نے ہندو راجوں کو دعوت اسلام کے نامے
لکھے، ایک پیام دلیپ رائے کے نام بھی آیا۔ دلیپ رائے کی طرف

سے جو جواب ملا وہ کسریٰ کا جواب تھا جو آنحضرتؐ کو ملا سلطنت ہی دوسرے راہبوں سے توقع تھی۔

جمعہ کا روز تھا۔ سید حسبِ معمول منبر پر خطبہ سنا رہا تھا۔ مسجد میں کافی ہجوم تھا۔ سلطان حسین بھی موجود تھا۔ سید حمد و نعت کے بعد کفر و شرک کی مذمت بیان کر رہا تھا۔ اثناءِ تقریر میں اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت کی اور یہ بھی کہا کہ ہر ایک مومن مسلمان پر جہاد فرض ہے اور جو مسلمان معذور نہیں اور جہاد سے جی کتراتا ہے نصِ قرآنی کا عملاً منکر ہے، خواہ اعتقاداً نہ ہو۔ ایسے لوگ چند روزہ فانی زندگی کے آرام و آرائش پر مرتے ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور مسلمان صاحبانِ ریاست و حکومت جو طاقت رکھتے ہوئے جہاد نہیں کرتے دوزخ کا ایندھن ہیں۔

سید تقریر کر رہا تھا، یک لخت اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس وقت جلال اس کے چہرہ سے اس کے لفظوں سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے سلطان حسین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ان عالیانِ ریاست میں ایک یہ شخص ہے۔ سلطان حسین لرز گیا۔ چاہتا تھا کہ کھڑے ہو کر کچھ کہے اور غالباً "آمنا و صدقنا" کے سوا اور کچھ نہ کہتا۔ مگر زبان بند ہو گئی۔ سید نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے بلاشبہ چند شرائط ہیں۔ اور دشمنانِ دین کے مقابلہ و مقاتلہ کے لیے زبردست عسکری قوت اور پسندیدہ قیادت از بس ضروری ہے لیکن ایمان سے قوی تر کوئی طاقت کوئی قوت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا بھی وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر وعدہ کا کون سچا ہے کہ اگر تم اہل

ایمان ہو تو تم ہی غالب رہو گے اور یہ کہ اکثر تھوڑے بہتوں پر غالب آتے ہیں۔

سید کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ بہت بڑا عالم دین بھی تھا۔ اور تقریر برجستہ اور فصاحت میں لاجواب کرتا۔ موضوع جہاد پر اس کی آتش بیانی نے ایک جوش پیدا کر دیا۔ سید کی تقریر میں بھی ایک بے پناہ جوش تھا۔ آخر سید نے ایک دفعہ پھر بلند آواز کرتے ہوئے کہا کہ آج میں ہر مسلمان کو جو کسی وجہ سے معذور نہیں دعوت جہاد دیتا ہوں اور کافر دلیپ رائے کے خلاف اعلان جہاد کرتا ہوں۔

سید کی تقریر اور اعلان جہاد کا اثر حاضرین پر جو کچھ ہوا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ تین روز کے عرصہ میں یہ اعلان دور دور تک نشر ہو گیا۔ سلطان حسین کے پرچم کے نیچے تیس ہزار مجاہدین جمع ہو گئے۔ سلطان چاہتا تھا کہ اور مسلمانوں والیوں کو دعوت شرکت دے اور اگر سید ذرا تحمل سے کام لیتا تو کچھ شک نہیں کہ ایک لشکر جرار تیار ہو جاتا اور دلیپ رائے کو مقابلہ کا کبھی حوصلہ نہ ہوتا۔ مگر سلطان کی کیا مجال تھی کہ سید کے حکم کی تعمیل میں تاخیر سے کام لے۔ اسی فراہم شدہ جمعیت کے ساتھ یلغار کرتا ہوا دلیپ رائے کی راجدھانی گوڑ کی طرف بڑھا۔ سید بذات خود اپنے پندرہ سو بیراگیاں کو لیے سلطان کے لشکر کے میمنہ پر تھا۔

دلیپ رائے کو بھی اس اعلان جہاد اور سلطان کی لشکر کشی کی اطلاع وقت پر ہوتی رہی، اسے کسی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہر وقت تیار

تھا۔ لیکن اسے یہ امید نہ تھی کہ سلطان سا محتاط تجربہ کار سپاہی اتنی ہی جمعیت کے ساتھ اس سرعت کے ساتھ اس کے پایہ تخت پر یورش کرے گا۔ اسے کیا معلوم تھا، کہ سلطان کس طاقت کے زیر اثر پیش قدمی کر رہا ہے، دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ جس گرم جوشی سے مجاہدین نے حملہ کیا اس کا اثر راجہ کے ہراول پر خاطر خواہ ہوا۔ راجہ خود قلب لشکر میں ایک ہاتھی پر سوار یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا، ہراول کو پسپا ہوتے دیکھا تو راجپوتی خون رگوں میں کھولنے لگا، ہاتھی کو آگے بڑھایا اور آخر خود ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے داہنے اور بائیں بازو پر راجپوت سوار سلطان کی فوج پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے یہ ایک سیلاب تھا جو سامنے پڑا خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ سلطان جبین پر سراسیمگی کا عالم چھا گیا۔ ہر طرف موت کا بازار گرم ہو رہا تھا اس کی پریشان نظر سید کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ سید اس وقت گھوڑے پر سوار اپنی فوج بیراگیاں کے ساتھ ایک طرف تماشائے رزم دیکھ رہا تھا۔ سلطانی لشکر کو بری طرح پسپا ہوتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک سرور کی حالت میں اس کی نگاہ میدان جنگ کا جائزہ لے رہی ہے۔ وہ جلال و جمال کا دلکش مجسمہ تھا۔ اس وقت اس نے نعرہ "اللہ اکبر" پورے زور سے بلند کیا اور ساتھ ہی میدان جنگ فوج بیراگیاں کے نعرہ سے گونج اٹھا۔ سید اور اس کے ساتھ اس کی صوفیانہ جماعت نے دلیپ رائے کے ایک بازو پر حملہ کیا۔ دلیپ رائے خود بھی اس طرف متوجہ ہوا۔ اور عنان راہوار سید کی طرف پھیر دی۔ بیراگی راجہ کے بائیں بازو کی صفیں الٹ چکے تھے۔ ادھر سے سید اور ادھر سے

راجہ ایک دوسرے کے استقبال کو بڑھے دونوں قریب تر ہو گئے۔ راجہ کا ہاتھ تلوار کا وار کرنے کے لیے اٹھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں کسی زبردست طاقت نے تھام لیا۔ سید نے گھوڑے کی رکابوں پر کھڑے ہو کر شمشیر براں کا ہاتھ اس زور سے دیا کہ سینہ چیرتی ہوئی ناف تک دم نہ لیا، بے سر فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب اسلام اس ریاست میں بھی سرعت سے پھیلا۔ دلیپ رائے کا ہمشیرہ زادہ جس کا اسلامی نام میاں دلاور ہے۔ سید کا رفیق ہر ایک سفر میں رہا۔

اس جنگ کے واقعات میں کچھ اور روایات بھی بیان کی جاتی ہیں کہتے ہیں کہ جب سید کی تلوار راجہ کا سینہ چیرتی ہوئی نکلی تو دلیپ رائے کا دل باہر نکل آیا اس پر ایک بت کا نقش تھا جس کی پوجا راجہ کیا کرتا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقش سینہ پر ہو گا۔ ہندو ماتھے پر تلک تو لگایا کرتے ہیں۔ جسم کے کسی حصہ پر کسی مورتی کا نقش بھی بنا لیتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ سید پر اس کا اثر اتنا ہوا کہ بحالتِ جذب بے ہوش ہو گیا۔ کہ جب معبود باطل کے پوجاریوں کو اتنا شغف ہے کہ اس صورت خیالی سے جدا نہیں ہوتے تو معبود حقیقی تو کسی حال اور کسی مقام میں ذہن سے جدا نہ ہونا چاہیئے۔ الحی قیاماً و قعوداً و جنوباً، اسی کی یاد میں صعوبت واجب ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بارہ برس تک سید اسی حالت جذب میں رہا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اس سیر النفس کے دوران میں کن مرحلوں کو طے کر گیا اور کیا واردات اور کشف حقائق اس کے قلب سلیم پر ہوا۔ اس ضمن میں سید کی کرامات اکثر بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے دروازہ پر عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا۔ مگر

وہ سب سے بیگانہ تھا۔

راجہ دلیپ رائے کی ریاست کا مالک اب سلطان حسین تھا۔ بارہ برس کا عرصہ گذر گیا۔ آخر سید نے معراج لاہوت سے نزول عالم ناسوت کی طرف کیا۔ اور پھر وعظ و نصائح کا دروازہ کھول دیا۔ وطن مالوف کو خیرباد کہا تاکہ اس سے باہر خلق خدا اس کے فیض سے محروم نہ رہے۔

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ سید کو ہوس سلطنت اور خواہش حکومت نہ تھی۔ ابتدا سے درویش تھا اور آخر عمر تک درویشانہ سادہ زندگی بسر کی۔ اگر وہ چاہتا تو یہی ریاست جو اس کی شمشیر خارا شگاف نے بزور مسخر کی اس کی تھی مگر اسے دنیوی جاہ حشمت سے نفرت تھی۔ اس کے ذرا سے اشارہ پر ہر ایک ممکن سامان عیش و عشرت موجود ہو سکتا تھا۔ بے انتہا مال و منال جمع کر سکتا تھا۔ مگر "الفقر فخری" اس کی زندگی کے ہر ایک واقعہ سے نمایاں تھا۔

بارہ برس کا عرصہ گذرنے کے بعد سید اپنے چند مریداں باخلاق اور اہل و عیال کے ساتھ شہر چندیری میں آیا۔ اس بات کا سلسلہ تو اس سے پیشتر شروع ہو چکا تھا اب اس نے دعوی کیا کہ "مہدی موعود میں ہوں"۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سید پر کس طرح منکشف ہوا کہ وہ "مہدی موعود" ہے۔ روایت یہ ہے کہ خواب یا رویا میں اس نے ایک شخص کو دیکھا جس کے چہرہ پر تقدس کے آثار نمایاں تھے اس نے سید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو مہدی موعود ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ مہدی کا کسی زمانہ میں ظہور ہوگا۔ اس وقت

تک پختہ ہو چکا تھا، احادیث جو ابو داؤد اور ترمذی میں روایت ہوئی ہیں ان میں مہدی کا مذکور ہے۔ ترمذی (م ۲۷۹ھ) اور ابو داؤد سجستانی (م ۲۷۵ھ) چوتھی ہجری کے اواخر کے راوی ہیں۔ اس لیے یہ قرین عقل ہے کہ مہدی کا صاف صاف ممیز تصوّر چوتھی ہجری کے شروع میں موجود تھا۔ چونکہ سید محمد احادیث کا بہت بڑا عالم تھا اور ریاضت شاقہ اور مجاہدہ جاقرتے تزکیہ کا نفس و تصفیہ کے قلب کے ساتھ بہت کچھ حقائق دینی منکشف کر دیے تھے اس لیے یہ بہت سیدھی بات ہے کہ اسے بعض ارادات قلبی کے ذریعہ یہ یقین ہو گیا ہو کہ مہدی موعود وہی ہے۔ رفقا سفر نے سید کے دعوی پر آمنا و صدقنا کہا۔ سید جس جگہ گیا اس کے علم و فضل و زہد و تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کی شہرت اس کے ورود سے بہت عرصہ پہلے پہنچ چکی تھی اس لیے ہر ایک جگہ اس کا استقبال نہایت گرم جوشی سے ہوا۔ اگرچہ عوام ذوق و شوق سے سید کے حلقہ ارادت میں داخل ہو رہے تھے۔ مگر علماء اسلام مخالفت پر کھڑے ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرات شیعہ امامیہ تو ایک خاص شخصیت کی آمد ثانی کے منتظر ہیں اگر وہ کسی اور شخص کے دعوی مہدویت کا انکار کریں تو کچھ بات بھی ہے۔ لیکن اہل سنت والجماعت میں سے وہ فریق جو کسی مہدی کا منتظر ہے خواہ وہ کوئی ہو کیوں انکار کرتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ مہدی کا مذکور صرف چند احادیث میں ہے اور جن میں ہے ان میں مہدی کا حلیہ اور مقام خروج مدینہ یا خراسان حسب روایت شعبان (؟) بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کا مذکور کسی احادیث

میں نہیں ۔ اور بعض احادیث میں مہدی کے ساتھ حضرت عیسٰیؑ کے نزول کا بھی مذکور ہے اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں ۔ یہ تمام شرائط کسی شخصیت میں موجود ہوں تو سنی علماء اسلام بھی تسلیم کریں ۔

اب سید اور علماء اسلام کا مباحثہ کا بازار گرم ہو گیا ۔ سید کو چندیری سے نکلنا پڑا ۔ اس جگہ سے وہ شہر "مندو" میں آیا جو صوبہ مالوہ کا صدر مقام تھا ۔ سلطان ناصر الدین بن سلطان غیاث الدین بن سلطان محمود خلجی یہاں فرمانروا تھا ۔ سلطان غیاث الدین بقید حیات تھا ۔ مگر بیٹے نے نظر بند کر رکھا تھا ۔ اس بادشاہ کے فضائل و سیرت کی تصویر فرشتہ نے خوب کھینچی ہے ۔ شہزادگی کے عالم میں ایک بہادر جفاکش سپاہی تھا ۔ بادشاہ ہوا تو عیش و عشرت میں مستغرق ہو گیا ۔ خوب صورت عورتوں کا اتنا دلدادہ تھا کہ صدہا نوجوان صاحب جمال عورتیں اس کے محل سرا میں موجود تھیں جو عموماً لونڈیاں ہی تھیں ۔ ایک دن اپنے مقربوں سے کہا کہ میں نے کئی ہزار صاحب جمال عورتیں دیکھیں لیکن وہ صورت جو میرے تصور میں ہے آئینۂ شہود میں جلوہ گر نہیں ہوئی ۔ ایک ندیم نے عرض کی کہ جو لوگ اس خدمت پر مامور ہوئے صورت خوب و پیکر مرغوب کی تمیز نہیں رکھتے تھے اگر بندہ درگاہ اس خدمت پر مامور ہو تو وہ صورت جو طبع سلیم کے موافق ہے بہم پہنچائے گا ۔ سلطان نے پوچھا کہ معیار حسن کیا ہے ؟ جواب دیا کہ خداوند نعمت صاحب جمال کی صفت ہے کہ وہ ایسا متناسب الاعضا ہو کہ جو عضو اس کا نظر آئے دیکھنے والے کو دوسرے اعضاء کے دیکھنے سے مستغنی کر دے ۔ سلطان نے اسی کو اس خدمت پر مامور کر دیا ۔ دور دور

تک مختلف ممالک کی سیر کی مگر اس صفت کی کوئی عورت نظر نہ آئی
مایوس ہو کر واپس لوٹا اتفاقاً سلطان ہی کی ولایت کے ایک موضع میں
ایک ماہ پیکر نازنین نظر پڑی جو بہمہ صفت موصوف تھی۔ چند روز اسی
موضع میں بسر کیے آخر اس پری وش کو اٹھا لایا۔ سلطان کی خدمت میں
حاضر ہو کر عرض کی کہ میں نے اس حسن یوسف کو ہزار ہا روپیہ میں خرید
کیا ہے یہ تو محل سرا میں داخل ہو گئی۔ مگر اس کے والدین لڑکی کی تلاش
میں آئے۔ اور بارگاہ سلطان میں فریاد کی کہ آپ کے مقربین میں سے
فلاں شخص ہماری بھولی بھالی لڑکی کو اغواء کر کے لایا ہے۔ آخر سب راز
افشا ہو گیا۔ سلطان نے علماء سے فتویٰ طلب کیا اور کہا کہ جو حکم شرع
کا ہو مجھ پر جاری کیا جائے۔ جب لڑکی کے والدین کو اصل حالات کا علم
ہوا تو کہا کہ ہم اپنے دعویٰ سے دست بردار ہوتے ہیں۔ زہے
نصیب ہمارے کہ سلطان کی دامادی کا فخر حاصل ہوا۔ سلطان نے کہا
کہ اب یہ عورت میرے لیے مباح ہوئی۔ لیکن اس سے پیشتر میں زنا
کا مرتکب ہوتا رہا ہوں اس لیے شرعاً جو سزا میرے لیے تجویز کی
جائے میں اس کا سزا وار ہوں علماء نے کہا کہ ناوانستہ جو بھی گناہ سرزد
ہو شرعاً قابل مواخذہ نہیں البتہ کفّارہ واجب ہے۔ اب سلطان نے
بھی توبہ کی اور حکم دیا کہ آئندہ کوئی شخص میرے لیے کوئی عورت نہ
لائے ایک دفعہ ایک شخص گدھے کا ایک سم لایا اور کہا کہ حضرت
عیسیٰ کے گدھے کا ہے۔ پچاس ہزار تنکہ میں خرید کیا۔ اسی طرح
تین آدمی بعد بھی ایک ایک سم لائے ان کو بھی فی سم پچاس ہزار تنکہ دیے گئے
پانچواں شخص بھی کچھ عرصہ بعد ایک سم لایا۔ وہ بھی پچاس تنکہ کے عوض

خرید کیا۔ ایک مقرب نے کہا کہ شاید حضرت عیسےٰ کے گدھے کے پانچ پاؤں ہتے۔ جواب دیا کہ حضرت عیسےٰ کے گدھے کو عام گدھوں میں فضیلت اور فوقیت ضرور ہوگی۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اکثر اہل جنت سادہ لوح ہیں تو سلطان غیاث الدین سے بڑھ کر اس زمانہ میں کوئی نہ ہوگا۔ اس پر بھی اس کی سخاوت اور رحم اور حلم ضرب المثل تھا۔ تمام عمر کسی ایسی شے کا استعمال نہ کیا جو نشہ آور ہو ایک دفعہ حکماء نے ایک معجون ایک لاکھ روپیہ صرف کرکے تیار کی اس کے اجزا میں دو درم "جوزبوا" بھی تھے۔ معلوم ہوا تو حکم دیا کہ جلا دو۔ کسی مقرب نے کہا کہ اگر حضور استعال نہیں فرماتے کسی اور کو عنایت فرمائیے کہا کہ حاشا جو میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا دوسرے کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ تہجد کبھی قضا نہیں کی۔

المختصر یہ نیک نہاد سلطان اپنے بیٹے ناصر الدین کے حکم سے محل سرا میں نظر بند تھا کہ سید محمد منڈو میں وارد ہوا۔ یہاں تو قع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔ خود سلطان حلقہ ارادت میں داخل ہوا جیسا راجہ دلپی پر جا اکثر امرا و وزرا نے بھی بیعت کی عوام تو گرویدہ ہی تھے۔ امرا و سلطان میں سے ایک شخص مسمی "الہ داد" بھی سید کا مرید ہوا۔ اس شخص کے علم وفضل کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ ارادت کا یہ حال ہے کہ امارت پر لات ماری اور فقر وفاقہ قبول کیا۔ سید کا ساتھ ہر ایک سفر میں دیا صاحب تصانیف بھی ہے "رسالہ بار امانت" اور "ثبوت مہدیت" اسی کی تصنیف ہے۔ صاحب دیوان بھی ہے۔

سید محمد ایک جگہ جم کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بعض مقامات

سے تو اسے مجبوراً علماء اسلام کی مخالفت کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ اور اکثر اوقات وہ خود شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک وعظ کرتا ہوا اور اپنے دعاوی کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوا سفر کرتا رہا۔ وہ خاص وصف جو فطرت نے اس کی زبان میں ودلیعت کیا ہوا تھا۔ ہر ایک سامع کو گرویدہ بنا لیتا مریدوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ اور اس کا شہرہ اکثر ممالک ہند میں پھیل گیا۔ اگر ہم صرف سید کے سفر نامہ کو لکھیں تو ایک دفتر چاہیئے۔ ہم صرف چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو دوران سفر میں پیش آئے۔

سید منڈو سے نکل کر "چاپانیر" میں آیا۔ سلطان محمود بیکرہ والیٔ گجرات اولوالعزم فرمانروا تھا اگر علماء اسلام مانع نہ آتے تو یہ بھی سید کا مرید ہو چکا تھا۔ مگر باوجود مخالفت اکثر لوگ عام و خاص حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ ان میں ایک نوجوان طالب علم میاں نظام الدین نامی تھا۔ ہر ایک سفر میں سید کے ہمراہ رہا۔ اسی جگہ سید کی بیوی کا انتقال ہو گیا جہدوی اسے بی بی آمنہ کہتے تھے۔ قلعہ کے نیچے مزار ہے اس جگہ سے سید براہ برہان پور اور دولت آباد شہر احمد نگر میں آیا۔ بہمنیہ خاندان کے بعد پانچ سلطنتیں دکن میں قائم ہو چکی تھیں جو علی کی ہمعصر حکومتوں سے موسوم ہیں۔ احمد نگر سلطنت نظام شاہیہ کا پایۂ تخت تھا۔ بانی سلطنت احمد نظام الملک بحری سے موسوم ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ اس شہریار کے خصائل حمیدہ اور فضائل پسندیدہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اس کے زہد و صلاح و پرہیزگاری کے قصے مشہور ہیں۔ سوار ہو کر جب کسی شہر میں آتا کبھی دائیں بائیں نہیں دیکھتا

تھا، ایک ندیم کے سوال پر کہا کہ بادشاہ کی سواری کے وقت اکثر مرد و زن زیارت اور تماشائے جلوس کے واسطے آتے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ میری نگاہ بے محابا کسی نامحرم عورت پر پڑے تو وبال اس کا میری گردن پر ہو۔

ہزار آفرین از جہاں آفرین　　بر آں شاہ با دانش و داد و دیں

احمد نگر میں سید کا استقبال نہایت گرم جوشی سے ہوا۔ خود احمد نظام شاہ سید کا مرید ہو گیا۔ ایک داعی جس کی حیثیت ایک اولوالعزم خود مختار سلطان کی تھی۔ ایک درویش کا مرید ہونا معمولی بات نہیں ہے سید کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور شاید ہی ثبوت ہو سکتا ہے کہ والیان ملک بھی اس کے آستانہ پر بصد عجز و نیاز حاضر ہوتے اور اسے سعادت دارین یقین کرتے۔ سلطان کی تقلید رعایا نے بھی کی۔ سلطنت نظام شاہیہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سید کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔ اگر سید دنیوی جاہ و جلال اور حکومت کا خواہاں ہوتا تو یہ سب کچھ اس کے دست تصرف میں آسکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں ایک ہی جذبہ اور دماغ میں ایک ہی خیال کا ذکر کار فرما تھا کہ تمام دنیائے اسلام کے سامنے دعوئ مہدویت پیش کرے اور وہ تسلیم کرے۔

احمد نگر کو مسخر کر کے وہ شہر احمد آباد بیدر میں آیا۔ یہ پایہ سلطنت بریدشاہیہ تھا۔ حکمران ملک قاسم برید تھا۔ اور یہی اس سلطنت کا بانی بھی تھا۔ عوام الناس کے علاوہ علمائے اسلام اور قاضی شہر نے بھی بیعت کی۔ یہاں سے سید سلطنت بہمنیہ کے دارالسلطنت گلبرگہ" حسن آباد میں آیا۔ اس جگہ سید محمد گیسو دراز کا مقبرہ ہے۔ آپ

خلیفہ نصرالدینؒ چراغ دہلی تھے۔ اور چراغ دہلی خلیفہ نظام الدینؒ اولیاء کے تھے۔ اہالیان دکن کی عقیدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرشتہ کہتا ہے کہ اگر کسی دکنی سے پوچھو کہ سید محمد گیسو دراز اور آنحضرتؐ کے درجات میں کیا فرق ہے تو یہ جواب دیتا ہے کہ آنحضرتؐ تو رسول خدا ٹھہرے مگر "سید محمد چیزے دیگر است"۔ ہمارا سید محمد خود بھی چشتی تھا مقبرہ پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کی۔ اسی جگہ حج بیت اللہ کا شوق دل میں پیدا ہو گیا۔ خاک سیاہ ہند کو خیرباد کہہ کر معہ اصحاب مکہ معظمہ میں احرام باندھے ہوئے حاضر ہوا۔ جس وقت حرم میں قدم رکھا تھا ایک حدیث یاد آئی۔

عن ام سلمہ عن النبی صلعم قال یکون اختلاف عند موت خلیفہ فیخرج رجل من اہل المدینۃ ہاربا الی مکۃ فیاتیہ ناس من اہل مکہ فیخرجونہ وھو کارہ فیبایعونہ بین الرکن والمقام (الخ)

اگرچہ یہ واقعہ عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق ہے اور ۷۳ھ میں اس کا ظہور ہو چکا تھا مگر اسی جگہ رکن و مقام کے درمیان سید کے منہ سے نکلا من اتبعنی فھو مومن۔ "جو بھی میرا اتباع کرے گا وہی مومن ہے"، میاں نظام الدین اور قاضی علاء الدین نے آمنا و صدقنا کہہ کر بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس طرح یہ پیش گوئی بھی کسی حد تک سید کے حق میں پوری ہوئی۔

حج بیت اللہ کے بعد سید نے ہندوستان کی طرف مراجعت کی۔ مسجد تاج خاں سالار واقع احمد گجرات میں ٹھہرا۔ ملک برہان الدین اور ملک گوہر طبقہ امرا میں تھے۔ حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ سلطان محمود

والیٔ گجرات علماء اسلام کی مخالفت کی وجہ سے مجبور ہوا۔ اور سید کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ سید قصبہ "بدلی" میں آیا۔ مولف تذکرہ علماء ہند اس روایت کا ذمہ دار ہے کہ اس جگہ سید نے ایک جلسہ عام میں کہا کہ انا مہدی مبعین مراد اللہ اور اپنے جسم کی جلد کو دو انگلیوں سے پکڑ کر کہا کہ جو شخص اس ذات کے دعویٰ مہدویت کا منکر ہے کافر ہے مجھے اللہ تعالےٰ سے بیواسطہ احکام ملتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ علم اولین و آخرین اور بیان یعنی فہم قرآن اور ایمان میں نے سب تجھے عنایت فرمایا۔ جو شخص تیرا اقرار کرتا ہے مومن اور تیرا منکر کافر ہے جمیع مریداں با اخلاص سے آمنا و صدقنا نکلا۔

یہ بہت بڑا رسول ہے۔ اور کوئی مومن مسلمان جو شریعت محمدیہ کے تابع ہو اور احکام شرعیہ کا سختی سے پابند بھی ہو۔ کسی مسلمان کو کافر نہیں کہے گا جو اہل قبلہ اور بظاہر ارکان اسلام کا پابند بھی ہو۔ سید تو اہل اللہ کی مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے بھی جاتا رہا اور حج بھی کیا۔ اور اپنے متبعین کو معمولی صوم و صلاۃ کے علاوہ ذکر و شغل جو خانوادہ چشتیہ میں رائج ہے تلقین کرتا۔ اس کے سلسلہ میں بڑے بڑے اولیاء گذرے ہیں جن کا تذکرہ بدایونی وغیرہ نے لکھا ہے۔ اس سے یہ توقع تو نہیں ہو سکتی کہ اپنی شخصیت کے منکر کو کافر کہے۔ رہا دعویٰ الہام و القار بانی یعنی بے واسطہ واردات قلبی، جسے ہمارے علماء دگی غیر منکر بھی کہتے ہیں تو یہ کچھ ایسی بات نہیں جس کا انکار کیا جائے۔ اللہ تعالےٰ کائنات کی ہر ایک شے سے فطرتاً کلام فرماتا ہے۔ زمین اور آسمان میں وحی فرماتا ہے، اہل اللہ کو تقویٰ کا

الہام ہوتا ہے۔ اور بدکاروں کو فجور کا، ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی کو وحی ہوتی ہے ام موسیٰ کو وحی ہوئی۔ لیکن ایسے الہامات اور وحی کی بنا پر کوئی نبی یا نبیہ نہیں ہو سکتی۔ علم اولین و آخرین بھی ہمہ دانی کا دعویٰ ہے۔ سید نے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جس سے اس دعویٰ کا جائزہ لیا جائے۔ ایسا دعویٰ تو آنحضرت ؐ سے بھی منسوب نہیں کیا جاتا۔ آج تک کوئی انسان ایسا نہیں ہوا، جو یہ دعویٰ بدلائل ثابت کر سکے کہ ایک ذرہ بے مقدار کا علم بھی کما حقہ حاصل ہے۔

ہمارے زمانہ میں "اٹامک انارجی" کا علم بھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ "الغیب" یعنی وہ امکانات جو کائنات کی ہر ایک شے بلکہ ذرہ ذرہ میں پوشیدہ ہے اللہ تعالےٰ جتنا چاہے اپنے بندوں میں سے برگزیدہ اشخاص پر منکشف فرماتا ہے۔ آنحضرت ؐ بھی یہی کچھ کہتے ہیں کہ میں غیب کے خزانوں کا مالک نہیں۔ اگر ان کو علم ہوتا تو بہت کچھ چیزیں اپنے لیے جمع کر لیتا۔ مجھے اتنا بھی معلوم نہیں کہ میرے ساتھ اور تمہارے کل کیا ہونے والا ہے۔

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے۔ سید کے مخالفین نے بعض باتیں سید سے ایسی منسوب کر دی ہیں کہ لوگ بدظن ہوں۔ علماء اسلام تو مخالف تھے۔ سید کو قصبہ بدلی بھی چھوڑنا پڑا۔ اور خود بھی ایک جگہ جم کر بیٹھنا نہ چاہتا تھا فرمان سلطان بلائے ناگہانی کی طرح لائے۔ یہاں سے سید شہر ٹھٹھہ میں آیا جو سندھ میں صدر مقام تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ ٹھٹھہ ہی وہ مقام ہے جسے کسی وقت "دیبل" کہتے تھے یہاں بھی کچھ آدمی حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ مگر علماء کی مخالفت

کا طوفان بھی امڈا چلا آ رہا تھا۔ سید سے وہ باتیں منسوب کیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ شاہ ستدھ نے حکم قتل صادر کیا۔ لیکن ایک مصاحب نے مشورہ دیا کہ تحقیق کے بعد ایسا حکم قابل تعمیل ہو سکتا ہے علماء کے ایک طرفہ فیصلہ پر کسی کا حکم قتل جائز نہیں۔ اگر سلطان کو شورش اور بدامنی کا خوف ہے تو سید کو حکم دیا جا سکتا ہے کہ آپ کی مملکت کے حدود سے باہر ہو جائے۔ چنانچہ سلطان نے اسی مشورہ پر عمل کیا۔ سید کے ہمراہ اس وقت آٹھ سو آدمی تھے۔ ان کے ساتھ خراساں کی طرف ہجرت کی۔ ان میں سے تین سو ستر آدمی ایسے منتخب تھے کہ ان کا لقب اصحاب اور مہاجرین ہوا۔ قندھار میں پہنچا تو مرزا شاہ بیگ حاکم قندھار کو سید اور اس کے دعویٰ کی اطلاع ہوئی جمعہ کے روز مسجد جامعہ میں طلب کیا۔ علماء اسلام سے بحث کی طرح ڈالی۔ اس مجادلہ کے محرک خود علماء تھے۔ علماء اسلام نے نہایت سختی بلکہ روایتی بداخلاقی سے گفتگو کی۔ سید کی طرف سے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ مہذبانہ الفاظ میں جواب دیا گیا حاکم قندھار پر سید کے اخلاق حسنہ اور فروتنی بالخصوص استدلال کا یہ اثر ہوا۔ کہ گرویدہ ہو گیا۔ یہاں بھی سید "زتھہ اترفراہ" میں آیا۔ علماء کی عام مخالفت نے امیر ذوالنون حاکم شہر کو سید کے حالات کی طرف متوجہ کیا، اس طرح پھر ایک دفعہ علماء اسلام سے مناظرہ کی ٹھہری۔ امیر نے کل حالات مرزا حسین شاہ خراساں کی خدمت میں لکھے اور جواب کا منتظر رہا۔ سید نے نو ماہ ابھی انتظار میں یہاں بسر کیے۔ لیکن افسوس ہے کہ آخر وہ دن آ گیا جس کا دھڑکا ہر ایک ذی حیات کو لگا ہوا

ہے ۔یعنی بروز پنجشنبہ ۹۱۱ھ تہتر برس کی عمر میں سید محمد المہدی جونپوری کا انتقال اس دار فانی سے دارالبقا کی طرف ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ، شہر فراہ میں مدفون ہوا۔ الہ داد نے قبر پر کھڑے ہو کر مرثیہ پڑھا سید کے استقلال کی تعریف لفظوں میں نہیں ہو سکتی۔ مرتے دم تک اپنے دعویٰ پر قائم رہا۔ اور سچ [illegible] یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا اس کی صداقت کا اسے کامل یقین بھی تھا۔ علماء اسلام نے اس کی سخت مخالفت کی، کئی دفعہ شہر بدر ہوا۔ کئی دفعہ قید کی مصیبت بھی جھیلی قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ مکہ معظمہ گیا۔ خراساں گیا۔ اور اس حدیث کا بھی مصداق بنا جو ثوبانؓ سے مروی ہے کہ رجب دجال خراساں سے خروج کرے گا۔ اگرچہ یہ حدیث ابو مسلم خراسانی کے حق میں پوری ہو چکی تھی۔ اور اس کا فائدہ بنو عباس نے خاطر خواہ اٹھایا۔ ابو مسلم مارا گیا اور کذاب تھا۔ سید تو "اہل بیتی" دعترتی سے تھا، وہ ہر ایک جگہ اپنے دعاوی پیش کرتا رہا۔ اسے اپنی جان کی فکر نہ تھی۔ اسے کامل یقین تھا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے اور آخر لوگ تسلیم کر لیں گے۔ اور کوئی شخص اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔

سید کو زندگی میں جو کچھ کامیابی ہوئی اس سے کہیں بڑھ کر وفات کے بعد ہوئی۔ دکن میں مذہب مہدیہ بالاستقلال قائم ہو گیا۔ پالن پور اور جنجیرہ وغیرہ ریاستوں میں اسی مذہب کے متبعین اب بھی ہیں۔

۹۱۱ھ ایک تاریخی سال ہے۔ زلزلہ اور طاعون دونوں بلاؤں کا ظہور ہوا۔ زلزلہ کی نسبت فرشتہ سلطان سکندر لودی کے حالات میں لکھتا ہے کہ :- اس سال بروز یکشنبہ ماہ صفر کی تیسری تاریخ

تھی کہ ایک زلزلہ عظیم واقع ہوا۔ یہاں تک کہ پہاڑ بھی لرز گئے۔ بلند اور محکم عمارات گر پڑیں۔ زندوں نے قیامت اور مردوں نے حشر محسوس کیا۔ قطعہ تاریخ اس واقعہ کا یہ ہے۔

در نہ صد و احدی عشر از زلزلہا	گردید سواد آگرہ مرحلہا
با آنکہ بنا ہائش بسے عالی بود	از زلزلہ شد عالیہا سافلہا

اس زمانہ تک ایسا تباہ کن زلزلہ ہند میں واقع نہ ہوا تھا اور کوئی شخص کسی تاریخی شہادت سے کسی ایسے زلزلہ کا نشان نہیں بتا سکتا یہ زلزلہ اکثر بلاد ہند میں آیا۔

طاعون تو دو تین سال پیشتر پھوٹ پڑا تھا۔ باوجود اس امر کے ہندوستان میں آمد و رفت کے ذرائع جیسے کہ ہمارے زمانہ میں ہیں۔ مفقود تھے مگر یہ وبا ایسی عالمگیر تھی کہ کوئی شہر ایسا نہ تھا کہ اس موذی نے خانہ ویرانی نہ کی ہو۔ زلزلہ کے جھٹکے تو آئے اور گذر گئے مگر طاعون عرصہ دراز تک رہا۔ فرشتہ اس کی تباہ کاری پر بھی بہت کچھ لکھتا ہے ایسے حوادث کا اثر عوام کے دل پر بہت ہوتا ہے۔ سلطان محمود غازی رابع کے عہد میں ایک یہودی نے بیت المقدس میں دعویٰ کیا میں "مسیح موعود" ہوں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ بہت باتونی اور شعبدہ باز تھا اور وجیہہ بھی تھا۔ کثرت سے یہودی اور ہزاروں عیسائی اس کے گرویدہ ہو گئے۔ والئ بیت المقدس نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا تو بھاگ کر قسطنطنیہ میں آیا۔ یہاں صدر اعظم احمد پاشا نے جیل میں بند کر دیا۔ عیسائی اور یہودی روزانہ کثیر تعداد میں روپیہ دے کر زیارت کے لیے آتے۔ سلطان کو بھی اطلاع ہوئی۔ بہ نفس نفیس ملاقات

کے لیے آیا۔ مدعی مسیحیت نے تقریر شروع کی۔ سلطان نے کہا کہ میں
آیات و روایات نہیں جانتا۔ سپاہی ہوں۔ چند تیر اندازوں کو حکم دیتا
ہوں کہ تجھے نشانہ بنائیں اگر تیرے جسم پر اثر نہ ہوا تو میں تجھ پر ایمان
لے آؤں گا اور یہ وسیع مملکت بھی تیری ہے۔ مسیح کاذب سلطان کے
پاؤں پر گر پڑا اور کہا مجھ میں آپ کے امتحان کی طاقت نہیں اور
ساتھ ہی کلمہ طیبہ پڑھا لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ، سلطان بھی ہکا بکا
ہو کر رہ گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس کی کامیابی اتنا عرصہ اس
لیے ہوئی کہ ۱۰۱۱ھ میں متواتر زلزلوں اور طاعون نے لوگوں کو خوف
زدہ کر دیا تھا اور ہر ایک کو یقین تھا کہ قیامت نزدیک ہے۔ اور
اور مسیح کا نزول بھی قرب قیامت کی دلیل ہے۔

صد قیامت رفت وازو زمرا فردا نکرد

مدعیان مہدویت کا تذکرہ ہم نے بالاختصار لکھا ہے سید محمد
جونپوری سے پیشتر جو بھی مدعی مہدویت تھا اس کا مقصد سیاسی
تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سید کا اصل مقصد اس دعویٰ کے
ضمن میں کیا تھا۔ یہ تو ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سید دنیوی
حکومت کا خواہاں نہ تھا۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام جو اس نے
شروع کیا وہ ایک عظیم الشان مقصد تھا۔ دلیپ رائے کے معرکے کے
بعد اس کے خاندان کے اکثر افراد نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے
دلیپ رائے کا ہمشیرہ زادہ بھی جس کا نام اسلامی میاں دلاور رکھا
گیا تھا۔ ہر ایک سفر میں سید کا ساتھ سایہ کی طرح دیا۔ اسی طرح
سید کے دعویٰ مہدویت سے پیشتر اکثر ہندو خاندان حلقہ بگوش

اسلام ہوئے۔ لیکن دعویٰ مہدویت کے بعد سید کی توجہ کو علماء اسلام کی مخالفت اور مناظرہ نے جذب کر لیا۔ اس لیے ابتدائی مقصد کی تکمیل خاطر خواہ نہ ہوئی۔ دعویٰ مہدویت کا مقصد خواہ تحت الشعور ہو اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ سید اپنی شخصیت کو منوانا چاہتا تھا۔ لیکن تعجب زیادہ تر اس بات کا ہے کہ سید بہت بڑا عالم دین اپنے زمانہ میں تھا۔ علماء ہند کے تذکرہ میں سید کا ذکر اسی لحاظ سے کیا گیا ہے۔ جو دعویٰ آنحضرت نے بھی نہ کیا۔ اس سے توقع نہیں ہو سکتی کہ اس کا یہ مقصد درحقیقت تھا۔ مگر نفسیات کے عالم جانتے ہیں کہ ایسے لوگوں نے دعویٰ اسی شخصیت پرستی کے لیے کیا۔ اس لیے سید کو بھی معذور سمجھنا چاہیے۔

اسی شخصیت پرستی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا ہوئے جو کسی نہ کسی شخصیت سے وابستہ تھے اور ان میں سے بعض آج بھی ویسے ہی وابستہ چلے آتے ہیں۔ اسی طرح ایک فرقہ "مہدویہ" کا ظہور ہوا جو سید محمد سے وابستہ ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ سید کے متبعین جو اب بھی لاکھوں نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح سید کی آمد ثانی کے منتظر ہیں یا نہیں بلکہ سید نے جو کچھ تلقین فرمایا اسی پر کار بند ہیں۔

آخر میں ان واقعات کا تذکرہ بے فائدہ نہ ہوگا۔ جو فرقہ مہدویہ

کی ابتدائی تاریخ کے ضمن میں بیان کیے جاتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے شروع تک اس فرقہ کا زور بہت رہا۔ دکن میں دہلی کی ہمعصر حکومتوں میں تو اس کے متبعین کثرت سے موجود تھے۔ احمد نگر کے واقعات میں فرشتہ ایک شخص جلال خاں سپہ سالار افواج کا ذکر کرتا ہے کہ ایک جنگ کے موقع پر دس ہزار مہدوی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ مورخین شیخ علائی کا تذکرہ مفصل لکھتے ہیں۔ اس مقام پر ہم اس کا اقتباس اس غرض سے کرتے ہیں کہ معلوم ہو کہ سید کے متبعین کا کیا شغل تھا۔ اور ضمناً یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ سید کے دعویٰ مہدویت کے ضمن میں اور کیا بات تھی۔

شیخ علائی کا باپ حسن بنگالہ کے شیوخ میں سے تھا۔ شیخ نے حج کے بعد علوم و فنون کی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی۔ پیری مریدی بھی ایک فن ہے اس لیے ہم نے علوم دین کے ساتھ اس کو بھی شامل کر لیا ہے۔ باپ کا انتقال ہوا تو خود مسند ارشاد پر بیٹھا۔ جیسا کہ ہر ایک پیر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا حلقہ ارادت وسیع اور وسیع تر ہو۔ اور اس کی ذات مرجع خاص و عام ہو۔ اور دیگر پیروں سے رقابت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ علائی بھی دوسرے مشائخ وقت کی عزت و احترام پسند نہ کرتا۔ ایک دفعہ ایک پیر کو محفہ سے اتار کر سخت ذلیل کیا۔ اس وقت شیخ علائی کی مشیخت کا یہ حال تھا۔

بزیر دلق مرصع کمندہا دارند　　دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں

میاں عبداللہ نیازی افغان شیخ سلیم چشتی کے خلفا میں سے تھا۔ شیخ سلیم کا اکبر بہت معتقد تھا۔ اسی کی دعا سے اکبر کے ہاں لڑکا پیدا

ہوا اس کا نام سلیم رکھا اور اسے "شیخ جیو" کہہ کر مخاطب کیا کرتا۔ یہ بعد میں نورالدین جہانگیر ہوا۔ میاں عبداللہ شیخ سے اجازت لے کر حج کعبۃ اللہ کو گیا۔ واپسی پر سید محمد جونپوری کے کسی خلیفہ سے ملاقات ہوئی حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا۔ مذہب مہدویت اختیار کیا اور "بیانہ" میں آیا۔ اس مقام پر شیخ علائی کی سکونت تھی، آبادی سے دور ایک باغ کے گوشہ میں سکونت اختیار کی۔ حوض سے گھڑے بھر کر سر پر اٹھا کر لاتے نماز کے وقت کسانوں اور راہ گیروں کو نماز باجماعت ادا کراتے۔ جس کسی کو کچھ تامل ہوتا کچھ اپنے پاس سے دیکر جماعت کو ترغیب دیتے یعنی "مولفۃ القلوب" پر بھی عمل تھا۔ ایک دن شیخ علائی کا بھی اس طرف گذر ہوا۔ میاں عبداللہ کا طریقہ بہت پسند آیا اپنے خادموں سے کہا کہ دین و ایمان اور عمل اسی کا نام ہے اور جس روش پر ہم چل رہے ہیں وہ محض بت پرستی اور زنار داری اور ریا کاری ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر میاں عبداللہ کے دست حق پرست پر بعیت کی۔ جو لوگ اس کی گذشتہ عادات سے ناراض تھے انہیں منت و سماجت سے راضی کیا، اسباب دنیوی جو کچھ پاس تھا یہاں تک کہ کتابیں بھی محتاجوں میں تقسیم کر دیں۔ زوجہ سے کہا کہ اگر فقر و فاقہ منظور ہو تو بسم اللہ میرے ساتھ رہو ورنہ اپنا حصہ اس مال سے لے لو اور مختار ہو جہاں چاہو رہو۔ بیوی نے فقر و فاقہ بخوشی خاطر منظور کیا۔

خاندان "مہدویہ" میں "پاس انفاس" ابتدا میں تعلیم کرتے تھے۔ اور یہ دیگر افکار و شغل وہی کچھ ہیں جو خاندان چشتیہ و قادریہ وغیرہ میں تعلیم کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سلسلے

دعویٰ مہدویت سید محمد نے کوئی اور بدعت رائج نہیں کی۔ اس کے متبعین کو لوگ مہدی کہتے ورنہ یہ تمام بھی سید کا معجزہ نہیں، شیخ علائی نے تمام اذکار وشغل جو اس طریقہ میں مروج تھے سیکھے، بدایونی لکھتا ہے کہ تصفیہ قلب وتزکیہ نفس کے بعد "فہم قرآن" حاصل ہوا۔

اس وقت شیخ علائی کے رفقاء سینکڑوں آدمی تھے۔ ان میں سے تین سو صاحب اہل وعیال بھی تھے مگر اکثر کوئی پیشہ یا تجارت نہ کرتے تھے، جو کچھ کہیں سے مل جاتا سب برابر تقسیم کر کے کھاتے۔ اور اگر کوئی کسب بھی کرتا تو دسواں حصہ فی سبیل اللہ ضرور صرف کرتا۔ دن میں دو دفعہ ایک جگہ جمع ہوتے، قرآن شریف کا درس ہوتا شیخ علائی کی تو کایا پلٹ گئی تھی، اس کے واعظ میں یہ اثر تھا کہ جس کسی نے ایک دفعہ سن لیا سب کچھ چھوڑ کر خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ اور پھر کسی دوسرے کام کے نزدیک نہ جاتا۔ یہ لوگ ایسے توکل پیشہ تھے کہ اگر بھوک کے مارے دم بھی نکل جاتا تو دم نہ مارتے اور نہ دست سوال دراز کرتے۔ آگئی تو روزی ورنہ روزہ، ان کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ اگر کوئی غیر شخص ان کے پاس آنکلتا تو زیادہ توفیق نہ ہوتی تو ملیہات سے توبہ ضرور کرتا۔ رات کو کھانا پکاتے اور استعمال کے برتن الٹے رکھ دیتے، آٹا اور نمک کا تو کیا ذکر ہے، پانی بھی پاس نہ ہوتا۔ اللہ تعالٰے مسبب الاسباب ہے۔ دوسرے دن کہیں سے کچھ روزی کا سامان ہو جاتا۔ مگر اس فقر وفاقہ کے ساتھ ہمیشہ مسلح رہتے اور بازاروں میں بلکہ جس جگہ کوئی بات خلاف شرع دیکھتے بزور روکتے۔ شہر کے حکام تو ان کے معتقد تھے ہی،

ہر طرح مدد و معاونت کرتے اور جو منکر تھے ڈر کے مارے کچھ نہ کہتے، شیخ علائی کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ باپ بیٹے کو اور بھائی بھائی کو خاوند بیوی کو چھوڑ کر دائرہ مہدویت میں داخل ہو رہے تھے، لوگوں کا ہجوم ہو رہا تھا۔ میاں عبداللہ نیازی ایک درویش خلوت نشیں تھا گھبرا گیا اور شیخ علائی کو کہا کہ میرے اوقات میں خلل واقع ہوتا ہے اور میں اتنے ہجوم اور ان کے شور و غل کا متحمل نہیں ہو سکتا یا تو خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کر و یا سفر حج پر کمر باندھو۔ شیخ علائی تو فطرۃ جوشیلا آدمی تھا۔ کنج تنہائی میں بیٹھنا مشکل نظر آیا۔ اس لیے "بیانہ" سے چل پڑا۔ کئی شہروں کا چکر لگا کر پھر بیانہ میں آگیا۔ سلیم شاہ سوری اس وقت آگرہ میں تھا۔ شیخ کی شہرت سنی تو آگرہ میں بلایا۔ شیخ اپنے مریدوں کے ساتھ جو ہر وقت زرہ پہنے، ہتھیار لگائے رہتے دربار شاہی میں آیا۔ آداب و مراسم کو بالائے طاق رکھ کر موافق سنت نبوی "السلام علیکم" کہا۔ سلیم شاہ نے بڑی کراہت سے جواب دیا شیخ کی یہ حرکت حاضرین دربار کو ناگوار گذری ۔ اہل غرض نے سلیم شاہ کے کان پہلے ہی بھر دیے تھے کہ امام مہدی تمام جہان کے بادشاہ ہوں گے اس لیے ضرور ہے کہ اس شخص کا ارادہ بھی خروج و بغاوت کا ہو۔ درباریوں میں سے ایک امیر نے شیخ علائی کی شکستہ حالی اور پھٹے پرانے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی جوتیوں پر پھبتی کہی کہ یہ حال اور ہیئت گدائی اور دعوئ شاہی۔ کیا ہم افغان مر گئے گئے ہیں کہ ایسے ایسے گدا ہوس شاہی کرتے ہیں ۔ شیخ علائی پر سلیم شاہ کے غصہ اور درباریوں کی یاوہ گوئی کا کچھ اثر نہ ہوا حسب معمول

قرآن شریف کی چند آیات سے تقریر شروع کی۔ اس میں دنیا اور
دنیا والوں کی مذمت اور احوال قیامت اور دین فروش علمائے بے عمل
کو آڑے ہاتھوں لیا۔ سلیم شاہ اور درباری مبہوت ہو کر رہ گئے۔ اور
اکثر زار زار رونے لگے۔ آخر بادشاہ اٹھ کر محل سرا میں گیا۔ اور وہاں
سے شیخ علائی اور ان کے رفقاء کے لیے کھانا بھیجا۔ مگر ان میں سے
کسی نے نہ کھایا۔ سلیم شاہ نے واپس آکر سبب دریافت کیا تو شیخ علائی
نے بے دھڑک جواب دیا کہ تمہارا خزانہ بیت المال ہے جس پر سب
مسلمانوں کا حق ہے، اس پر تمہارا ذاتی تصرف بے جا ہے۔ اور تمہارا
کھانا بھی اسی قسم کا ہے۔ سلیم شاہ کو غصہ تو آیا مگر ضبط کیا۔ پھر علماء
کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ لوگ مسئلہ مہدیت و مہدی کے بارہ میں
کیا کہتے ہو۔ میر رفیع الدین صفوی نے وہ احادیث بیان کیں جن میں
امام مہدی موعود کی علامات مذکور ہیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ تم شافعی ہو اور
ہم حنفی ہیں، ہمارے اور تمہارے عقاید میں بڑا فرق ہے اور تمہاری
توجیہہ اور تاویل ہمارے واسطے سند نہیں۔ اور نہ ہم تسلیم کرتے ہیں
اس لیے تمہارے استدلال کو کس طرح قبول کریں۔ البتہ اس مجلس میں
حنفی علماء موجود ہیں۔ اگر وہ کچھ کہیں تو میں بھی سنوں گا۔ بادشاہ نے
ملا عبداللہ مخدوم الملک کی طرف دیکھا۔ یہ بادشاہ کے مقربوں میں سے
تھا۔ شیخ علائی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو دنیا دار فاسق ہے
اور عہدہ قضا کے لائق نہیں۔ علانیہ تیرے گھر سے باجوں کی آواز سنائی
دیتی ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے جو مکھی نجاستوں پر بیٹھتی ہے وہ
اس عالم سے بدرجہا بہتر ہے جس کا شیوہ بادشاہوں اور امیروں کی

خوشامد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علائی کو علماء عصر کے حالات کا بخوبی علم تھا۔ مخدوم الملک تو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ملا جلال دانشمند آگرہ موجود تھا اس نے وہ حدیث بیان کی جس میں امام مہدی کا علیہ موجود مذکور ہے۔ اور لفظ "اجل الجبیہہ" بفتحہ جیم اور بہ تشدید عدم جو جلال سے مشتق ہے اور جلیل کی تفصیل ہے پڑھا۔ شیخ نے نفرت انگیز لہجہ میں کہا کہ تو نے عوام کالانعام میں اپنے آپ کو بہت بڑا عالم مشہور کر رکھا ہے۔ حالانکہ عربی کا ایک فقرہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ حدیث کے نکتوں اور باریکیوں اور اشاروں کو کیا خاک سمجھے گا۔ یہ لفظ "اجل الجبیہہ" جلی کی تفصیل ہے نہ کہ تیرے نام جلال کی۔ بے چارہ ملا ایسا شرمندہ ہوا کہ پھر نہ بولا۔ اسی مجلس میں شیخ مبارک بھی موجود تھا (جس کے دو بیٹے فیضی اور ابوالفضل اکبری دربار کے رتن ہوئے) شیخ علائی کے علم و فضل کا قائل ہو گیا۔ اکبر کے زمانہ میں علماء نے اس کی سخت مخالفت کی تھی بلکہ فتویٰ کفر و قتل بھی صادر کیا تھا اس پر بھی مہدوی ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ علماء دربار تو دم بخود بیٹھے تھے سلیم شاہ حیران تھا کہ شیخ علائی کی نسبت کیا حکم صادر کرے۔ آخر شیخ علائی کو اپنے قریب بلا کر کہا کہ اگر چپکے میرے کان میں عقیدہ مہدویہ سے انکار کرو تو اپنے تمام ملک کا محتسب مقرر کرتا ہوں۔ اور تم ہمیشہ قرآن شریف مجھے سنایا کرو۔ شیخ نے سلیم شاہ کی پیشکش رد کر دی سردست سلیم شاہ نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ شیخ کو احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔ شیخ نے بھی آگرہ ہی میں ڈیرے ڈال دیئے دربار شاہی میں جو کچھ علماء کی گت بن چکی تھی وہ عوام سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ چند روز میں صدہا اشخاص حلقہ مہدویہ میں

شامل ہو گئے۔ مخبر سلیم شاہ کو روزانہ خبر دیتے کہ آج فلاں امیر اور فلاں سردار شیخ کا مرید ہو گیا۔ اور اس کا حلقہ ارادت روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ملا عبداللہ مخدوم الملک جو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا سلیم شاہ کو شیخ کے قتل پر ترغیب دے رہا تھا۔ مگر سلیم شاہ کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ آخر بصد مشکل خروج کا حکم دیا۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبداللہ مخدوم الملک کا کچھ حال بتایا جائے۔ اسی پر اس زمانہ کے علما کی عام ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ ملا سلیم شاہ کا مقرب اور عہدہ قضا پر فائز تھا۔ جب افغانی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اور اکبر نے مغلیہ سلطنت قائم کی تو یہ ابن الوقت اکبر کے مقربوں میں داخل ہو گیا۔ اکبر نے اسے صوبہ پنجاب کا قاضی القضات مقرر کیا۔ آگرہ پایہ تخت مغلیہ میں صدر الصدور شیخ عبدالنبی امام ابو حنیفہ کی اولاد سے تھا۔ بقول بدایونی اکبر اس کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ آگرہ میں شیخ عبدالنبی اور لاہور میں مخدوم الملک دینی خود مختار بادشاہ تھے۔ جو چاہتے کر گذرتے۔ اکبر پیدائشی سیاسی آدمی تھا۔ اس نے دیکھا کہ دین کے نام پر دنیوی حکومت تو ان ملاؤں کی ہے۔ اور عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ ان کا زور توڑنے کے لیے اسے خوب سوجھی۔ ایک مجلس مذاکرہ علمیہ منعقد کی اور بڑے بڑے جغادری ملاؤں کو دعوت شمولیت دی، بظاہر مقصد یہ تھا کہ تمام اختلافی مسائل پر علما بحث کے بعد متفق ہو جائیں تو وہی شریعت اسلامیہ مملکت میں نافذ کی جائے۔ بدایونی ان مجالس میں موجود ہوتا۔ وہ کہتا ہے

کہ مسئلہ کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی شے کو اگر ایک حرام کہتا تو دوسرا حلال ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا اور دونوں روایات اور فقہا کے اجتہادات کا حوالہ دیتے ہیں بحث کی گرمی میں تو تو میں میں سے لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی۔ اکبر خود مناظرہ میں شامل ہوتا۔ ایک روز کہا کہ اگر کوئی آداب مجلس کا لحاظ نہ کرے گا تو آئندہ اسے مجلس میں شرکت کی اجازت نہ دی جائے گی اور دوران مناظرہ میں کوئی ناشائستہ کلمہ کہا تو نکلوا دیا جائے گا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ میں قریب ہی بیٹھا تھا دبی زبان سے کہا کہ پھر تو سب ہی اس لائق ہیں کہ نکلوائے جائیں۔ اکبر نے سن تو لیا تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور مجھے کہا کہ کیا کہتے ہو میں نے کہا کہ حضور سچ فرماتے ہیں۔ علماء ہی ایسے شستہ زبان ہوں تو عوام سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ غرض علماء نہ صرف دربار اکبری میں ذلیل ہوئے بلکہ لوگوں کی نظروں سے بھی گر گئے۔ ان کے سرغنہ یہی عبدالنبی اور مخدوم الملک تھے۔ دونوں کے نام حکم صادر ہوا کہ مکہ معظمہ جاؤ۔ اور جب تک واپسی کا حکم نہ ہو وہیں رہو۔ لاکھوں روپیہ ان کو دیا اس میں سے وہاں کے مستحقین کے لیے بھی کافی رقم تھی۔ اس کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا۔ یہ کس منہ سے کہتے کہ ہم حج کو نہیں جاتے۔ چاروناچار جانا ہی پڑا۔ اگرچہ روپیہ پیسہ کی کمی نہ تھی۔ ضرورت اکبر اور بھی بھیج دیتا مگر وہ حکومت کا نشہ تھا جو مسند قضا پر سرشار رکھتا۔ جسم تو حرم کعبہ میں تھا مگر دل ہندوستان میں، سن لیا کہ میرزا حکیم نے کابل میں علم بغاوت بلند کیا ہے۔ ایک ملحد بادشاہ کے خلاف ایک دیندار کی حمایت فریضہ مذہبی تھا۔ دونوں چل پڑے۔ بندر گاہ

سورت پر اترے تو دریافت پر یہ خبر ہوئی کہ یہ باسی کہ حکیم کی بناوٹ تو چند روزہ تھی۔ فرو ہو گئی۔ مخدوم الملک تو پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسہال شروع ہو گئے اور جانبر نہ ہو سکا۔ عبدالنبی ذرا سخت جان واقع ہوا تھا۔ آگرہ میں آیا تو اکبر نے قید میں ڈال دیا۔ ٹوڈر مل سے کہا کہ اس سے اس روپیہ کا حساب لو جو اہل حرم مکہ کے لیے دیا گیا تھا۔ ٹوڈر مل نے ایسا شکنجہ میں لیا کہ شیخ نے خیر دنیوی اور سعادت آخروی اسی میں دیکھی کہ اس بلائے بے درماں سے جان بچائے عاقبت میں حساب کتاب سہل تر ہے۔ چند روز کے بعد فوت ہو گیا۔ کسی گھر کے بھیدی نے خبر دی کہ عبداللہ مخدوم الملک کے مکان میں جو چند قبور ہیں ان کی زیارت نفع بخش رہے گی۔ کھولی گئیں تو چاندی اور سونے کی اینٹیں برآمد ہوئیں۔

یہ تھے پچھلی کے علماء انہی کے حالات پر دوسروں کو بھی قیاس کر لو شیخ علائی جیسے زاہد و عابد درویش کا مقابلہ یہ کیا کر سکتے تھے۔ آگرہ سے شہر بدر ہوا تو دکن میں آیا۔ یہاں مہدویہ کا پہلے ہی بڑا زور تھا۔ "بندیہ" میں پہنچا تو حاکم جس کا لقب اعظم ہمایوں شروانی تھا مرید ہو گیا۔ آدھا لشکر چند روز میں حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا۔ ادھر سلیم شاہ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو بہت گھبرایا۔ پھر شیخ کی طلبی کا فرمان صادر ہوا۔ اس وقت علماء وقت کی جو آئی ان کا سرغنہ مخدوم الملک تھا۔ قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ سلیم شاہ سمجھ گیا کہ مخدوم الملک اہل غرض ہے اس لیے حکم دیا کہ شیخ بدھ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے علم و فضل کا شہرہ دور دور تک تھا اور اس

میں کچھ شک نہیں کہ اس پایہ کا عالم اس وقت ہندوستان میں نہ تھا صاحب تصنیف بھی ہے ملک العلماء قاضی شہاب الدین جونپوری کی کتاب الارشاد" پر شرح لکھی، شیر شاہ سوری اتنا معتقد تھا کہ جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ شیخ علائی کو اس کے پاس بھیج دیا۔ غرض یہ تھی کہ پہلے اس کی سن لو پھر جو کچھ مناسب ہو فتویٰ دو۔

اسے اتفاق ناملائم ہی کہنا چاہیئے کہ شیخ علائی مع چند ملازمان شاہی و علماء کرام شیخ بدھ کے دروازہ پر پہنچے تو کسی خوشی کی تقریب پر گھر کے اندر سے گانے بجانے کی سریلی رسیلی آوازیں آرہی تھیں۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ کچھ ایسی رسمیں بھی ادا ہو رہی تھیں جو شرعاً ممنوع ہیں اور مسلمانوں نے ہندوؤں سے اختلاط کی وجہ سے سیکھیں، شیخ علائی کا سیماب جوش انتہائی درجہ پر پہنچ گیا۔ شیخ بدھ اس وقت بہت ضعیف العمر تھا بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ اور اسی نسبت سے شنوائی بھی کمزور تھی۔ شیخ علائی نے جوش میں آکر کہا کہ آپکے علم وفضل کا شہرہ تو بہت سنا تھا مگر عمل آج دیکھا شیخ کے بیٹوں نے جواب دیا کہ ہندوستان میں ایسی رسمیں رائج ہیں کہ اگر ان سے منع کیا جائے تو ناقص العقل عورتیں خیال کرتی ہیں جان یا مال کا ضرور نقصان ہو گا۔ اور اگر اتفاقاً ایسی صورت ہو جائے تو کہتی ہیں کہ اسی رسم کے نہ ادا کرنے کا وبال ہے۔ اس عقیدہ کی وجہ سے بالکل کافر ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ کافر ہونے سے ان کا فاسق رہنا ہی غنیمت ہے۔ شیخ علائی نے جواب دیا کہ عذر گناہ بدتر از گناہ، جب شروع سے یہ اعتقاد ہے کہ ایک گناہ ترک کرنے سے نقصان

جان و مال ہوتا ہے اور اتباع سنت نبوی سے آدمی کی موت کا بھی خطرہ ہے تو ایسے عقیدہ کا مالک شروع سے ہی کافر ہے۔ اس کے اسلام کا لحاظ کیا ضرور ہے۔ بلکہ صحت نکاح میں بھی کلام ہے۔ اور جب ایسے عالم و فاضل لوگوں کے گھروں کا یہ حال ہے تو معلوم نہیں کہ تمام مسلمانوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

شیخ بدھ طبیب منصف مزاج بزرگ تھے۔ فوراً راگ رنگ بند کرا دیا اور توبہ استغفار کی اور شیخ علائی کی بہت تعریف کی۔ بعد ازاں سلیم شاہ کو ایک خط کہ مسئلہ مہدویت اصول مذہب نہیں ہے اور اس کے انکار و اقرار پر انحصار ایمان نہیں۔ علاوہ ازیں امام مہدی کے علامات میں بڑا اختلاف ہے اس لیے شیخ علائی کے کفر یا فسق کا حکم نہیں دیا جا سکتا، بدقسمتی سے یہ خط سلیم شاہ تک نہیں پہنچا، اس کی جگہ ایک اور خط ملا جس میں مرقوم تھا کہ آج ملا عبداللہ مخدوم الملک کا علم و فضل میں نظیر نہیں۔ وہ جو بھی فتویٰ دے صحیح ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب ردو بدل ملا صاحب ہی کی کرتوت تھی۔ شیخ علائی سلیم شاہ کے سامنے آیا تو اس نے کہا کہ میں امام بحث کے لیے کہتا ہوں کہ عقیدہ مہدویت سے توبہ کرو، شیخ نے انکار کیا۔ اس پر سزائے تازیانہ تجویز ہوئی۔ شیخ علائی نحیف الجثہ تھا۔ ان دنوں طاعون کی وبا بھی عام تھی، شیخ کی گردن پر بھی ایک دانہ نکلا ہوا تھا۔ تیسرے درے پر جان بحق تسلیم کی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، نعش ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر تشہیر کی گئی تجہیز و تکفین کی ممانعت کی گئی مگر اسے اتفاق کہو یا شیخ کی کرامت کہ اس وقت اس زور کی

آندھی آئی کہ جہاں روشن تیرہ و تار ہو گیا۔ ہر ایک شخص جو اس بابت کہہ رہا تھا کہ اب سلیم شاہ کی دولت کو زوال آیا۔ اس کے بعد لوگوں نے نعش پر اس قدر پھول برسائے کہ پھولوں کے نیچے دب گئی۔ عبدالقادر بدایونی جو ان واقعات کو قلم بند کر رہا ہے لکھتا ہے کہ میں اس وقت بارہ سال کا لڑکا تھا

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا کہ اس بات کا بھی ذکر کیا جائے کہ سید محمد ر ۲ جونپوری خاندان چشتیہ سے منسلک تھے اور آپ کے متبعین کو بھی اسی خاندان سے لگاؤ تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سماع اور قوالی مزامیر کے ساتھ چشتیوں میں عام رائج ہے اس فرقہ جہدویہ کو اس سے انکار کی وجہ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے اور یہ تاریخی واقعہ بھی کہ خواجہ معین الدین اجمیری ہندوستان میں بحیثیت مبلغ اسلام وارد ہوئے تھے۔ اور اجمیر میں جو کفر گڑھ تھا اور پرتھوی راج کی مملکت میں شامل تھا ایک تبلیغی مرکز قائم کیا۔ اپنے فارغ التحصیل مریدوں کو مختلف مقامات کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجتے رہے۔ چنانچہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا تبلیغی حلقہ اثر دہلی تھا۔ اس وقت تک چشتیہ میں سماع نہیں پایا جاتا۔ خواجہ قطب الدین اجمیری کے خلیفہ بھی تھے۔ اس وقت اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور شمس الدین التمش دہلی میں حکمراں تھا۔ اور خواجہ قطب کا مرید بھی تھا۔ خواجہ قطب نے دیکھا کہ ہندو بہت کم تعداد میں آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں عبادت بھی راگ ہی

میں ادا ہوتی ہے اور ہندو موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ اگر مجلس وعظ میں اس کی بھی چاشنی ہو تو اثر خاطر خواہ ہوگا۔ خواجہ قطب الدین نے اس بارہ میں قاضی حمید الدین ناگوری سے فتویٰ طلب کیا اور صورت حالات سے بھی آگاہ کیا۔ قاضی صاحب نے لکھا کہ خوش الحانی بہرحال پسندیدہ ہے مگر راگ رنگ اور وہ بھی مزامیر کے ساتھ محض حظ نفس ہے اور اکثر خرابیوں کا موجب ہے۔ خوش الحانی سے آیات قرآن اور اخلاقی غزلیں اور حمد و نعت میں نظمیں تو مباح ہیں مگر مزامیر ہرگز استعمال نہ کیئے جائیں۔ خواجہ قطب الدین کے خلیفہ باوا فرید الدین شکر گنج اور آپ کے مرید خلیفہ نظام الدین اولیا اور آپ کے مرید امیر خسرو تھے۔ امیر بلند پایہ شاعر تھا اور موسیقی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے "قول" ایجاد کیا جو اب قوالی سے موسوم ہے۔ اور "ستار" بھی اختراع کی۔ لیکن تاریخی واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بہت عرصہ تک مزامیر یعنی موسیقی سازوں طبلہ وغیرہ کا دخل چشتیہ کی محفل سماع میں نہ ہوا۔ اور جو زیادہ پابند شریعت تھے۔ وہ اس سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ انہی بزرگوں میں سید محمد جونپوری اور آپ کے متبعین شیخ علائی وغیرہ تھے اور علماء اسلام تو ہمیشہ اس کے مخالف رہے ہیں۔

ملا عبد اللہ مخدوم الملک کا دل اب بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ مدح شیخ عبد اللہ نیازی کے خلاف سلیم شاہ کو بھڑکایا کہ عقاید مہدویہ کا شائع کرنے والا یہی شخص ہے۔ اس کی بھی طلبی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور ملائیت وہ دنیوی اور دینی حکومتیں ایک دوسرے کی راز دار ہیں۔

یکے وزود باشد و گر پردہ دار، اور ایک کے بغیر دوسرے کا قیام ممکن نہیں۔ اگر دینوی حکومت کبھی آڑے آئے تو اسے جلدی ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ دینی حکومت سے بگاڑ اچھا نہیں۔ نیازی جب باریاب دربار سلطانی ہوا تو حسب معمول "اسلام علیکم" کہا ایک درباری نے گردن دبائی کہ بادشاہ کو سلام اس طرح کیا کرتے ہیں۔ نیازی سخت برافروختہ ہوا آخر پٹھان ہی تھا کہا کہ جو سلام سنت رسول اللہ ہے میں اس کا پابند ہوں۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ سلیم شاہ کے اشارہ پر درباریوں نے زدوکوب شروع کر دی۔ جب تک ہوش بجا رہے، زبان پر ربنا

اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین

سلیم شاہ نے پوچھا کیا کہتا ہے ملا عبداللہ مخدوم الملک نے کہا کہ تجھے اور مجھے کافر کہتا ہے، بادشاہ کا غصہ اور بھڑکا۔ ناکردہ گناہ نیازی زدوکوب کا کب تک متحمل ہوتا۔ بے ہوش ہو گیا سلیم شاہ نے سمجھا کہ مر گیا۔ زندگی نے کچھ دن لگا رکھے تھے لوگ اٹھا کر لے گئے۔ مگر اس کے بعد بیانہ سے ہجرت کی۔

سلیم شاہ ان واقعات کے بعد دو سال زندہ رہا۔ مرا تو برادر زادہ ابراہیم نے حکومت سنبھال لی یہ "اندلی" کے نام سے مشہور ہے۔ خوشامدیوں نے "عدلی" بنا دیا۔ اس کے سپہ سالار ہیموں بقال کو پانی پت کے میدان میں بیرم خاں سپہ سالار مغلیہ افواج نے شکست دی۔ اور اس کے ساتھ سوری خاندان کا چراغ حکومت گل ہو گیا۔

عبداللہ نیازی سرہند میں مقیم ہوا۔ سرہند اصل میں "شیر ہند" ہے یعنی شیروں چیتوں کا جنگل، بگڑ کر سرہند ہوا۔ اکبر سے دو تین دفعہ ملاقات

ہوئی۔ بادشاہ نے کچھ زمین مدد معاش کے لیے دی، انکار کیا مگر خواہ مخواہ فرمان لکھ دیا۔ مجبوراً فرمان لے لیا مگر قبضہ نہ کیا۔ تمام عمر توکل پیشہ رہے۔ نوے سال کی عمر میں ۹۹۳ھ انتقال کیا۔

عبدالقادر بدایونی عہد اکبر شاہی میں اولیاء اللہ کے ذکر میں شیخ برہان الدین کی نسبت لکھا ہے کہ زاہد اور متقی اور متوکل، تعلقات سے آزاد، صاحب استغنا اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔ میاں الہداد یاری والا جو ایک واسطہ سے سید محمد جونپوری کے مرید تھے فیض باطنی حاصل کیا۔ مجاہدہ اور ریاضت ایسی سخت کی کہ ایک ہیبت نورانی نظر آتے تھے، کالپی میں ایک تنگ و تاریک حجرہ میں ذکر و فکر مراقبہ میں مشغول رہتے، پاس انفاس موافق طریقہ مہدویہ ان کا معمول تھا۔ قرآن شریف کی تفسیر بہت اچھی طرح بیان کرتے تھے اگرچہ علوم عربیہ میں سے کچھ نہ پڑھا تھا کشف القلوب آپ کو حاصل تھا۔ ۹۹۷ھ کا ذکر ہے کہ بدایونی اور ایک اور شخص مہر علی سلدوز شیخ کی ملاقات کو گئے۔ مہر علی اگرچہ درویش دوست تھا مگر مردم آزار بھی تھا۔ آج اپنے نوکروں کو سخت زدوکوب کی تھی اور فحش گالیاں بھی دیں۔ جب دونوں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ نے یہ حدیث پڑھی۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔

اور اس کے بعد بہت سے نکات بیان فرمائے، مہر علی سخت نادم ہوا عذر خواہی کی۔ نذر پیش کی مگر قبول نہ ہوئی شیخ ممدوح نے سو برس کی عمر میں ۱۰۰۰ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ہے "دل گفت کہ شیخ اولیا بود"

ایک اور بزرگ شیخ ابو الفتح گجراتی سید محمد جونپوری کے داماد تھے۔ مگر سید کو دیکھا نہ تھا۔ یہ قرابت بعد وفات سید محمد واقع ہوئی صاحب جاہ و جلال و حال و اہل کمال تھے۔ طریقہ مہدویہ پر ثابت قدم تھے۔ آگرہ میں جمنا کے دوسرے کنارے پر شیخ بہاؤ الدین مفتی کے محلہ میں رہائش تھی، اس جگہ بدایونی ملاقات کے لیئے گیا۔ اثنا ملاقات میں یہ حدیث پڑھی۔ لایقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتہم الملائکۃ وغشیتہم الرحمۃ انزلت علیہم السکینۃ وذکرھم اللہ فی من عندہ اس کا ترجمہ بھی بیان فرمایا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے کہ میں نے بھی ذکر شروع کر دیا۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ قرآن شریف کے معانی کا انکشاف مجھ پر ہونے لگا اور مدت تک یہ حال رہا کہ جو آواز میرے کان میں آتی اس کو میں ذکر ہی سمجھتا۔ شیخ کے بعض مرید اپنے لبوں کو سریش لگا کر بند رکھتے اور بعض نے کنکریاں منہ میں ڈال رکھی تھیں۔ کہ بے فائدہ گفتگو نہ کریں۔

فرقہ مہدویہ آج بھی موجود ہے۔ دکن میں اسے فروغ رہا۔ اب پاکستان میں بھی اس کے متبعین ہیں۔ اس فرقہ کے ایک ممتاز شخص سید علی عزت میاں عالم نے چند رسالے اپنے عقاید کی تائید میں لکھے جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئے، قاضی دلاور علی حاکم دارالقضاء حیدرآباد کو مخاطب کر کے کہا کہ جواب لکھو۔ مولوی محمد زماں خاں صاحب شہید جہاں پوری نے جواب میں "ہدیہ مہدویہ" لکھا۔

سہ شنبہ ششم ذالحج ۱۲۹۲ھ کا واقعہ ہے کہ پرنس آف ویلز یعنی ایڈورڈ ہفتم انجہانی ہندوستان میں تشریف فرما تھے۔ مولوی محمد زماں حسب معمول نماز مغرب سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن مجید

میں مشغول تھے کہ ایک نوجوان مسجد میں خنجر بکف داخل ہوا اور چند ضربوں میں مولوی صاحب کا کام تمام کر دیا۔ آیہ کریمہ ؏ فانظر کیف کیف کان عاقبتہ المتقین پر قطرات خون شہادت کا نشان تھا۔ معلوم نہیں کہ متقین کا اشارہ کس طرف ہے۔

تبصرہ

ان اوراق میں ہم نے مہدویت اور مدعیان مہدویت کے حالات بیان کئے ہیں۔ سید محمد جونپوری کے بعد بھی اور کئی ایک مہدی ہوئے اور گذر گئے۔ غالباً اور بھی آئیں گے اور اسی طرح گذر جائیں گے۔ اور ان کے متبعین ایک فرقہ کا اضافہ کرتے رہیں گے۔ ان میں سے بعض مہدی ایسے بھی گذرے ہیں جن سے دعوئ نبوت بھی منسوب کیا جاتا ہے یا انہوں نے خود دعوئ نبوت کیا۔ اور اس قماش کے لوگ تمام عجمی ایرانی نژاد تھے۔ اور ان کا مقصد در اصل مزدکی مذہب کا احیاء تھا۔ رسم آریا میں ہر ایک ممتاز شخصیت دیوتا یا دیوتا کی اولاد اور بھگوان تھا۔ اس لیئے ان مدعیان مہدویت کا دعوئ الوہیت بھی تھا۔

بنو حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ نے گمراہیاں بھی پیدا کیں اور غلط فہمیاں بھی۔ ورنہ اسلام تو صرف تقوے کا قائل ہے، نہ کہ حسب نسب کا۔ کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔

حکیم مزدک ایرانی شہنشاہ قباد کے عہد میں آنحضرتؐ کی ولادت

سے قریباً ایک صدی پیشتر گذرا ہے۔ اس نے "اشتراکیت" کا پرچار کیا۔ ہمارے زمانہ میں تو اشتراکیت کا مطمحِ نظر مساداتِ انسانی و معاشیات یعنی سرمایہ داری کے خلاف جنگ ہے۔ اور رفتہ رفتہ حاکم و محکوم کا امتیاز محو کرتا ہے مگر حکیم مزدک کو ان مسائل پر دینی کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا نظریہ صرف صنفِ ضعیف کی آزادی تک محدود تھا۔ اور اسی کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا ۔ یہ آزادی بھی انوکھی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ایک مکروہ صورت یا بوڑھا ایک قبول صورت نوجوان عورت کو بیاہ لاتا ہے۔ دونوں کا جوڑ ناموزوں ہے۔ مناسب ہے کہ مکروہ صورت مرد اپنی خوب صورت عورت کو کچھ عرصہ کے لیے یا وقتاً فوقتاً کسی خوش گل نوجوان کے پاس بھیج دے۔ یہ نظریہ ہمارے ہندوستان کے "نیوگ" سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ہندوستان کے "کام مارگ" کو رائج کیا جس میں کچھ تمیز ماں بہن کی نہیں رہتی۔ شہنشاہ قباد نے مزدکی مذہب قبول کیا اور یہ راج دھرم ہو گیا۔ قباد کے بعد اس کا بیٹا نوشیرواں تختِ نشین ہوا تو حکیم بزرجمہر کے صلاح و مشورے سے مزدک کو قتل کیا۔ اور اس مذہب کی بیخ کنی کے درپے ہوا۔ مزدک کی بیوہ کا نام "خرما" تھا۔ چونکہ عورت ذات تھی اور عورتوں کی آزادی کا مسئلہ اس سے بہتر مرد حل نہیں کر سکتا تھا اس لیے فرقہ مزدکیہ کا رجوع اسی کی طرف ہوا۔ یہ مذہب "خرمیہ" کہلایا۔ اسی مذہب کے پیرو ابو مسلم خراسانی اور بابک خرمی اور حکیم مقنع وغیرہ تھے۔ ابو مسلم بنو عباس کا داعی تھا۔ اور بنو فاطمہ کے داعیان قرامطہ اور حسن بن صباح کے فدائی وغیرہ بہت تھے۔ سید امیر علی اپنی ہسٹری آف ساراسین میں لکھتے ہیں کہ بنو فاطمہ

فرقۂ باطنیہ کے بانی ہیں اور داعیان بنو فاطمہ نے زرتشتی اور مانوی اور مزدکی عقاید کو مسلمانوں میں شائع کیا۔ اور قرآن کے ظاہر الفاظ کے معنی اپنے عقاید کے مناسب جو کچھ سمجھتے بیان کرتے اس کی تاویل یہ کرتے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور دوسرا باطن اور باطن اصل شے ہے۔

اس حد تک تو ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ بنو امیہ ہوں یا بنو عباس یا بنو فاطمہ ان میں سے کسی نے دعویٰ نبوت والوہیت نہیں کیا۔ صرف ایک خلیفہ ابوعلی منصور الحاکم فاطمی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے فرعون کی طرح دعویٰ الوہیت کیا۔ ۳۸۲ھ / ۹۹۶ء میں مصر کے تخت پر باپ کی وفات کے بعد متمکن ہوا۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اس کی عادت تھی کہ رات کے وقت "المعلم" کی پہاڑی کی طرف نکل جاتا۔ یا تو اختر شماری کرتا یا خلوت میں عبادت، ایک رات حسب معمول دو آدمیوں کے ساتھ گیا۔ مگر پھر واپس نہ آیا۔ تلاش کی گئی۔ پہاڑی کے قریب ہی ایک چشمہ پر اس کی سواری کے گدھے کے چاروں پاؤں کٹے ہوئے ملے اور چشمہ میں حاکم کا لبادہ جس پر خنجر کے نشان تھے ملا۔ لاش باوجود تلاش نہ ملی۔ اس سے ایک مذہب منسوب ہے جو لبنان میں "الدروزیہ یا دروزی" سے موسوم ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ الحاکم زندہ ہے اور دوبارہ آئے گا۔ الحاکم کے بعد چند بے حقیقت خلفا فاطمہ ہوئے جن کی حکومت مصر کے محدود رقبہ میں تھی۔ اور آخر اس خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔

ہم اس موضوع پر کافی بحث کر چکے ہیں کہ ابتدا میں صرف ایسی ہی پیش گوئیاں شائع ہوتی رہیں کہ ایک شخص کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے

یہ یا تو بنو فاطمہ سے ہو گا یا سلمان فارسی کا کوئی ہمقدم۔ عرب اور اہل
عرب میں تو یہ تحریک کچھ عرصہ زوروں پر رہی جب ان پیش گوئیوں کے
مخترعین کا مقصد حاصل ہو گیا تو یہ بھی ختم ہو گئی۔ مگر ایرانی اور اہل
ایران کا مقصد حاصل نہ ہوا اس لیے وہاں اس کا زور بدستور رہا۔
اور ہمارے زمانہ میں بہاء اللہ نے اس کا فائدہ خاطر خواہ اٹھایا۔
اور دعوئے نبوت و رسالت و الوہیت بھی کیا۔

اگر ہم ان مدعیان مہدویت کی سیاسی اغراض کو نظر انداز کر دیں
جس کے ساتھ مہدویت کی تحریک وابستہ ہے تو ہم بلا خوف تردید
کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک مومن مسلمان "مہدی" ہے۔ ہم روزانہ نمازوں میں
دعا مانگتے ہیں کہ "اھدنا الصراط المستقیم" بار خدایا ہماری رہنمائی صراط
مستقیم پر فرما۔ یعنی ہم بالاستقلال اسی روش پر قائم رہتے ہوئے
سفر زندگی ختم کریں جو فطرۃً پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالےٰ کے اسماء حسنےٰ
میں سے ایک ہادی بھی ہے۔ لہذا آنحضرتؐ بھی بالتبع ہادی ہیں۔ وانک
لتدعوھم الی صراط مستقیم (۲۳)، انک لتھدی الی صراط مستقیم (۲۵)،
"مہدی" تو ہر ایک ہدایت یافتہ مومن مسلمان ہے۔ جو سیدھے راستے
پر ہو اور اس پر آنحضرتؐ بذریعہ قرآن رہنمائی فرما رہے ہیں۔ ہر
ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ اسی روش پر چل رہا ہے۔ جسے اسلام
سے موسوم کیا گیا ہے۔ لہذا اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ مسلمان
ہی نہیں۔

ہم واضح کر چکے ہیں "مہدی موعود" کا تخیل جب مسلمانوں میں پختہ ہو
گیا تو یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض اشخاص کو اس کا پختہ یقین تھا کہ وہ

مہدی موعود ہیں۔ سید محمد جونپوری کے بارہ میں تو ہم شواہد کی بنا پر بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے دعویٰ مہدویت اسی یقین کے ساتھ کیا تھا۔ "الاعمال بالنیات" نیتوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن نیتوں کا حال اعمال سے معلوم ہوتا ہے۔ سید کو ہوس دنیوی حکومت و جاہ و جلال نہ تھی۔ وہ درویش تھا اور آخر عمر تک درویش رہا۔ سلاطین اس کے مرید تھے۔ وہ دنیوی مال و دولت جتنی چاہتا جمع کر سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی پسند نہ کیا کہ اپنے مریدوں کی حدود مملکت میں مستقل رہائش رکھے۔ اس کے زہد و تقویٰ کا کیا مذکور ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی سا کٹر ملا بھی اس کے متبعین کی ولایت کا قائل ہے۔ جس شخص نے ایسے زاہد و عابد و ولی اللہ پیدا کیے اگر وہ اپنے دعویٰ میں غلطی خوردہ بھی تھا پھر بھی یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ علماء اسلام کفر کا فتویٰ صادر کریں، بلکہ مخدوم الملک کی طرح واجب القتل ٹھہرائیں۔ ہمیں اس زمانہ کے فاضل اجل شیخ بدھ سے کامل اتفاق ہے اور آج علماء اسلام کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ منکر مہدویت سرے سے حیز و دین ہی نہیں سید محمد کے سخت مخالفین بھی اس کے علم و فضل اور زہد و ورع اور اتباع شریعت اسلامیہ کے معترف تھے۔ پھر یہ خود ساختہ عقائد ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک نکمی بات پر کسی مومن مسلمان کو کافر اور واجب القتل قرار دیا جائے۔

پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم تھی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اول و آخر حکمران تھا۔ سید احمدؒ بریلوی نے سکھ حکومت کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ اور لڑے۔ آپ کے رفیق مولوی محمد اسماعیلؒ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

کے خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ سید اور اس کے رفقا مجاہدین نے آخر ایک لڑائی میں شکست کھائی اور مولوی محمد اسماعیل شہید کی لاش تو ملی مگر سید کی نہ ملی۔ آپ کے متبعین اب بھی سرحد میں موجود ہیں۔ ان کو مخالفین "وہابی" کہتے ہیں۔ اور یہ تحریک ایک وقت اتنی زور پر تھی کہ گورنمنٹ انگلشیہ نے اسے خلاف قانون جرم قرار دیا۔ کئی علماء پھانسی پا گئے۔ اور کئی حبس دوام کی سزا کے متوجب سمجھے گئے۔ سر سید احمد غفرلہ نے گورنمنٹ کی غلطی رفع کی۔ سید احمد بریلوی کے متبعین کا عقیدہ ہے کہ آپ ہی مہدی موعود ہیں اور فوت نہیں ہوئے، روپوش ہیں اور دوبارہ تشریف لائیں گے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سید احمد بریلوی سختی سے شریعت کے پابند تھے اور یہ کہ غیرت دینی نے آپ کو آمادہ جہاد کیا۔ ایسے مومن جو صحیح معنی میں مومن ہیں۔ اگر دعویٰ مہدویت بھی کریں تو گو ہم انہیں تسلیم نہ کریں لیکن جہاں تک تبلیغ و اشاعت اسلام سلف صالحین اور سنت رسولؐ اللہ کے مطابق ہے ہمیں اس کی نہ صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ حتی الوسع موافقت کرنی چاہیے۔ یہ تو میری ذاتی رائے ہے کہ علماء اسلام کا شیوہ کافرگری نہایت مذموم ہے۔ کسی اچھے بھلے مسلمان کو دائرہ اسلام سے کسی فرعی بلکہ خود ساختہ عقیدہ پر خارج کرنا نامناسب بات ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص دعویٰ نبوت یا الوہیت کرے تو وہ ہمارے نظام اسلامی سے خود بخود خارج ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص سے ہمارا کچھ سروکار نہیں۔ لیکن سید محمد جونپوری اور سید احمد بریلوی سے بزرگ اس فتویٰ کی زد میں نہیں آتے۔

ایک عرض بغرض ہم ان حضرات کے گوش گذار کرنا چاہتے ہیں

جو فرقہ بندی اور شرانگیز فرقہ تفرقہ میں نادانستہ یا دانستہ مبتلا ہیں کہ وہ خود عقاید سے علیحدہ ہو کر غور کریں کہ آیا وہ "لا تفرقوا" پر عامل ہیں؟ اور جب نص قرآنی سے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ ہمارا نام صرف "مسلم" ہی اللہ تعالےٰ نے مقرر فرما دیا ہے (ھو سمٰکم المسلمین) اور یہ کہ ہم مسلمان صرف "اللہ" اور "دین اللہ" سے وابستہ ہیں۔ تو کیا بشری شخصیت سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا شرک کی حد تک نہیں پہنچتا؟ اور بشری ناموں کی پوجا نہیں! ارشاد قرآن ہے کہ

اذ قال اللہ یا عیسی ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی و امی الٰھین من دون اللہ ﴿

جب اللہ نے پوچھا کہ اے عیسے! مریم کے بیٹے کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو الوہیت کا درجہ دے کر اللہ کے سوا پوجیں تو اس نے عرض کی کہ سبحان مجھے اتنا حوصلہ کب تھا کہ حق کے سوا کچھ اور کہتا۔ اگر میں نے کوئی ایسا ناواجب کلمہ کہا ہوتا تو جانتا ہی ہے کہ

اپنی زبان سے میں نے کبھی ایسا نہیں کہا اور نہ ہی میرے دل میں اس کی تمنا تھی کہ لوگ مجھے پوجیں اور میں اغماض کروں ۔۔۔ جب تک میں ان میں رہا وہ بھی (میرے حواری) تیرے سوا کسی اور کی بندگی نہیں کرتے تھے اور میں ان کا نگران حال رہا، جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کے عقاید اور اعمال سے بہتر واقف ہے، اگر تو انہیں عذاب دے تو تیرے بندے ہیں، بخش دے تو تیرا اختیار ہے اور تو زبردست حکمت والا ہے۔ انجیل میں خود مسیحؑ کی شہادت انہی آیات کی تائید میں

ہے کہ واقعہ صلیب سے پیشتر اپنے اپنے بعد فارقلیط (احمدؐ) کی بعثت کی بشارت (انجیل) اپنے حواریوں کو دیتے ہوئے دعا کی کہ

"دیا اللہ! اب میں اس دنیا میں نہیں ہوں، لیکن یہ میرے متبعین موجود ہیں اور میں تیرے حضور آرہا ہوں مقدس باپ ان کو اپنے ہی نام سے وابستہ رہنے دے جن کو تو نے میرے اتباع کے لیے دیا"

"جب تک میں ان میں تھا ان کو تیرے ہی نام سے وابستہ رکھا جن کو تو نے مجھے دیا۔ میں ان کا نگران حال تھا۔ اور ان میں سے ایک بھی گمراہ نہیں ہوا مگر فرزند لعنت ہلاکت تاکہ نوشتہ (زبور $\frac{109}{8}$) پورا ہو۔ (مقدس یوحنا $\frac{17}{12}$)

فاضل ریناں کی تحقیق کا حوالہ ہم دے چکے ہیں کہ حواری اپنے آپ کو مومنین اور اخوان ہی کہتے اور مسیحؑ بھی ان کو اپنا دوست ہی کہتے ہیں، (جو کچھ میں نے تمہیں تعلیم دی اگر تم اس پر عمل کروگے تو میرے دوست ہوا (مقدس یوحنا $\frac{15}{14}$) جیسے آنحضرتؐ کے متبعین کو "اصحاب" کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا زیادہ حق تھا کہ ہمارا نام محمدی یا احمدی تجویز فرماتے۔ ایسے ناموں سے ہمیں نامسلمان مخاطب کرتے ہیں ہمیں "محمڈن" اور اسلام کو "محمڈن ازم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انجیل کی بعض آیات سے مسیحؑ کی "آمد ثانی" بعد واقعہ صلیب کا ثبوت ملتا ہے مگر اس آمد ثانی کا مفہوم آپ نے واشگاف لفظوں میں خود ہی واضح فرما دیا تھا کہ "یہ نسل یعنی آپ کے معاصرین میں سے اکثر موت کے ذائقہ شناس نہ ہوں گے جب

تک ابن آدم (مسیح) کو دوبارہ آتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے (مقدس متی ۱۶/۲۱-۲۸) یہ ارشاد مسیح تواتر سے ثابت شدہ ہے۔ چنانچہ مقدس مرقس (۹/۱) اور مقدس لوقا (۹/۲۷) بھی اپنے لفظوں میں بھی کچھ روایت کرتے ہیں۔

حواریان مسیح اس ارشاد کا مطلب نہ سمجھے اور بقول مقدس یوحنا وہ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے کہ "یہ کیا کہتا ہے کہ تم تھوڑی دیر کے بعد مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھو گے" (مقدس یوحنا ۱۶/۱۶) حواریوں میں سے بعض نے آپ کو صلیب پر آویزاں دیکھا اور یقین کر لیا کہ مارے گئے۔ لیکن آپ صلیب پر فوت نہ ہوئے۔ اور ایک دو گھنٹوں میں کوئی فوت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کے ساتھ ایک یا دو چوروں کو بھی صلیب دیا گیا تھا۔ چونکہ "سبت" شروع ہونے والا تھا اور حسب الحکم توراۃ سبت کے روز کوئی مجرم صلیب پر نہیں رہ سکتا تھا اس لیے چوروں اور آپ کو صلیب سے اتارا گیا۔ چور تو زندہ تھے اس لیے انہیں ہڈیاں توڑ کر قتل کیا گیا اور آپ کو دیکھا کہ مر چکے ہیں۔ اس لیے آپ کو نہ چھیڑا گیا۔ سبت کے روز تجہیز و تکفین کی رسوم بھی ادا نہ ہو سکتی تھیں اس لیے آپ کے جسم کو ایک چادر میں لپیٹ کر ایک قبر کے لحد میں جو یوسف آرمتیانے اپنے لیے تیار کی تھی رکھ دیا کہ سبت کے بعد رسوم ادا کی جائے گی مگر جب سبت کے بعد قبر پر آئے تو اسے خالی پایا۔

اس واقعہ کے بعد مسیح حواریوں سے ملے تو انہوں نے خیال کیا کہ ہم "روح" کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب آپ نے اپنا زخم جو دکھا

سپاہی کے بھالے سے لگا تھا جب آپ صلیب پر تھے دکھایا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر روٹی اور مچھلی کھائی تو وہ آپ کی پیش گوئی دوبارہ آمد ثانی کا مطلب سمجھ گئے (مقدس متی ۲۸/۸ مقدس مرقس ۱۶/۱ مقدس لوقا ۲۴/۹، ۲۶/۴۴ مقدس یوحنا باب ۲۰) آپ نے حواریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میری وہ باتیں جو میں نے تم سے اس وقت کہی تھیں جو تمہارے ساتھ تھا کہ ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توراۃ اور صحف انبیاء اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں۔ اس نے ان کا ذہن کھولا کہ صحیفوں کو سمجھیں اور ان سے کہا کہ یوں لکھا ہے کہ مسیح دکھ اٹھائے گا۔ اور تیسرے دن مردوں میں سے جی اٹھے گا۔"

اس وقت آپ کا ایک حواری "توما" موجود نہ تھا۔ حواریوں نے اسے کہا کہ ہم ربی (یہودی امام کو ربی کہتے ہیں) سے ملے ہیں تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں گا اور پسلی کے زخم کو چھو کر اطمینان نہ کر لوں گا ہرگز یقین نہیں کر سکتا۔ مسیح کو حواریوں نے بھی اطلاع دی کہ توما ایسا اور ایسا کہتا ہے آپ اس سے بھی ملے اور کہا "توما اچھی طرح مجھے دیکھ لے اور میری پسلی کے زخم کا بھی معائنہ کر لے" توما نے کہا کہ ربی معاف فرما میں ایمان لایا۔ آپ نے کہا کہ "توما تو تو مجھے دیکھ کر ایمان لایا۔ مبارک ہے وہ قوم (اہل اسلام) جو بن دیکھے ایمان لائیں گے کہ میں مصلوب اور مقتول نہیں ہوا۔ (مقدس یوحنا ۲۰/۲۹) یہ ہے مفہوم آیہ "وان من اهل الکتب الا لیؤمنن به قبل موته"۔

ہم نے یہ واقعہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ مسیح کی

آمد ثانی کا مفہوم واضح تر ہو جائے۔ یہی آمد ثانی تھی جس کو آپ کے معاصرین نے بچشم خود مشاہدہ کر لیا۔ سیمی یوحنا کی طرح یقین کرتے ہیں کہ مسیح صلیب پر فوت ہوا۔ تو ان کو موتا کی طرح ایمان لانا چاہیئے کہ آپ مردوں میں مردہ سمجھ کر رکھے گئے مگر فوت نہ ہوئے تھے اور اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ آپ "دوبارہ" حواریوں سے ملے اور ان میں چالیس دن رہے اور کھاتے پیتے رہے۔ یہی "آمد ثانی" ہے جو ہو چکی اب آمد ثالث کا انتظار بے فائدہ ہے۔

ارشاد قرآن حکیم ہے کہ:۔

وما محمد الا رسول	اور محمد ایک معزز رسول ہے، تحقیق اس
قد خلت من قبلہ	سے پہلے بھی رسول تھے (جو فوت ہو چکے
الرسل افان مات	ہیں) اگر یہ طبعی موت سے مرجائے (جو
او قتل انقلبتم علی اعقابکم	یقینی امر ہے) یا مارا جائے (جس کا امکان
ومن ینقلب علی عقبیہ	ہے) تو کیا تم الٹے پاؤں (اسلام سے)
فلن یضر اللہ شیئا	پھر جاؤ گے، اور جو بھی پھرے گا تو وہ (دین)
وسیجزی اللہ الشاکرین	اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا (خود ہی
	گھاٹے میں رہے گا) اور جو شکر گذار بندے
۳/۶	ہیں اللہ جلدی ہی ان کو جزاء خیر دے گا۔

یہ وہ آیات ہیں جو صدیق اکبرؓ نے آنحضرتؐ کی وفات پر اصحاب رسول اللہ کو مخاطب کر کے پڑھیں اور کہا کہ اگر تم محمدؐ کے پرستار ہو تو دیکھ لو کہ وہ فوت ہو گئے ہیں اور اگر تم اللہ کو پوجتے ہو۔ تو وہ حی القیوم ہے۔

عارف رومیؒ لکھتا ہے کہ

عشق بر مردہ نباشد پائیدار	مرنے والوں سے عشق پائیدار نہیں ہوتا
عشق را بر حی و بر قیوم دار	عشق اس سے لگاؤ جو حی القیوم ہے
زانکہ عشق مردگان پائندہ نیست	اسلئے کہ مرنے والوں سے عشق دیرپا نہیں ہوتا
زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست	اور اسلئے کہ مرنیوالے ہماری طرف دوبارہ نہیں آتے
عشق آں زندہ گزیں کو باقی است	عشق کیلئے اسکو منتخب کرو جو باقی رہنے والا ہے
وز شراب جانفزایت ساقی است	اور جانفزا شراب پلانیوالا ساقی ہے۔

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است	اللہ تعالٰے کا عشق احسن ہے اس کے سوا
گر شکر خوردن بود جان کندن است	کسی اور کا عشق اگر شکر کی طرح میٹھا ہو تو بھی جان کی موت ہے۔

نیز ارشاد قرآن ہے کہ

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطن (الایہ ۵۳:۲۳)	بات یہ ہے کہ یہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے رکھ لیے ہیں اس کی کوئی دلیل اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی۔ یہ تو صرف ظن کی اور اس چیز کی پیروی کرتے ہیں جس کی خواہش ان کا نفس کرتا ہے۔

جب ہم کسی بشری شخصیت سے وابستہ ہو کر اس کی موت کے بعد اسے زندہ یقین کرتے ہیں اور اس کی آمد ثانی کے منتظر رہتے ہیں۔ یا کم از کم اس کے نام ہی کو زندہ کہتے ہوئے اس سے وابستہ ہو جاتے

ہیں تو ہم نادانستہ اسے الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انبیاء و مرسل اور اولیاء اللہ مقدس ہستیاں تھیں اور ہیں لیکن واجب احترام سے تجاوز کرنا انتہائی مذموم ہے۔

ارشاد قرآن ہے کہ

وما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتب والحکم و النبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتب وبما کنتم تدرسون ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبیین اربابا ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون (۳/۱۶)	کسی آدمی کے لائق نہیں کہ اللہ تو دے علم و کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے تو وہ لوگوں کو کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ لیکن وہ کہے گا تو یہی کہ اللہ والے ہو جاؤ اور یہی کچھ تم کتاب میں پڑھتے ہو اور یہی درس توحید دیتے ہو، وہ یہ حکم نہیں کرے گا کہ ملائکہ اور نبیوں کو ارباب بناؤ۔ کیا بعد اس کے تم اسلام قبول کر چکے ہو تمہیں کفر کا حکم دے گا؟

لیکن یہ عقیدت ہی کا کرشمہ ہے کہ انبیاء و رسل اور اولیاء اللہ نے تو بشری ناموں سے وابستگی سے منع کیا مگر متبعین نے اپنے آپ کو وابستہ ہی کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناموں سے اپنے لیے ایک خاص امتیاز پیدا کر لیا۔ اور ایک دوسرے کو کافر کہنے لگا۔ انبیاء اور اولیاء تو اس لیے آئے کہ لوگوں کو محبوب حقیقی کا عاشق بنائیں مگر لوگ انہی کو مقصود بالذات سمجھ کر اٹھتے بیٹھتے اور ہر حالت میں انہی کے ذکر و خیر میں لگ گئے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دجال اور یاجوج و ماجوج کے بارہ میں بھی کچھ مختصر باتیں لکھی جائیں کیونکہ ان کے حالات کے بغیر مہدویت کی تاریخ مکمل نہیں ہوئی۔ مہدویت کا ظہور قرب قیامت کے آثار میں سے ہے اور اسی طرح دجال اور یاجوج و ماجوج کا خروج بھی اسی نہج کا ہے۔

دجال

عام عقیدہ نصاریٰ اور اہل اسلام کا ہے کہ کسی زمانہ میں "دجال" آئے گا اور تمام کرہ ارض پر پھر جائے گا۔ وہ غیر معمولی قوت کا مالک ہو گا۔ اس کے ساتھ جنت کی نعمتیں اور عذاب دوزخ ہو گا۔ اپنے متبعین کو نعمتوں سے بہرہ ور کرے گا۔ اور منکرین کو عذاب دے گا۔ چالیس دن کا دور دورہ رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کی مدت کے برابر ہو گا۔ "دجال" کا قصہ طویل ہے اور اس سے ہر ایک شخص کم و بیش واقف ہے "دجال" کو حضرت عیسےٰ نازل ہو کر مہدی کی معیت میں قتل کریں گے۔ اس کے بعد یاجوج و ماجوج کا خروج ہو گا۔ آثار قیامت میں سے مسیح کا نزول مہدی کا ظہور، دجال کی حکومت اور یاجوج و ماجوج کا خروج ہے۔

میری ذاتی تحقیق یہ ہے کہ ان روایات میں جو بطور پیش گوئی بیان کی گئی ہیں صداقت ضرور ہے۔ مقدس یوحنا حواری اپنے مکتوب دوم میں لکھتے ہیں کہ "ہم میں جو یہ روایت مشہور ہے کہ دجال آئے گا وہی ہے جو یسوع مسیح (حضرت عیسےٰ) کو بشر تسلیم نہیں کرتا"۔ فاضل

رینان فرانسیسی ادیب و مورخ "پولوس" کے حالات میں لکھتا ہے کہ مقدس یوحنا کا اشارہ پولوس کی طرف ہے جس نے مسیحؑ کو الوہیت کا درجہ دیا۔

فاضل رینان نے "تاریخ کلیسائے مسیحی" لکھی ہے۔ اور اسی کے ضمن میں حواریان مسیحؑ اور پولوس کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے ملخص حسب ذیل ہے۔

"یہ شخصیت جس کا یہودی نام "ساؤل" اور رومی نام "پال" ہے معلوم نہیں اس کی اصل قومیت کیا تھی۔ اعمال الرسل (باب ۲۲) میں مذکور ہے کہ پولوس یہودیوں کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کر رہا تھا مجمع سخت مشتعل ہو گیا رومی سپاہی اور صوبہ دار نے امن قائم کیا۔ پولوس کو پکڑ کر قلعہ میں لے گئے تو قلعہ کے سردار نے اسے کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ پولوس نے صوبہ دار سے جو پاس کھڑا تھا یونانی میں کہا کہ کیا تیرے واسطے زیبا ہے کہ ایک رومی کو کوڑوں سے پٹوائے۔ صوبہ دار نے سردار سے کہا کہ یہ تو رومی ہے۔ سردار نے پولوس سے دریافت کیا جب جواب اثبات میں دیا تو سردار نے کہا کہ میں نے تو بہت نقد دے کر رومی شہری حقوق حاصل کیے ہیں، پولوس نے کہا میں تو پیدائشی رومی ہوں، اپنے ایک مکتوب (۲۔ رومیوں ۱۱/۱) میں لکھتا ہے کہ میں ابراہیم کی نسل سے بنی اسرائیل قوم سے قبیلہ بنیمین سے ہوں"

ایک اور مکتوب (۱۔ کرنتیوں ۹/۱۹) میں لکھتا ہے کہ "میں نے باوجود اس کے کہ سب سے آزاد ہوں اپنے آپ کو سب کا غلام بنایا تاکہ

میں بہتوں کو کھینچ لاؤں، میں یہودیوں میں یہودی تھا تاکہ میں یہودیوں کو کھینچ لاؤں، شریعت والوں میں شریعت والا تھا تاکہ شریعت والوں کو کھینچ لاؤں، اور بے شریعت لوگوں میں بے شریعت تاکہ بے شریعت کو کھینچ لاؤں کمزوروں میں کمزور سے تھا تاکہ کمزوروں کو کھینچ لاؤں، میں سب آدمیوں میں سب کچھ بنا تاکہ ہر ایک طرح سے سب کو کھینچ لاؤں جو شخص ہر ایک سوانگ بھرتا جاتا ہے اس کی نسبت کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے،

اتنا تو یہ وثوق کیا جا سکتا ہے کہ اس نے نہ تو حضرت مسیحؑ کو دیکھا تھا اور نہ حواریان مسیحؑ کی صحبت میں رہا۔ اس کا اپنی دعوے ضرور ہے کہ میں نے مسیح کو خواب میں دیکھا اور اس نے مجھے بحیثیت رسول غیر بنی اسرائیل میں تبلیغ کے لیے مامور کیا۔ حواریان مسیحؑ غیر بنی اسرائیل میں تبلیغ جائز نہیں سمجھتے تھے یہود اور حواریان مسیح کو یہ بھی شکایت تھی کہ پولوس یہ بھی کہتا کہ موسوی شریعت منسوخ ہو چکی ہے، ایمان نجات کافی ہے۔ اور یہ ایمان مسیحؑ پر لانا چاہیئے اور بس، اعمال جیسا کہ شریعت موسوی میں مذکور ہیں ان کی پابندی ضروری نہیں، ختنہ جو بنی اسرائیل کا قومی نشان ہے بے فائدہ ہے۔ دل کا ختنہ چاہیئے۔ یہ تمام باتیں اعمال الرسل ۲۱/۱۳ اور اس کے اپنے مکتوبات اہل قرنیتوں وغیرہ میں بہت مفصل مذکور ہیں۔

پولوس کا ابتدائی زمانہ متبعین مسیحؑ کی انتہائی مخالفت میں گذرا۔ لیکن یک لخت اس پر تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ میں دمشق کی طرف سوار آرہا تھا کہ راستہ میں ایک نور چمکا اور میں بیہوش

ہو کر گھوڑے سے گرا۔ اس نور سے میں نے ایک آواز سنی کہ ساؤل ساؤل
تو مجھے کیوں ستاتا ہے، میں نے پوچھا خداوند تو کون ہے تو جواب
ملا کہ میں مسیحؑ ہوں۔ اب اس نے یہ مشہور کیا کہ وہ دشمن تھا اب زمرۂ
دوست بلکہ خود مسیحؑ کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہوں۔ حواریان مسیحؑ
اس کے چکمے میں آ گئے اور یہ بھی سمجھ گیا کہ ان پر جادو نہیں چل سکتا
دور دور ہی رہنے لگا۔ مگر اپنا کام جاری رکھا۔ اس نے اپنے تبلیغ
میں ایک اور انجیل پیش کی جو اس کے مکتوبات میں مذکور ہے۔ اور
یہ بھی کہا کہ جو اس انجیل کے سوا کسی اور انجیل کو مانے گا مردود ازلی ہے۔

ایسے عقائد دربارہ شریعت موسوی جس کے تابع خود مسیحؑ اور
حواری تھے ایسے نہ تھے حواریوں اور اس میں اتفاق کی کوئی صورت
ہوئی۔ وہ اپنے مکتوبات میں حواریان مسیحؑ کو ریاکاروں کی جماعت کہتا
ہے اور حواری اسے دجال اور ضال کہتے ہیں۔ مقدس یعقوب اپنے
مکتوب ($\frac{14}{2}$) میں پولوس پر تعرض کرتا ہے کہ "اگر کوئی کہے کہ میں
ایماندار ہوں اور عمل کرتا ہو تو کیا فائدہ کیا ایسا ایمان اسے بچا
سکتا ہے، اگر کوئی بھائی یا بہن کے پاس کپڑے نہ ہوں اور روزینہ
کی روٹی میسر نہ ہو اور تم میں سے کوئی یہ کہے کہ سلامت جا اور گرم
اور سیر رہ پر تم اسے وہ چیزیں نہ دو جس کی اسے ضرورت
ہے تو تمہارے کہنے کا کیا فائدہ اسی طرح ایمان بھی اگر عمل کے ساتھ
نہ ہو تو اکیلا ہو کے مردہ ہے۔ لیکن شائد کوئی کہے کہ ایمان تجھ
میں ہے اور میرے پاس اعمال بھلا تو اپنا ایمان بغیر اپنے عمل کے
مجھ پر ظاہر کر اور میں اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے تجھ پر ظاہر

کرتا ہوں۔ تو ایمان لاتا ہے کہ خدا ایک ہے، اچھا کرتا ہے۔ شیاطین بھی یہی مانتے اور تھرتھراتے ہیں۔ اے نکمے آدمی کب تجھ کو معلوم ہوگا کہ ایمان بے عمل مردہ ہے"

پولوس کا استدلال یہ تھا کہ ابراہیم ایمان سے راستباز ٹھہرایا گیا (پیدائش ۱۵) مقدس یعقوب جواب دیتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ جب اپنے بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھایا تو ایمان نے اس کے اعمال کے ساتھ کام کیا اور اعمال سے ایمان کامل ہوا۔

غرض حواریوں اور پولوس میں بعد المشرقین تھا۔ حواری اپنے آپ کو "مسیحی" نہیں کہتے تھے، "اخوان" اور "مومنین" کہتے۔ "مسیحیت" (Christianity) پولوس کی اختراع ہے۔ فاضل رینان لکھتا ہے کہ اس وقت تک یہود و حواری جدا جدا نہ تھے بلکہ رومی بھی حواریوں کے عقائد کے لحاظ سے ایک فرقہ ہی سمجھتے تھے مگر پولوس کو خوب سوجھی، اس نے اپنے متبعین کو "مسیحی" سے موسوم کیا۔ اور اس نام نے مسیحیوں کو یہود سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے اور اس کی تصدیق خود اہل صلیب بھی کرتے ہیں کہ یورپ اور دیگر ممالک میں بھی مسیحیت جو پولوس کی اختراع تھی (پولوس کرسچنٹی) شائع ہوئی۔ اور یہی وہ دجالی مذہب ہے جو کرہ ارض کے طول و عرض میں پہلے یورپ اور پھر انگلستان اور امریکہ نے پھیلایا۔ حواری گوشہ گمنامی میں ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ اصل دین بھی گیا۔

بقول مقدس یوحنا حواری پولوس دجال ہے۔ اس کی نمائندگی کا حق پوپ کے بعد انگلستان نے ادا کیا۔ "دجال" کا مادہ ہے "دجل" معنی

فریب و مکر و حیلہ اور "دجال" بہت بڑا فریبی، مکار، جعلساز، انگلستان کی سیاسیات میں (DEPLOMACY) یہ دجالیت اتنی نمایاں اور واضح ہے کہ اس پر بحث تحصیل حاصل ہے۔ حکیم محمد حسن ترکمانی امروہوی نے شرح فصوص الحکم (تصنیف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی) کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "خر دجال" سے مراد "ریل" ہے، ہمارے ایک ہمعصر نے بھی یہی کچھ مراد لی ہے۔

غرض دجالیت کرہ ارض کے طول و عرض میں خوب شائع ہوئی۔ اور اب بظاہر رو بزوال ہے۔ رہا یاجوج اور ماجوج کا خروج، اس کا مذکور قرآن میں بھی ہے۔ صحف انبیاء (حزقی ایل باب ۳۸) میں مذکور ہے کہ:

"اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو یاجوج کے مقابل ہو جو ماجوج کی سرزمین کا ہے۔ اور روش (رشیا) اور مسک (ماسکو) اور توبال (ٹوبالسک) کا سردار ہے اپنا منہ کر"

ان آیات سے واضح ہوتا ہے "جوج" یا "یاجوج" موجودہ سوویٹ روس ہے۔ اسفار موسیٰ (کتاب پیدائش باب ۱۰) میں حضرت نوحؑ کے بیٹوں سام اور حام اور یافث کی اولاد میں سے یافث کے قبائل جمر اور یاجوج اور میڈیا اور یونان اور توبل اور مسک اور تیراس اور ان کی شاخوں کا مذکور ہے۔ اہم سامیہ عیلام اور سور اور ارفکسد اور لود اور امام اور ان کی نسلیں بیان کی گئی ہیں۔ یافث کی اولاد موجودہ اقوام یورپ اور چین اور تاتار و ترک وغیرہ ہیں اور انہی پر یاجوج و ماجوج کا اطلاق ہوتا ہے۔

"حزقی ایل" ایرانی شہنشاہ تیخسرو کے ہمعصر ہیں جس نے بابل کو مسخر

کیا اور بنی اسرائیل کو بابلیوں کی اسیری سے آزاد کرنے کے بعد پھر سے ارض فلسطین میں بسایا۔ حزقی ایل نبی کی پیش گوئی اپنی قوم بنی اسرائیل کے تعلقات سے وابستہ ہے، اسفار موسیٰ ؑ کی پانچویں کتاب المثانی میں حضرت موسےٰ نے بنی اسرائیل کو پیش از وقت آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کی پاداش میں عذاب الہیٰ میں مبتلا ہو گے۔ پہلی دفعہ اسیری کے مصائب میں گرفتار ہو گے۔ تم توبہ کرو گے اور تو خداوند خدا تمہارے دن پھیر دے گا۔ بعد پھر سے ارض معبود (فلسطین) میں آباد ہو گے۔ یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی جب بخت نصر بابلی بادشاہ ان کو اسیر کر کے بابل میں لے گیا۔ ستر سال اسیر رہے حزقی ایل نبی انہی ایام میں بابل میں مبعوث ہوئے۔ دوسری پیش گوئی ۷۰ء میں پوری ہوئی جبکہ رومیوں نے ان کو ارض معبود سے بالکل بے دخل کر دیا۔ اور یہ کرہ ارض پر آوارہ ہوئے۔ توراۃ (المثانی $\frac{۱۵}{۱۸}$) میں حضرت موسےٰ ؑ اس کے بعد ان کو چارہ کار بھی بتاتے ہیں کہ "میری مانند ایک نبی (آنحضرت) تیرے بھائیوں (بنی اسماعیل) سے مبعوث ہو گا تم اس کی طرف رجوع کرو گے تو پھر سے تازگی بخش ایام آئیں گے" مگر بنی اسرائیل نے آنحضرت ؐ کی دعوت قبول نہ کی۔

قرآن (سورہ بنی اسرائیل اور دیگر آیات) میں بحوالہ توراۃ ان پیش گوئیوں کا مذکور ہے۔ توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس آوارہ گردی میں کیا کیا آفات ارضی و سماوی بنی اسرائیل پر نازل ہوں گی۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ

"تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانے ہو جائے گی اور اور تو رات اور دن ڈرتا رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی پر کچھ بھروسہ نہ ہو گا۔ اپنے دل کے خوف سے جسے تو کھائے گا اور ان چیزوں سے جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں گی، صبح کو تو کہے گا کہ اے کاش کہ شام ہوتی اور شام کو کہے گا کہ اے کاش کہ صبح ہوتی۔ اور خداوند تجھ کو اس راہ (ارض فلسطین) سے جس کی بابت میں نے تجھے کہا کہ تو پھر نہ دیکھے گا، کشتیوں پر مصر کو پھر لے جائے گا اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لیے اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچے جاؤ گے اور کوئی تمہیں مول نہ لے گا"

(الثانی ۲۸/۶۶)

قرآن عظیم میں بھی اس پیش گوئی کی تصدیق کی گئی ہے کہ فاذا جاء وعد الآخرۃ جئنا بکم لفیفا (۱۵/۱۵)، جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم کو یہاں لپیٹ کر لے آئیں گے۔ توراۃ میں نہیں بتایا گیا کہ وہ وقت کب آئے گا جب یہ پیشگوئی پوری ہو گی لیکن قرآن میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ ارشاد ہے

وحرام علی قریۃ اھلکنھا انھم لا یرجعون حتی اذا فتحت یاجوج و ماجوج وھم من کل حدب ینسلون واقترب

اور اس باعظمت بستی (یروشلم) کے رہنے والوں پر حرام کہ پھر سے اس کی طرف مراجعت کریں جن کو ہم تباہ کر چکے ہیں۔ اس وقت تک کہ یاجوج و ماجوج کھول دئے جائیں اور [illegible] ہر ایک بلندی سے دوڑتے ہوئے

الوعد الحق فاذا هی شاخصة	آئی گے۔ سچے وعدہ کا وقت قریب آ لگا۔
ابصار الذین کفروا یویلنا	اور ان لوگوں (یہود) کی آنکھیں چڑھی کی چڑھی
قد کنا فی غفلة من هذا	رہ گئیں جو اس وقت کے منکر تھے کہیں گے
بل کنا ظلمین - انکم وما	کہ اے وائے ہم اس وقت سے غافل ہی
تعبدون من دون الله	رہے بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔ اب پچھتانے
حصب جهنم انتم لها	سے کیا ہوتا ہے، تم اور جن کو تم اللہ کو
واردون (پ۱۷)	چھوڑ کر پوجتے رہے جہنم کے ایندھن ہیں
	جس میں تم کو وارد ہونا ہے۔

نیز ارشاد ہے کہ

ان یاجوج وماجوج	تحقیق یاجوج و ماجوج کرۂ ارض پر مفسد لوگ
مفسدون فی الارض ؛؛؛	ہیں ۔۔۔۔۔ اور میرے پروردگار کا وعدہ
؛؛؛ وکان وعد ربی	سچا ہے۔ اور ہم ان (یاجوج ماجوج)
حقا، وترکنا بعضهم یومئذ	کو ایک دوسرے میں اس دن موج
یموج فی بعض، ونفخ فی	مارتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور
الصور فجمعنهم جمعا و	پھونکا جائے گا تو ان کو ہم اکٹھا جمع
عرضنا جهنم یومئذ للکفرین	کریں گے اور جہنم سامنے لائی جائے
عرضا الذین کانت اعینهم	منکروں کے لیے اس دن، جو ہماری
فی غطاء عن ذکری وکانوا لا	یاد دہانی سے غفلت برتتے رہے
یستطیعون سمعا (پ۱۶)	اور جو انتباہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔

آیات مذکورہ بالا میں جس وعدہ کا مذکور ہے اس کا ایک حصہ ہمارے زمانہ میں پورا ہو چکا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی دفعہ یاجوج و ماجوج

کا آمنا سامنا ہوا۔ ان کو "اتحادی" اور "محوری" موسوم کیا گیا۔ اس جنگ کے خاتمہ پر اعلان بالفور ہوا کہ یہود کو ان کے گھر (فلسطین) میں بسایا جائے گا۔ یہ اعلان اتحادیوں کے ایک رکن رکین برطانیہ کی طرف سے ہوا جو دجال بھی ہے۔ یورپ بالخصوص روس میں یہود پر عرصہ حیات تنگ تھا مگر "یہودی مفاد" نقل مکانی کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر بھی یہود ۱۸۴۵ء میں بارہ ہزار فلسطین میں آباد ہو چکے تھے ۱۸۸۲ء میں ان کی تعداد دوگنی ہوگئی ۱۸۹۵ء میں ان کی تعداد سینتالیس ہزار ہوگئی۔ لیکن وہ حقیر اقلیت میں تھے اعلان بالفور کے بعد ان کی تعداد پچاسی ہزار کے قریب ہوگئی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۶ء تک دو لاکھ اسی ہزار یہودی فلسطین میں آ گئے۔ اب ان کی کل تعداد چار لاکھ چار ہزار کے قریب ہوگئی۔ یہ تیس فیصدی آبادی کا حصہ تھے کہ دوسری جنگ عظیم پھر یاجوج و ماجوج میں شروع ہوگئی۔ "ہٹلر" نے ان کو اس طرف دھکیلا اور جہاں جہاں اس نے پیش قدمی کی یہود بھاگ کر فلسطین میں آتے رہے اس کے بعد جب "اینگلو امریکن" بلاک کی مدد سے ان کے خدا کا گھر "سلطنت کا" بن گیا تو ایک بے پناہ کشش نے ان کو کرۂ ارض کے ہر ایک حصہ سے کھینچا ۱۹۴۶ء کے بعد ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار اور آ گئے اب ان کی آبادی تراسی فیصدی ہوگئی اور یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا جب تک پورا نہ ہو۔

یہ دو جنگیں اگرچہ عظیم کہی جاتی ہیں مگر اس ہولناک جنگ کا پیش خیمہ ہی تھیں جو متوقع ہے اور جس کے لیے یاجوج و ماجوج ہر ممکن قوت

پنی اپنی جگہ فراہم کر رہے ہیں۔ اسی متوقع جنگ کی خبر قرآن عظیم نے دی ہے اور اسی جنگ کے دوران میں یہود کے حق میں توراۃ کی وہ پیش گوئی پوری ہو گی کہ ان کو مصر میں جہاں سے ان کا خروج ہوا تھا۔ جہازوں پر لایا جائے گا اور غلام اور لونڈی کی طرح فروخت کئے جائیں گے مگر کوئی خریدار نہ ہو گا۔ اور اس واقعہ کے ساتھ یہود کی قومیت ختم ہو جائے گی۔

ان اوراق میں ہم نے مہدویت اور مدعیان مہدویت کے حالات بیان کئے ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ بعض احادیث میں جس مہدی اور عیسےٰؑ کی آمد کا مذکور ہے اس کا زمانہ ان واقعات کے ظہور سے وابستہ ہے۔ ان مہدیوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہوا جس پر ان احادیث کا اطلاق ہو جو دجال اور یاجوج و ماجوج کے خروج کے بارہ میں ہیں ان احادیث میں خصوصیت سے مذکور ہے کہ ان کی جنگ یہود سے ہو گی۔

توراۃ کی پیش گوئی میں "مصر" کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اہل مصر ہی نے ابتدا سے یہود کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس وقت اینگلو امریکن بلاک کی خفیہ سازش اور امداد کی وجہ سے یہودی کامیاب ہو رہے ہیں مگر متوقع جنگ کے شروع یا دوران یا بعد میں نہیں کہا جا سکتا کہ کیا حالات ہوں مگر حسب پیش گوئی توراۃ مصر ہی غالب آئے گا۔ جو اتحاد عرب میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔

اس جنگ کے ہولناک تباہ کن اثرات میں تو کچھ شک و شبہ نہیں جو کرۂ ارض کی اقوام کو لپیٹ میں لے لے گی۔ لیکن قرآن میں مذکور ہے۔

ان الذین سبقت لھم
منا الحسنیٰ اولئک عنھا مبعدون
لا یسمعون حسیسھا وھم فی
ما اشتھت انفسھم خلدون
لا یحزنھم الفزع الاکبر

پ ۱۷

تحقیق وہ لوگ کہ ان سے ہمارا نیک وعدہ
پہلے ہی ہو چکا ہے وہ اس سے دور
ہی رکھے جائیں گے۔ اس کی بھنک بھی
ان تک نہ پہنچے گی اور وہ من مانی بیٹھا
کریں گے ان کو (لوگوں کی چیخ پکار پر جو
اس میں شامل ہوں گے جو) نزع عظیم
ہوگی کوئی افسوس نہ ہو گا۔

اللہ ہی کو معلوم ہے کہ یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جو متوقع حرب
عظیم سے دور ہی رہیں گے۔ اور کون کون بدقسمت ہیں جو اس میں شامل
ہوں گے۔

سلطان محمود غزنوی

حرفِ مطلب

سلطان محمود غزنوی کے حالات بعض تاریخوں اور تذکروں میں مذکور ہیں۔ لیکن بعض واقعات جو سلطان کے دورِ حکومت میں رونما ہوئے ان میں سے بعض کی تعبیر مورخین نے غلط کی اور بعض کے اسباب اور حقیقت پر ان کو اطلاع نہ ہوئی۔ ان اوراق میں صرف اس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے واقعات اور ان کی اصلیت نمایاں کی ہے۔
عموماً مورخین کسی روایتی واقعہ کو نقل کرتے رہے اور کبھی اس کی تحقیق نہ کی کہ یہ معلوم کریں کہ یہ واقعہ مبینہ صحیح بھی ہے کہ نہیں اگر صحیح ہے تو کیا اسی صورت میں رونما ہوا جس میں روایت ہو رہا ہے! ہم نے کوشش کی ہے کہ واقعات کو ان کی اصلی صورت میں پیش کریں اور ان کا پس منظر بھی قارئین کرام کے سامنے لائیں۔
سلطان محمود کی سیرت اور مہمات بیان کرتے ہوئے ہمارے مورخین نے اس حد تک تو درست لکھا ہے کہ

سلطان کے دل میں جذبہ جہاد فی سبیل اللہ بڑی حد تک کارفرما تھا کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ لیکن واقعات جو قلم بند کئے ہیں اس سے یہ نتیجہ جو بالکل صحیح ہے اخذ نہ کیا کہ خود رایان اور راجگان ہند نے سلطان کو دعوت جہاد دی، یہ واقعہ کہ سلطان نے اشاعتِ اسلام کا راستہ ہندوستان میں کھول دیا اور اکثر ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے صحیح ہے لیکن ان اسباب کو مورخین نے نظر انداز کر دیا جو اشاعت اسلام کا موجب ہیں۔

فردوسی کا قصہ ہم نے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ان اوراق کے مطالعہ کے بعد کئی نئی باتیں قارئین کو معلوم ہو جائیں گی جو اب تک پوشیدہ رہیں۔

هوالمحمود

جهاندار محمود شاه بزرگ — بآبشخور آرد همی میش و گرگ
چو کودک لب از شیر مادر بشست — بگهواره محمود گوید نخست

(فردوسی طوسی)

خدایگان خراسان و آفتاب کمال — که وقف کرد برو کردگار عز و جلال
یمین دولت بد دولت بد و محمود هنر — امین ملت و ملت بدو گرفته جلال

حکایت سفر مولتان همی دانی — و گر ندانی «در تاج الفتوح» پیش آمد
اگرز جیلم فریدل گذشت بے کشتی — بہ شاہنامہ بران بر حکایت ست سمر
ہم درست بود نادرست نیز بود — تو نادرست ندانی مکن سخن باور
ازاں سپس کہ در و دہم را بند پایاب — وزاں سپس کہ براو یاد نبود عبر
بمولتاں شد و دورہ دو دلیست قلعہ کشاد — کہ ہر یکی را صد بند بود چون خیبر
ہلا دو بیت کہ ہاشاں کشادہ سوخت ہمہ — ببرد باد ہمہ تو دہا ہے خاکستر
ز قلعہ ماند کہ نکشاد و زپس کہ زد — «در ذرملی» کہ نکشف و زگیرد زکافر

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

برزم رام همی کرد شاه شیراں را — بگسترید همی حق به تیغ حق گستر
بدانکه جائگه حج هندو آں بودے — بهار گنگ بکند بهار تا سیر
بتے کہ گفتند ایں است ناس دیو بزرگ — خود آمده ونکر [illegible] است نعش او بنگر
سرش بغزنی افگند بر در میدان — اناں سپس که بده بود هندرا مغفر
شنیده که چه کرد او برزم با جیپال — بکامش اندر زهر کشنده کرد شکر
زمیں و لشکر او موج و سیر دریا بود — ز گرد ایشاں گیتی سیاه [illegible] روز اعبر
همه شده دل و دانش حسام رویش تن — نهیب رود بلا فعل اهرمن منکر
بحمله صدود و پیل تا مله گرفت — چنانکه بود در اقلیم هندواں سرود

(ملک الشعرا حکیم عنصری)

خراجِ عقیدت

علامہ اقبال سلطان محمود غزنوی کے مزار پر

خیزد از دل نالہ ہائے اختیار — آہ! آں شہرے کہ ایں جا بود یار
آں دیار و کاخ و کو ویرانہ ایست — آں شکوہ و فال و فر افسانہ ایست
گنبدے در طرف او چرخ بریں — تربت سلطان محمود است ایں
آنکہ چوں کودک لب از کوثر بشست — گفت در گہوارہ نام او نخست
برق سوزاں تیغ بے زنہار او — دشت و در لرزندہ یلغار او
زیر گردوں آیت اللہ را تیغش — قدسیاں قرآں سرا بر تربتش
شوخی فکرم مرا از من ربود — تا نبودم در جہاں دیروز زود
رخ نمود از سینہ ام آں آفتاب — پرو گیہا از فروغش بے حجاب
مہر گردوں از جلالش در رکوع — از شعاعش دوش می گردد طلوع
دار ہیدم از جہاں چشم و گوش — فاش چوں امروز دیدم صبح دوش
شہر غزنیں یک بہشت رنگ و بو — آبجوہا نغمہ خواں در کاخ و کو
قصر ہائے او قطار اندر قطار — آسماں با قبہ ہایش ہم کنار
نکتہ سنج طوس را دیدم بہ بزم — لشکر محمود را دیدم برزم

روح سیرِ عالمِ اسرار کرد تا مرا شوریدهٔ بیدار کرد
آں ہمہ مشتاق و سوز و سرور در سخن چوں اندلیبے پر ز شور
تخمِ اشکے اندراں ویرانہ کاشت گفتگو ہا با خدائے خویش داشت

تا نبودم بے خبر از رازِ او
سوختم از گرمیٔ آوازِ او

(پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)

چند تاریخی حقائق

تمام محققین کا اس ناقابل انکار حقیقت پر اتفاق ہے کہ ہر ایک زمانہ کے ذہنی اور خارجی تاثرات ہر ایک شخصیت کے اعمال میں کار فرما ہوتے ہیں جو اس ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ بلا شبہ بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے ذہنی درجات فطرۃً اپنے زمانہ کے عام فہم سے اعلیٰ وارفع ہوتے ہیں، اگر وہ بر تقاضائے فطرت اپنی قوم یا غیر اقوام کو اپنے ذہن کی بلندی پر لانے کی کوشش بھی کریں تو اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہیں کہ اس ماحول اور اس کے تقاضا کو مدنظر رکھیں جس میں وہ خود اور ان کی قوم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بقول ہربرٹ سپنسر، جو مصلح یہ چاہتا ہے کہ اپنے زمانہ کے نظام معاشرت کی کسی خرابی کی اصلاح اس عجلت کے ساتھ کرنے کی کوشش کرے کہ سب کچھ اس کی اپنی زندگی میں مکمل ہو جائے وہ ایک اصلاح کی جگہ سو معاشرتی خرابیاں نادانستہ پیدا کر دیتا ہے۔ مصلح اعظم وہی ہے جو اصلاح کی داغ بیل لگا دے اور تعمیر کا کام بتدریج آئندہ نسلوں پر چھوڑ دے۔

ہم ان واقعات کا تذکرہ کر رہے ہیں جو آج سے ایک ہزار سال پیشتر وسط ایشیا اور ہندوستان میں رونما ہوئے۔ اور اپنے زمانہ کے ترقی یافتہ ذہن سے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور ان شخصیتوں کے بارہ میں نیز جو اس گذشتہ زمانہ میں اہم تاریخی حصہ لیتی رہیں انتہائی نامعقول رائے قائم کرتے ہیں، اس لیے تاریخی واقعات قلم بند کرتے ہوئے ایسی صورت میں پیش نہیں کرتے جیسی کہ وہ فی الحقیقت تھی بلکہ اپنے ہی ذہنی تصورات پر بحث کرتے ہیں جو کبھی فیصلہ شہود پر نہیں آئے، ہر ایک محقق مورخ کا فرض اولین ہے کہ خالی الذہن ہو کر اول اُس زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کا مشاہدہ کرے جنہیں وہ قلم بند کرنا چاہتا ہے اور اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ اگر وہ خود اس ماحول میں اپنی موجودہ ترقی یافتہ ذہنیت کا بھی مالک ہوتا تو اس سے زیادہ کامیابی کے ساتھ کچھ نہ کر سکتا جو وہ ان ممتاز شخصیتوں کو گذشتہ زمانہ میں کرتے دیکھ رہا ہے، اور شاید اتنا بھی نہ کر سکتا جو کچھ انہوں نے کیا۔

اس انتباہ کے بعد ہم ناظرین کرام کو سلطان محمود غزنوی اور اس کے کارناموں سے روشناس کرتے ہیں، وہ نقشہ جو اس وقت دنیاء اسلام اور غیر مسلم ہندوستان کا تھا پیش نظر رکھیں۔ اسی کے طول و عرض میں سلطان کو نقل و حرکت کرتا دیکھیں، یہی زمین یہی آسمان یہی لیل و نہار، یہی پہاڑ، یہی دریا، یہی صحرا، اس وقت بھی تھے جو اب بھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان ایام میں راستے دشوار گذار تھے، اور سفر کی سہولت جو ہمیں آج میسر ہے ان ایام میں نہ تھی، اور وہ ذرائع سفر جو انسانی ذہنی ارتقاء نے اختراع کیے ہیں اس

زمانہ میں نہ تھے۔ تاریخ یورپ میں ھینی بال لین پول ایک فینقی عرب شہزادگی مارچ (یلغار) کو بہت بڑا حیرت انگیز کارنامہ سمجھا گیا ہے۔ اس نے ہسپانیہ سے "پرنیز" کے سلسلہ کوہ کو اپنی فوج کے ساتھ طے کر کے "اٹلی" پر حملہ کیا تھا۔ "نپولین بونا پارٹ" اس کو "فرسٹ جنرل" کہتا ہے، مورخ گبن "اپنی تاریخ عروج و زوال رومتہ الکبریٰ کے اسباب بیان کرتے ہوئے سلطان محمود کی نسبت لکھتا ہے کہ اس مسلمان "ہیرو" کی یلغاروں کے سامنے ھینی بال کی یلغار ہیچ ہے،

مقدونیہ واقع یونان کے ایک شہزادہ سکندر کے نام کو اتنا اچھالا گیا ہے اور اس پروپیگنڈہ کا اثر نہ صرف ہمارے ترقی یافتہ ذہن پر بلکہ اس کی وفات کے بعد ایشیائی اقوام پر اس حد تک ہوا کہ ملک الشعرا نظامی گنجوی کو اس کے سوا اور کوئی شخصیت نظر نہ آئی کہ اپنی خداداد بلندی فکر کے اظہار کا موضوع بنایا، سکندر نامہ بری و بحری لکھا، اس پر معاصرین نے حاشیہ آرائی کی اور آج تک درسی نصاب تعلیم میں شامل رہا۔ سکندر اعظم کی لڑائیاں صرف ایرانی حکومت تک محدود رہیں، بلاشبہ اس کی فتوحات پر اہل یورپ جتنا فخر کریں بجا ہے۔ لیکن تیمور گورگان اور سلطان محمود کا وہ کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اول الذکر نے بحیرہ روم اور بحیرہ چین تک فتوحات کا سلسلہ قائم کر دیا۔ اور سلطان محمود نے ایران و ترکستان و بلوچستان اور افغانستان اور ہندوستان کو روند ڈالا۔ سکندر اعظم تو ایک "ہیرو" ہے جسے یورپ بار بار پیش کرتا ہے۔ لیکن تاریخ اسلام میں سینکڑوں ہیں۔

اول یورپ بالخصوص برطانیہ کے سیاسی تدبر کا یہ تقاضہ ہمیشہ رہا

کہ مسلمان اپنے آباؤ اجداد اور مشاہیر کی روایات بھول جائیں اور ان کی جگہ ان کے مشاہیر کی حکایات ازبر کریں اور یورپ کا ذہنی تفوق یقین کی حد تک تسلیم کریں۔ یہ صحیح ہے کہ آج وہ دنیا و اسلام پر اپنے ذہنی تفوق کی وجہ سے چھائے ہوئے ہیں، اس حقیقت کا انکار نہیں ہو سکتا، لیکن جیسا کہ وہ ہمارے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے اور علی الدوام ایسے ہی رہیں گے صحیح نہیں، ابھی تو چند صدیاں ہی گزری ہیں کہ یورپ جہالت کی تیرہ و تار گھٹاؤں میں گھرا ہوا تھا، ہسپانیہ میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک مشعل علم روشن رکھی اور ان جاہلوں کو ظلمت سے نکال کر نور میں لائے، اور کسے معلوم ہے کہ ایک صدی کے بعد ان کی گت کیا بنے گی۔ "ہر گرا پنج روز نوبت اوست"

بلا شبہ ہماری ذہنیت شکست خوردہ ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی روایات کو زندہ رکھیں اور زندہ قومیں اور وہ قومیں جو زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ اپنی روایات زندہ رکھتی ہیں۔ البتہ مردہ قومیں افسانے تراشتی ہیں۔ لیکن ہم تو صحیح واقعات بیان کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد واضح ہے کہ ان مشاہیر کی زندگی ہمارے لیے ایک "نمونہ" ہے، اور مذہب اور افراد اقوام کسی نمونہ ہی کو پیش نظر رکھتی ہیں۔

ایک روایت جو اکثر مشاہیر اسلام میں نظر آئے گی یہ ہے کہ یا تو غلام تھے یا غلاموں کی اولاد تھے یا کنیزک زادے تھے۔ مسلمانوں میں غلام کا مفہوم وہ نہیں جو غیر مسلم اقوام کی معاشرتی زندگی میں پایا جاتا ہے مسلمانوں میں فاتحین اور سلاطین اور بلند پایہ علما و حکما و فقہا

اور اہل ورع و تقویٰ اکثر غلام تھے۔ لیکن غیر مسلم اقوام میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان میں شودر ہزار ہا سال سے شودر ہی ہے یونانی فلسفی افلاطون اور ارسطو غلاموں کو وہ شہری حق نہیں دیتے جو یونانیوں کو حاصل تھے۔ "رومن لا" بھی غلاموں کے حق میں اتنا ہی سخت ہے جتنا منو کا "دھرم شاشترہ"

غلامی نہ تو اسلام کی محدثات سے ہے اور نہ اسلام اس کا حامی ہے۔ ہر ایک قوم کے معاشری نظام کا جزو لاینفک غلامی تھی، ہم بیان کر چکے ہیں کہ معاشری نظام کی کوئی بھی خرابی یک لخت اصلاح پذیر نہیں ہوتی۔ اصلاح بتدریج اور معتدل طریق پر ہی ممکن ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے جہاں اس اصل اصول پر بحث کی ہے مثلاً غلامی ہی کو پیش کیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے لاکھوں پونڈ اس کار خیر پر اس نیت اور ارادہ سے صرف کئے کہ غلامی کا فوراً انسداد ہو جائے۔ لیکن جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ یہ غلط اقدام تھا آخر پادریوں کے ذریعہ حکمت اور موعظہ حسنہ کی سوجھی، مسلمانوں نے ہدایات قرآن کے تحت معتدل روش اختیار کی "تعدیل بہر امر کمال عرفاست" بلا شبہ مسلمان لونڈی اور غلام خرید کرتے مگر ان کو ممکن اعلیٰ تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ دیتے یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں غلامی کو شاہی کے درجہ تک ترقی کا موقعہ ملتا رہا۔

قرآن میں غلام کے لیے لفظ "عبد" اور عبدیت اور عبودیت اسلام میں مخلوق کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا خاص حق ہے۔ غیر مسلم اقوام نے یہ حق اپنے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ اور اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد اور

خدا زادے تصور کرتے۔ اور ہمسایہ غیر اقوام کو ملیچھ اور راکشش اور اس بھی قبیح ناموں سے یاد کرتے۔ اسلام نے اسے شرک عظیم نا قابل معافی قرار دیا ہے۔ اس لیے جد کا مفہوم جیسا کہ نا مسلمانوں کی لغت میں ہے اسلام میں نہیں اور نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن لفظ "ما ملکت ایمانہم" یعنی زبردست استعمال ہوا اور ان کو ابھار کر آزاد قوموں کی سطح پر لانا ہر ایک مسلمان کا اعلیٰ فرض ہے۔

تاریخ اسلام کا آغاز آنحضرت کی بعثت سے ہوتا ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد خلفاء قریش نے عرب و شام و ایران و ترکستان و افغانستان و وادی سندھ بشمول ملتان ایک طرف اور تمام شمالی افریقہ اور ہسپانیہ و فرانس تک دوسری طرف زیر حکومت خلافت اسلامیہ لے لیا۔ یہ تمام ممالک آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ ان میں سے اکثر ممالک پر ان کی اپنی حکومت بھی ہے اور یہاں خالص مسلم آبادی بھی ہے۔ ان فتوحات کا اول سہرا خلافت راشدہ پر اور ان کے بعد بنو امیہ کے سر ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں صرف فتوحات کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا۔ لیکن اسلام اور عربی زبان کی اشاعت اموی خلافت میں ہوئی۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کا مقصد تو صرف یہی دو امور تھے۔ ان کی خلافت کے خاتمہ پر دونوں اسی حد تک آکر ٹھہر گئے جہاں انہوں نے چھوڑا تھا۔

بنو امیہ کے جانشین بنو عباس ہوئے۔ لیکن یہ بنو امیہ کی طرح خالص عربی حکومت نہ تھی۔ اس میں ایرانی اور ترکی عجمی عنصر شامل ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہی غالب آگیا۔ جن ایام کا ہم تذکرہ لکھ رہے ہیں اصطلاحاً شاہان بنو عباس

کو غیر عرب مسلمان ہی کہتے اور حق خلافت قریش میں محدود سمجھتے، مگر خلفاء بنو عباس میں اول آٹھ تاجداروں کے بعد کوئی بھی اولوالعزم پیدا نہ ہوا۔ دنیائے اسلام پر غیر عرب سلاطین کا قبضہ تھا بلکہ یہ سلاطین خلیفہ اور خلافت کے بھی سرپرست تھے۔ لفظ "سلطان" انہی خلفاء عباسیہ کی اصطلاح اختراع کردہ تھی۔ "سلطان" کا خطاب اور لقب اس کو عطا فرماتے جو ان کی طرف سے کسی حصہ ملک کا فرمانروا نامزد ہوتا۔ جسے ہم آج نائب السلطنت کہتے ہیں یہی کچھ "سلطان" کا مفہوم تھا۔ اگرچہ رفتہ رفتہ یہ خود مختار ہوتے گئے مگر جب تک خلافت عباسیہ قائم رہی ایک مرکزی حکومت سے وابستہ رہے، یہ وابستگی برائے نام ہی تھی۔

آل بویہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت (۳۱۳ھ) میں عباسی خلیفہ المستکفی بغداد میں تخت خلافت پر متمکن تھا اور آل بویہ خلیفہ اور خلافت کی سرپرست تھیں اپنا شجرہ نسب ساسانی شہنشاہ بہرام گور سے ملاتے تھے غالباً البیرونی کی تحقیق صحیح ہے کہ یہ بہرام گور کی اولاد تو نہ تھے مگر اس وقت برسر اقتدار تھے۔ اور آدمی رنج جالی بگواندگان (؟) سے بجائے بویہ قزوین کے نواح میں ایک رئیس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے علی اور حسن اور احمد والیٔ طبرستان کے ہاں پر اور اس کے تینوں بیٹے ملازم ہو گئے۔ ولایت خراسان پر ایک دوسرے کے بعد قابض ہوتا رہا اور یہ بھی اس طرح منتقل ہوتے رہے۔ نواح ہمدان میں علی کو ایک چھوٹے سے علاقہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس نے اپنے دونوں بھائیوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ رفتہ رفتہ اتنی طاقت بہم پہنچالی کہ علی نے فارس اور حسن نے رے اور احمد نے عراق اپنی ولایت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد علی نے اپنی خود مختاری کا

اعلان کر دیا۔ اور اصفہان پر قابض ہو گیا دونوں بھائیوں کو ان صوبہ جات کا والی مقرر کیا جو وہ پہلے ہی مسخر کر چکے تھے۔ احمد عراق کے اکثر حصہ پر چھایا ہوا تھا تھوڑے عرصہ میں "اھواز" اور "واسط" بھی لے لئے اور ۳۳۴ھ (۹۴۵) میں بغداد پر بھی تسلط جما لیا۔ اب خلافت اور خلیفہ دونوں اس کی سرپرستی میں آ گئے۔ خلیفہ نے علی کو عماد الدولہ اور حسن کو روشن الدولہ اور احمد کو معز الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اس خاندان میں حسن المخاطب بہ روشن الدولہ کا بیٹا عضد الدولہ بڑا صاحب اقبال گذرا ہے۔ اس کے دو بھائی موید الدولہ اصفہان کا اور فخر الدولہ ہمدان کا والی تھا۔ عضد الدولہ بغداد میں خلافت کا سرپرست رہا ان کا مذہب شیعہ اثنا عشریہ تھا۔ پہلی دفعہ بغداد میں عاشورۂ محرم میں مجالس عزاداری منعقد ہوئیں اور عورتیں جلوس کی صورت میں سینہ کوبی کرتی ہوئیں نکلیں اور بنو امیہ پر نام بنام لعنت کی گئی تھی۔ بغداد میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اکثریت اور خود خلیفہ سنی تھا۔ خلیفہ کی بے بسی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دم بخود ہو کر رہ گیا مگر اہل بغداد کا جوش بڑھ رہا تھا۔ آخر بعض اکابر درمیان میں آ گئے اور عضد الدولہ نے نے اتنا تسلیم کیا کہ امیر معاویہ کا نام حذف کیا جائے۔ وہ بھی اس لیے کہ امیر آخر ایک صحابی اور کاتب وحی تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ مسلمان اس وقت تک باوجود اختلاف عقاید صحابہ کا احترام کرتے چلے آ رہے تھے۔ بنو عباس کو خواہ بنو امیہ سے کتنی ہی دشمنی تھی مگر وہ بھی صحابہؓ کے حق میں کبھی کوئی ناشائستہ کلمہ سننا پسند نہ کرتے تھے۔ اور نہ آج تک کسی کو جرات ہوئی۔ مگر اسی خانہ جنگی کی وجہ سے حکومت قریش کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور وہ

بالکل بے بس تھے۔

شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ نے اپنی خلافت قائم کر لی تھی اور آخر مصر پر ان کا پرچم لہرانے لگا۔ اور یہ تمام علاقہ بالکل خلافت عباسیہ سے منقطع ہو گیا۔ بنو فاطمہ کا اول خلیفہ عبیداللہ المہدی تھا۔ عضدالدولہ نے اسے لکھا کہ پہلے اپنا حسب نسب مبینہ تو ثابت کرو پھر دعویٰ خلافت کرنا۔ یاد رہے کہ شیعان علی امام جعفر صادق کی وفات کے بعد دو فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک تو آپ کے بڑے بیٹے اسماعیل اور آپ کی اولاد کو جائز وارث امامت سمجھتا اور دوسرا جو بعد میں اثنا عشریہ کہلایا اس بنا پر منکر تھا کہ اسماعیل کو امام جعفر صادق نے اپنی زندگی میں عاق کر دیا تھا۔ اور اسماعیل آپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ یہ لوگ جو اب اپنے آپ کو بنو فاطمہ کہتے تھے در اصل میمون قداح کی اولاد تھے۔ ہم نے اپنی کتاب "مذاہب اسلامیہ" میں ان فرقوں کے عقاید وغیرہ پر کافی بحث کی ہے اس مقام پر صرف ان واقعات کا حوالہ اس لیے دے رہے ہیں کہ سلطان محمود کو ان لوگوں کے داعیوں قرمطیوں سے بھی نپٹنا پڑا۔ اہل سنت والجماعت شیعہ اثنا عشریہ کو "زندیق" اس لیے کہتے کہ بظاہر تو مسلمان ہیں مگر ان کے دل میں ژند اوستا رچا ہوا ہے۔ لفظ "زندیق" مشتق ہے "ژند" سے جو پارسیوں کی مقدس کتاب "اوستا" کی زبان ہے اور فاطمی باطنیوں کو "ملاحدہ" اس لیے کہتے کہ قرآن کی آیات کی تفسیر جو کچھ کرتے ایجاد تھا۔ غرض ان ایام میں فرقہ بندی کے بعد شر انگیز تفرقہ پیدا ہو چکا تھا۔

آلِ سامان

سامان اشراف بلخ میں سے ایک شخص اپنا سلسلہ نسب جو بیں سے ملاتا تھا۔ عباسی المامون ابن ہارون رشید اس وقت خراساں کا والی تھا کہ سامان مشرف باسلام ہوا۔ اس کے بڑے بیٹے اسد کے چار بیٹے ابو محمد نوح اور ابو نصر احمد اور ابو العباس یحییٰ اور ابو الفضل الیاس تھے۔ جب مامون تخت خلافت پر متمکن ہو گیا تو نوح کو سمرقند اور احمد کو فرغانہ اور یحییٰ کو شاش اور تاشقند اور الیاس کو ہرات کا والی مقرر کیا۔ یہ چاروں صوبہ خراساں کے تحت تھے والی خراساں غسان بن عباد تھا۔ ۲۰۴ھ / ۸۱۹ء میں فوت ہوا تو جانشین اس کا بیٹا ابو الحسن نصر ہوا۔ اس نے بخارا کو بھی لے لیا اور اپنے بھائی ابو ابراہیم اسماعیل کی تفویض میں دے دیا۔ دوسرے سال عباسی خلیفہ معتمد نے یہ تمام علاقہ بحیثیت سلطان اس کی سلطنت قرار دی۔ اسماعیل ۲۹۵ھ / ۹۰۷ء میں فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا ابو نصر احمد جانشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو الحسن نصر آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ آل بویہ سے اس کا جنگ و جدل جاری رہا۔ اس کا بیٹا ابو محمد نوح اس کا جانشین ہوا تو آل ساماں کی حکومت میں ضعف آچکا تھا رے اور طبرستان اور جرجان ایک ایک کر کے ہاتھ سے نکل گئے۔ نوح ۳۴۳ھ / ۹۵۴ء میں فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا ابو الفوارس عبدالملک جانشین ہوا۔ کوشش تو بہت کی کہ کھوئی ہوئی عظمت پھر بحال ہو مگر ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء میں اس کا انتقال چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہو گیا۔ اس کا بھائی ابو صالح منصور جانشین ہوا۔ اسی کے دور حکومت میں الپتگین نے غزنی اور بست میں خود مختار حکومت قائم کر لی الپتگین اسی کی فوج متعینہ خراساں کا افسر تھا۔ منصور ۳۶۵ھ / ۹۷۶ء میں مر گیا۔

اس کا بیٹا ابوالقاسم نوح جانشین ہوا۔ اس کی تمام عمر امرا سے لڑتے جھگڑتے گذری صرف ایک سبکتگین نے حق نمک خواری مدت العمر ادا کیا۔ اور اسی کے بل بوتے پر اس کی ساکھ بھی رہی۔

سرکش باغی وامرا کے سرغنہ فائق ابو علی سمجوری تھے۔ جو کاشغر کے حاکم بغرا خاں سے ساز باز کر رہے تھے۔ بغرا خاں نے ایک دفعہ نوح کو شکست دے کر بخارا بھی لے لیا تھا۔ مگر یہاں زیادہ عرصہ ناموافقت آب و ہوا کے باعث ٹھہر نہ سکا۔ اس کے جانے کے بعد نوح نے پھر بخارا پر قبضہ کر لیا۔ نوح ۳۸۷ھ/۹۹۷ء میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا ابوالحارث منصور جانشین ہوا۔ یہ سلطان محمود کا ہمعصر ہے۔

الپتگین

الپتگین کی ولادت ۲۶۷ھ/۸۸۰ء میں واقع ہوئی۔ بحیثیت غلام احمد بن اسمٰعیل سامانی کے ہاتھ پڑا۔ اس نے اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ رفتہ رفتہ ایک دستہ کا افسر مقرر ہوا۔ خدا داد قابلیت کے جوہر کھلتے گئے تو "حاجب الحجاب" کے منصب پر فائز ہوا نوح کی وفات کے بعد خورد سال عبدالملک اس کے زیر اثر رہا۔ امیر نوح نے بلخ کی صوبہ داری عنایت کی مگر اس نے انکار کیا تو افواج متعینہ خراساں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ عبدالملک کی وفات کے بعد امرا میں تنازعہ اس بات پر ہوا کہ مرحوم کے بعد کس کو تخت پر بٹھایا جائے۔ الپتگین عبدالملک کے بیٹے کے حق میں تھا مگر امراء نے منصور کو منتخب کیا۔ الپتگین کو یہ انتخاب ناگوار گذرا۔ خراساں سے فوج کے ساتھ بخارا کی طرف بڑھا۔ لیکن حالات ایسے ناسازگار نظر آئے کہ بلخ کی طرف پسپا ہوا۔ امیر منصور نے اس کے تعاقب میں فوج روانہ کی مگر جب الپتگین

نے اسے شکست فاش دی مگر مناسب یہی خیال کیا۔ کہ منصور اب جبکہ مسند امارت پر متمکن ہو چکا ہے اور میں آخر ملازم امیر ہی ہوں اس لیے سردست دور تر ہی رہنا چاہیے، اس لیے محفوظ مقام غزنی کی طرف آیا۔ یہاں ابوبکر کویک والی تھا، اسے بے دخل کیا۔ اور یہاں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ امیر منصور نے بیس ہزار فوج ابوجعفر کے تحت روانہ کی۔ الپتگین نے اسے بھی شکست فاش دی، اب امیر منصور نے بھی مناسب سمجھا کہ الپتگین سے مصالحت ہو جائے۔ چنانچہ اس کے مفتوحہ علاقہ کا والی اسے تسلیم کر لیا۔ اب الپتگین نے بست اور کابل کا کچھ علاقہ بھی فتح کر لیا ۳۵۲ھ / ۹۶۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ابواسحاق ابراہیم الپتگین کا بیٹا ابواسحاق ابراہیم باپ کے بعد مسند نشین ہوا۔ ابوبکر کویک جس کو الپتگین نے غزنی کی امارت سے بے دخل کیا تھا اس کا بیٹا ابوعلی کویک غزنی پر حملہ آور ہوا۔ ابراہیم شکست خوردہ بھاگ کر امیر منصور کے پاس پناہ گزین ہوا۔ امیر نے ایک لشکر جرار ہمراہ کر دیا، اس نے ابوعلی کویک کو شکست دے کر پھر سے غزنی پر قبضہ کر لیا۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد ۳۵۵ھ / ۹۶۶ء میں لاولد فوت ہوا۔

امیر بلکتگین غزنی میں در اصل امرا کی حکومت تھی۔ ابراہیم لاولد فوت ہوا۔ تو امیر الپتگین کے ایک غلام بلکتگین کو منتخب کیا۔ یہ شخص امیر الپتگین کی محافظ فوج کا افسر بھی رہ چکا تھا، اس کا انتخاب اس لیے بھی ہوا کہ بلحاظ تشرع اور تقویٰ سب میں ممتاز تھا۔

اور بحیثیت سپاہی بھی کسی سے کمتر نہ تھا۔ دس سال حکومت کے بعد ۳۵۲ھ / ۹۶۳ء میں یہ نیک نہاد امیر فوت ہو گیا۔

امیر پرتگین امرا نے پرتگین کو مرحوم امیر سبکتگین کا جانشین منتخب کیا۔ ابو علی لویک اور شاہ کابل کی متحدہ فوج نے غزنی پر حملہ کر دیا۔ پرتگین تاب مقابلہ نہ لایا تو امرا نے ایک دوسرے امیر سبکتگین کو منتخب کیا اس پانچ سو نفوس کے ساتھ دلیرانہ متحدہ فوج پر اس زور کا حملہ کیا کہ ابو علی اور شاہ کابل ہزیمت خوردہ اسیر ہو کر قتل کئے گئے

ابو منصور امیر سبکتگین

سبکتگین ۲۷ شعبان ۳۶۶ھ / ۲ اپریل ۹۷۷ء میں مسند امارت پر متمکن ہوا۔ اس کی مسند نشینی کے ساتھ خاندان غزنویہ کا آغاز ہوتا ہے۔

سبکتگین ۳۳۱ھ / ۹۴۲ء میں پیدا ہوا۔ ترکستان میں ایک چھوٹے سے علاقہ میں اس کا باپ "جوق" نامی سردار خاندان تھا۔ ملحقہ علاقہ کے ایک سردار نے یہاں ڈاکہ ڈالا۔ اور اکثر زن و مرد کو اسیر کر کے لے گیا۔ ان میں بارہ سالہ سبکتگین بھی تھا۔ بطور لونڈی غلام فروخت ہوئے تو "نصر حجی" نے اسے خرید لیا۔ اس وقت تک یہ ترکی خاندان اسلام سے نا آشنا تھے۔ "نصر" کے زیر تعلیم و تربیت سبکتگین مشرف باسلام ہوا۔ تین سال کے عرصہ میں اس نے فن سپاہگری سیکھا۔ نصر نے اس کو اپنے دوسرے غلاموں کا افسر مقرر کر دیا۔ ۳۴۸ھ / ۹۵۹ء میں سبکتگین نصر کے ساتھ بخارا میں آیا۔ یہاں امیر الپتگین نے خرید لیا۔ کچھ عرصہ میں اس نے اتنا اثر و رسوخ امیر کے ہاں پیدا کر لیا۔ کہ الپتگین کا "حاجب اعلیٰ" مقرر ہوا۔ اور امیر نے اپنی دختر اس کے حبالہ نکاح

میں دی۔ الپتگین کی وفات کے بعد سبکتگین طبقہ امرا میں خاص احترام سے دیکھا جاتا اور امیر کے جانشین امرا بھی اس کا واجب احترام کرتے رہے آخر جب قرعہ فال امارت اس کے نام پڑا تو تخت حکومت نے بھی اس کے پاؤں چومے۔

راجگان خاندان بھاٹیہ

سبکتگین کا پہلا تصادم راجہ جے پال سے ہوا، اس کی راجدھانی لاہور تھی۔

اس خاندان کی ابتدائی تاریخ حسب ذیل ہے۔

اس خاندان کی حکومت ابتدا میں افغانستان اور تمام پنجاب پر تھی۔ اس کا مورث اعلیٰ "للیا" راجہ کنشکا کوشانی کے آخری تاجدار " لگتورمن" کا وزیر تھا۔ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں "للیا" راجہ کو برطرف کرکے خود اس وسیع مملکت پر قابض ہوگیا "للیا" فوت ہوا تو پھر سابق راجہ کے خاندان کے فرد " سمند دیوا" نے اپنے آبائی ملک پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۹۰۰ء میں کشمیر کے راجہ گوپال ورمن نے "سمند دیوا" کو شکست دے کر "للیا" کے بیٹے " تورمن کام لوک" کو پھر تخت سلطنت دلایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "للیا" کشمیری پنڈت تھا۔ برہمن ہمیشہ وزارت کے مالک رہے ہیں۔ اور گوپال ورمن نے بھی اس کی مدد اسی وجہ سے کی۔ اس خاندان کی آئندہ تاریخ سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ اس خاندان کا تعلق شروع سے کشمیر کے ساتھ رہا ہے " کم لوکہ" مرگیا تو اس کا بیٹا "بھیم" جانشین ہوا "بھیم" مشہور رانی کشمیر " دیدا" کا دادا تھا۔ اور یہ راجہ کشمیر کشم گپتا کی زوجہ تھی۔ "بھیم" کے بعد جے پال جانشین ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۹۶۰ء کا ہے۔ اسی کا تصادم سبکتگین سے ہوا۔

یہ خاندان بھاٹیہ کہلاتا ہے - ان کی راج دہانی لاہور کا ایک دروازہ اب بھی "بھاٹی" سے موسوم ہے - ان کی حکومت پنجاب سے ملتان تک تھی - غزنی میں امرا کی حکومت تھی اور ان میں کبھی کبھی تخت نشینی کے بارہ میں تنازعہ بھی برپا ہوتا، جے پال حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ اگر حالات سازگار ہوں تو پھر سے اپنے آبائی ملک غزنی وغیرہ پر قبضہ کیا جائے۔ جو ایک عرصہ سے مسلم حکومت کے تحت آچکا تھا۔ شمالی علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو یہ کمی اس نے جنوبی علاقہ کی تسخیر سے پوری کرلی - ۹۹۱ء میں لاہور کے راجہ بھرت نے خود ہی جے پال کو دعوت جنگ دی چاہتا تھا - کہ چناب اور جہلم کا درمیانی علاقہ دبالے۔ لیکن جے پال کے بیٹے آنند پال نے اسے شکست فاش دے کر لاہور لے لیا - لیکن پھر اسی کو واپس کر دیا - راجپوتوں کا عام دستور رہا ہے - کہ جب کوئی راجہ دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ دکھاتا تو اس قابل نہ سمجھا جاتا کہ اپنی غیور قوم پر حکومت کرے - اس لیے بھرت تخت و تاج سے دست بردار ہو گیا اور اس کا بیٹا چندر دت جانشین ہوا مگر جے پال کے مقابلہ میں اسے بھی کامیابی نہ ہوئی - یہ تو لڑائی میں اسیر ہو گیا مگر اس کے بیٹوں نے بھاگ کر راجہ جالندھر کے ہاں پناہ لی، جے پال نے بیاس تک تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس سے کمی تو پوری ہو گئی مگر حوصلہ اتنا بڑھ گیا کہ پھر سے شمالی علاقہ کی تسخیر پر کمربستہ ہو گیا، سبکتگین نے راجہ کو دو لڑائیوں میں شکست دی اور ملتان تک تمام علاقہ اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

۹۹۷ء میں سبکتگین کا انتقال ہو گیا - اس کا بڑا بیٹا محمود جانشین ہوا۔

ابوالقاسم سلطان محمود غزنوی

محمود کی یہ ولادت ۱۰ محرم ۳۶۱ھ (۲ نومبر ۹۷۱ء) کی رات کو واقع ہوئی۔ اس کی والدہ رئیس زابلستان کی دختر تھی۔ لہذا اسی نسبت سے محمود کو "زابلی" بھی کہتے ہیں، "زابلستان" نواح غزنی میں ہلمند اور خواش رود کے درمیانی علاقہ کا نام ہے۔ "شاہنامہ فردوسی" کا ہیرو، رستم بھی زابلی تھا۔ محمود کی تعلیم و تربیت اس زمانے کے علماء کے تحت ہوئی۔ چنانچہ قرآن بھی حفظ کیا اور علم حدیث اور فقہ پر بھی عبور تھا۔ خود سبکتگین نے "پند نامہ" لکھا تھا۔ جس میں پند و نصائح کے پیرایہ اصول جہانبانی اور جہانداری بیان کیے، یہ بھی محمود کو ازبر تھا، جب کبھی امیر سبکتگین محمود کے اوائل عمر میں غزنی سے باہر مہمات ملکی میں مصروف رہتا محمود ہی کو انتظام سلطنت کے لیے غزنی میں چھوڑ جاتا۔ اور ابوعلی کرمانی وزیر کے مشورے پر نو عمر محمود کاروبار سلطنت خوش اسلوبی سے چلاتا رہا۔ فن حرب مروجہ میں بھی اسے کامل مہارت تھی لڑکپن ہی میں باپ کے ساتھ "غور" کی مہم میں تھا، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے کہ ؎

ہر از شجاعت گوئی بگودکی در غور   بہ پشت اسپ مبارز بر اود پیش پدر

چودہ سال کی عمر تھی کہ ۳۶۹ھ (۹۷۹ء) میں سبکتگین کے ہمراہ ملتان کی لڑائی میں راجہ جے پال سے زور آزما ہوا۔ ۳۸۲ھ (۹۹۲ء) میں فائق اور ابوعلی سیمجوری کی متحدہ فوج کے مقابلہ میں سبکتگین کے ساتھ تھا۔ اور وہ داد مردانگی دی کہ امیر نے "سیف الدولہ" کا خطاب دیا اور خراسان کا والی مقرر کیا۔

محمود خراساں میں تھا کہ سبکتگین کا انتقال غزنی میں ہو گیا۔ چھوٹے بھائی اسماعیل نے تخت و تاج پر قبضہ جما لیا۔ محمود نے ناصحانہ خط لکھا کہ بھائی کاروبار سلطنت تم سے نہ چلے گا۔ مناسب ہے کہ تم یہ بار گراں جو برداشت نہیں کر سکتے اپنے کندھوں پر نہ رکھو ایک تو تم ناتجربہ کار ہو اور دوسرے ہمارے خاندان کے بدخواہ بھی تمہارے گرد و پیش موجود ہیں جو بظاہر تمہارے ہوا خواہ بنے ہوئے ہیں۔ اگر تم ان کے مشورہ پر چلے تو سلطنت ہمارے خاندان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں تمہیں محروم الارث نہیں کرتا۔ خراساں کی حکومت حاضر ہے! مگر اسماعیل نے اس نیک مشورہ کو قبول نہ کیا۔ محمود لشکر کے ساتھ ہرات پر آیا اور پھر ایک دفعہ لکھا کہ خراساں اور بلخ میں سے کوئی ایک ملک لے لو اور غزنی میرے لیے چھوڑ دو یہ درخواست بھی مسترد ہو گئی۔ ہرات پر اس کا چھوٹا بھائی ابوالمظفر نصر والئی "بست" اور چچا "بغراجوق" والئی ہرات اور "فوشنج" اپنی اپنی فوج کے ساتھ محمود سے ملحق ہو گئے۔ اب یہ متحدہ لشکر غزنی کی طرف بڑھا۔ اسماعیل بھی مقابلہ کے لیے بلخ سے آکر آیا۔ محمود نے آخری دفعہ پھر کہلا بھیجا کہ بھائی خانہ جنگی کا نتیجہ جیسا کچھ ہوا کرتا ہے تم پر بھی واضح ہے اس لیے میری درخواست مصالحت قبول کرو۔ اسماعیل یہ سمجھ رہا تھا کہ محمود جو بار بار مصالحت کی درخواست کر رہا ہے اپنی کمزوری محسوس کر رہا ہے۔ اس لیے یہ بھی ٹھکرا دی۔ آخر جب نامہ و پیام اور دلائل عقلیہ سے کام نہ بنا تو دونوں برہان قاطع یعنی تلوار پر اتر آئے۔

ربیع الاول ۳۸۸ھ / مارچ ۹۹۸ء میں نواح غزنی میں معلوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ فتح پرچم محمودی پر لہرائی۔ غزنی محمود کے قبضہ میں آگیا۔ اسماعیل نے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کی ٹھانی مگر گرد و نواح کا تمام علاقہ محمود کے تصرف میں تھا اس لیے عاجز ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ آنچہ دانا کند کند ناداں۔ لیک بعد از ہزار رسوائی۔ محمود نے برادرانہ محبت کے تقاضہ کو نہ چھوڑا۔ اور بھائی کے آرام و آسائش کا ہر ایک ممکن سامان مہیا کر دیا۔ مگر اسماعیل کے حواس خمسہ کچھ ایسے مختل ہو چکے تھے کہ ایک امیر نوشتگین سے سازش کی کہ محمود کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ محمود کو بر وقت اطلاع ہو گئی۔ امیر تو قتل ہوا۔ اسماعیل کو ابوالحارث کی حراست میں جرجان میں رکھا۔ یہاں اسماعیل نے بقیہ ایام زندگی امن و آرام سے بسر کیے۔

اس خانہ جنگی کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک طرف خراساں و اصفہان درے کے والیان جو اب تک دبے بیٹھے تھے اور دوسری طرف ہندو شاہی جس کی راجدھانی لاہور تھی کھڑے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جسے مسلمان مورخین "ہندو شاہی" سے موسوم کرتے ہیں ان جنگجو اقوام کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہ رکھتی تھیں جن کو سلطان محمود نے مسلسل لڑائیوں کے بعد زیر کیا۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف فرخی شاعر اپنے قصیدہ میں اشارہ کرتا ہے۔

شہ و تندا و رام و مائی و کور از بیم شمشیرش
بلاں جا نید کا تند گور شاں خوشتر مکاں باشد

شاہ (جے پال) اور راے تندا راے (قنوج) اور کور اس کی تلوار کے خوف سے ایسی جگہ پناہ گزین ہیں کہ قبر ہی کو محفوظ ترین مقام سمجھتے ہیں۔

زبجنگ شاہ و جنگ رائے نندا تام کے بوید کے کز جنگہا اورا کمینہ جنگ خان باشد

یہ (محمود) شاہ (جے پال) اور رائے نندا کی لڑائیوں کو کس لیے

کوئی قابل فخر بات سمجھ سکتا ہے کہ خان (ترکستان) کے جنگ کو بھی کچھ اہمیت

نہیں دیتا (حالانکہ یہ نسبتاً بہت عظیم الشان ہے)

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سلطان اپنے باپ کی طرح پنجاب یا اکروڈ

سندھ اپنی مملکت میں شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار

کامیاب معرکہ آرائی کے بعد بھی جے پال اور اس کے بعد انند پال کو صرف

تاوان جنگ (فدیہ) لے کر چھوڑ دیا۔ اور ان کے ملک میں مداخلت نہ کی۔

سلطان محمود صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ ممالک اسلام ترکستان اور ایران

اس کے قبضہ میں رہیں۔ اور ان پر تسلط قائم رکھنے کے لیے اس کو اس

سے کہیں بڑھ چڑھ کر زحمت اٹھانی پڑی جو ہندوستان پر سترہ حملوں

میں برداشت کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا جوہر شجاعت ترکستان

اور ایران کی مہمات میں ہی نمایاں ہے۔ مگر راجگان لاہور پے در پے

شکست کے بعد بھی ہمیشہ دعوت جنگ دیتے رہے اور اگر لڑائی

صرف ان کے اور سلطان محمود کے درمیان محدود رہتی تو یقیناً سلطان

محمود ہندوستان کی طرف رُخ نہ کرتا، لیکن راجگان لاہور نے جب دیکھا

کہ اپنا آبائی ملک نراسئے سندھ اکیلے لڑ کر نہیں لے سکتے تو

راجگان راجپوتانہ کو متنبہ کیا کہ آج ہم بے بس ہیں تو یہ سیلاب جو

سندھ کی طرف سے بڑھ رہا ہے تم سب کو گنگا اور جمنا تک بہا لے

جائے گا۔ اور اس لیے دھرم کے نام پر یہ بھی ترغیب دی کہ متحد ہو کر

ہماری مدد کرو۔ چنانچہ ان تمام راجاؤں نے مدد دی۔

سلطان محمود تخت نشینی سے ایک سال بعد ۳۸۹ھ ۹۹۹ء تک پادرکاب رہا۔ اس کی سلطنت کی حدود جانب غرب اصفہان کے شہر ہمدان اور جانب بلخ اور کوہ ہندوکش اور جانب جنوب مشرق تمام پنجاب اور بھٹنڈہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی ترکتازی کاٹھیاواڑ گجرات تک اور ایران کے صوبہ جات میں مسلسل جاری رہی۔ ان میں سے ہم چند ایک معرکوں کے حالات بالاختصار بیان کرتے ہیں۔

غورستان

"غور" ایک پہاڑی سلسلہ میں واقع ہے۔ ہرات کے مشرق اور جنوب مشرق سے لیکر غرشستان اور "جرجان" کے جنوب تک یہ سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ اور بنام غورستان موسوم ہے اس کے بیرونی حصہ پر مسلمان فاتحین بہت عرصہ پیشتر قابض ہو چکے تھے۔ لیکن اندرونی دشوار گذار سنگلاخ راستوں پر ابھی تک ان کے قدم آگے نہ بڑھے۔ سلطان محمود کے والد امیر سبکتگین نے اسے اپنی سلطنت میں ملانا چاہا مگر اس کا اقتدار مشرقی غور تک رہا۔ "ابن سوری" حاکم مندیش نے امیر کی اطاعت برائے نام تسلیم کرلی۔ امیر کی وفات کے بعد اس نے وہی آبائی پیشہ رہزنی اختیار کیا اور تجارتی قافلوں کو لوٹتا رہا۔ ملحقہ صوبہ جات کے والیان کبھی کبھی اس پر چڑھائی کرتے مگر یہ پہاڑوں میں پناہ لیتا رہا ۴۰۱ھ میں سلطان محمود بذات خود غور کی طرف بڑھا۔ التونتاش والی ہرات اور ارسلان جاذب والئی طوس کے ہراول لشکر کا تصادم اہل غور سے ہوا۔ التونتاش پسپا ہو رہا تھا۔ کہ سلطان محمود پہنچ گیا۔ چند جھڑپوں کے بعد غوری تتر بتر ہو گئے ان کا صدر مقام "آہنگران" تھا۔ سلطان اس طرف بڑھ رہا تھا کہ ابن سوری

کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ابن سوری نے سلطان کے راستہ میں پہاڑیوں میں
مضبوط مورچہ بندی کی ہوئی تھی۔ اس کے تحت اس وقت دس ہزار
کی جمعیت تھی۔ اگرچہ سلطان نے پے درپے سخت حملے کیے مگر غوریوں
کو مورچوں سے باہر نہ لا سکا۔ سلطان ایک سپاہیانہ چال چلا۔ سلطانی
فوج کا وہ حصہ جو دشمن کے مورچوں کے سامنے تھا بھاگ کھڑا ہوا۔
دشمن فتح کے نشہ میں سرشار مورچوں سے باہر نکل کر تعاقب کرتا ہوا
بہت دور میدان میں بڑھ آیا۔ اس وقت سلطانی فوج پلٹی اور غوریوں
کو نرغہ میں لے لیا۔ ابن سوری اور اکثر غوری سردار اسیر ہو گئے۔ سلطان
نے "منڈیش" ابن سوری کے بیٹے "ابو علی" کو دے دیا اور ابن سوری اور
غوری سرداروں کو غزنی میں قید رکھا۔ ابن سوری کو اس شکست کا اتنا
صدمہ ہوا کہ قیدی ہی میں مر گیا۔

اس وقت تک سلطان کا قبضہ مشرقی غور تک محدود تھا۔ لیکن وہ
ارادہ کر چکا تھا کہ تمام ملک سلطنت غزنی میں شامل کیا جائے۔ ۴۰۵ھ/۱۰۱۵ء
میں سلطان جنوب مشرقی علاقہ تک بڑھا اور "خوابین" کے چند قلعوں
تسخیر کے بعد غزنی کی طرف لوٹ آیا۔ سلطنت کے دیگر حصوں کی طرف
سلطان کی توجہ رہی اس لیے اس مہم کو ناتمام چھوڑنا پڑا۔ چند سال بعد
سلطان نے اپنے بیٹے مسعود کو غور کا شمال مغربی حصہ مسخر کرنے
لیے بھیجا۔ خوابین میں سلطان کا نائب "ابوالحسن خلف" بھی مسعود سے
ملحق ہو گیا۔ مسعود "ہری رود" کے کنارہ کے ساتھ ساتھ کوچ کرتا ہوا آ
میں چند پہاڑی قلعے مسخر کیے اور صدر مقام "تب" کے اندر داخل ہو
تب کی تسخیر کے بعد مسعود "تور" پر بڑھا۔ اور اسے بھی مسخر کر لیا۔ ا

طرح غور کا اکثر حصہ سلطنت غزنی میں شامل ہو گیا۔ اس وقت تک اسلام غور کے اندرونی حصہ میں شائع نہ ہوا تھا۔ اب اہل غور اس کے آغوش میں جوق در جوق آنے لگے۔

فتح نور و قیرات

"نور" پشتو زبان میں پہاڑی علاقہ کو کہتے ہیں۔ سلطان کے زمانہ میں یہ لوگ بت پرست تھے نور اور قیرات دو دریا موجودہ کافرستان میں بہتے ہیں، اس علاقہ میں لوگوں کا عام مذہب بدھ مت کی مسخ شدہ صورت تھی۔ اور ساکی ستنہا بدھ کی پوجا کرتے تھے۔ سلطان نے پہلے اس وادی میں راستہ صاف کیا۔ قیرات کے حاکم نے اطاعت اختیار کی اور ساتھ ہی اسلام بھی قبول کیا۔ اس کی رعایا بھی مسلمان ہو گئی۔ سلطان نے اس کی حکومت برقرار رکھی۔ وادی نور کے لوگوں نے مقابلہ کیا۔ سلطان کے ایک فوجی افسر علی بن ابل ارسلان نے ان کو نیچا دکھایا۔ سلطان نے چند علماء کو اس علاقہ میں اشاعت اسلام اور لوگوں کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا۔ اس کار خیر کی تکمیل ہمارے زمانہ میں امیر عبدالرحمٰن والئی کابل نے کی۔

تسخیر رے و ہمدان و اصفہان

رے کا حاکم آل بویہ میں سے فخر الدولہ تھا۔ اس کا انتقال ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء میں ہو گیا اس کا بیٹا مجد الدولہ نو سال کا لڑکا تھا۔ جانشین تو ہی بیٹا والدہ کی سرپرستی میں ہوا۔ جب مجد الدولہ سن بلوغ کو پہنچا تو والدہ "سیدہ" کی سرپرستی ناگوار گذری۔ مگر والدہ بھی حکومت سے دست بردار ہونا نہ چاہتی تھی۔ کشمکش شروع ہوئی تو مجد الدولہ کو جھکنا پڑا۔ ۴۱۹ھ / ۱۰۲۸ء میں سیدہ کا انتقال ہو گیا۔ مجد الدولہ اگرچہ اب ہر طرح سے آزاد تھا۔

مگر یہ علم دوست واقع ہوا تھا اور اتنا نرم طبع تھا کہ سپاہ پر قابو نہ رہا۔ اور یہ خودسر ہوگئی۔ اور مجد الدولہ کو بھی اپنی خیر نظر نہ آئی۔ سلطان محمود کی امداد طلب کی۔ جب سلطانی فوج حاجب علی کے تحت رے پر بڑھی تو غالباً سپاہ سے ڈر کر مجد الدولہ نے ارادہ بدل لیا اور خود مقابلہ کے لیے نکل آیا۔ لیکن جب علی سے آمنا سامنا ہوا تو گھوڑے سے اتر کر علی کے پاس بغرض اطاعت آیا۔ علی نے اسے غزنی بھیج دیا۔ یہاں واجب احترام کیا گیا۔ بقیہ عمر آسائش سے بسر کی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ آل بویہ کا مذہب شیعہ اثنا عشریہ تھا۔ اصفہان بلکہ ایران کے طول و عرض میں ان کے علاوہ معتزلہ اور قرمطیوں کی کثرت تھی۔ معتزلہ تو زیادہ تر امن پسند فلسفی تھے۔ صرف خلیفہ مامون رشید کے عہد میں ان کی بن آئی کیونکہ خلیفہ نے مذہب اعتزال اختیار کر لیا تھا۔ اور یہ رائج دھرم ہوگیا۔ اہل سنت والجماعت پر سختی شروع ہوگئی۔ نامعقول بحث کا موضوع مسئلہ خلق قرآن تھا۔ امام احمد بن حنبل تک کو کوڑے لگوائے گئے۔ قرمطی بنو فاطمہ کے داعی تھے۔ بنو فاطمہ تو امام کہلائے اور یہ "سید"۔ چنانچہ ناصر خسرو علوی اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ بحرین پر ان کا تسلط ہے اور سب اپنے آپ کو "سید" کہتے ہیں۔ ہر قصاب کی دو کان پر گائے، بھیڑ بکری، سور کا گوشت ہوتا ہے یہ خریدار کی مرضی ہے جو بھی پسند کرے لے لے۔ یعنی ان میں حلال حرام کی تمیز نہیں رہی۔ اس فرقہ کو "باطنی" بھی کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر اور ایک باطن اور باطن اصل ہے اور باطن کی تفسیر جو کچھ کرتے ہیں محض الحاد ہے۔ اس لیے اہل سنت والجماعت انکو ملاحدہ کہتے ہیں۔ تصوف

کی آڑ لے کر ان لوگوں نے اکثر ملحدانہ عقائد کی اشاعت کی۔ یہ اتنا زور پکڑ گئے تھے کہ حج کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ خاص مکہ معظمہ پر حج کے ایام میں حملہ کیا حاجیوں کو تہ تیغ بدریغ کیا اور لاشیں زمزم میں ڈال دیں۔ حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔ جب فاطمی خلیفہ عبیداللہ المہدی نے سرزنش کی تو واپس کیا۔

اب کہ سلطان محمود نے اصفہان مسخر کر لیا تو ان قرمطیوں کی خوب خبر لی۔ اکثر مارے گئے اور اکثر اسیری کی حالت میں خراساں لائے گئے اور وہاں قتل کیے گئے۔ ان کی کتابیں جو بھی دستیاب ہوئیں جلائی گئیں۔ سلطان نے رے میں چند ماہ قیام کیا۔ تمام ملحقہ علاقہ کے والیان نے اطاعت اختیار کی مگر ابراہیم بن مرزبان دیلمی نے مقابلہ کی ٹھان لی۔ یہ شخص "سالار" کے لقب سے مشہور ہے۔ زنجان اور ابہر اور سہرجہاں" اور شہر "ندر" کا حاکم تھا۔ سالار کا حریف اس کا اپنا قریبی مرزبان بن حسن تھا۔ اور اس وقت سلطان محمود کے ہمرکاب تھا۔ مرزبان نے بعض دیلمی سرداروں سے بھی ساز باز کر رکھی تھی۔ سلطان کی مدد سے قزوین پر قابض ہو گیا۔ سلطان تو غزنی کی طرف لوٹ گیا سالار کو موقع ہاتھ آیا۔ مرزبان کو شکست دے کر پھر قزوین پر قبضہ کر لیا۔ ۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں سلطان نے اپنے بیٹے مسعود کو ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا کہ تمام علاقہ جو آل بویہ کے تحت تھا مسخر کر کے سلطنت غزنی شامل کیا جائے۔ مسعود نے سالار کو شکست دے کر اسیر کر لیا۔ سالار کے بیٹے نے اطاعت قبول کی۔ اب مسعود رے کی طرف بڑھا۔ علاء الدولہ بن کاکویہ گستر کی طرف بھاگ گیا علاء الدولہ نے اپنے عزیز جلال الدولہ کے ذریعہ عباسی خلیفہ کی سفارش لا دے کار

لایا کہ اصفہان میں بطور نائب السلطنت رہنے دیا جائے۔ سفارش منظور ہو گئی اس عرصہ میں سلطان محمود کا انتقال غزنی میں ہو گیا اور مسعود کو غزنی کی طرف واپس لوٹنا پڑا۔

راجہ جے پال بھاٹیہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ سلطان محمود کی توجہ کا جاذب اصفہان اور خراساں اور ترکستان اور بلوچستان محو ما رہا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے والد کی معروفیت بھی اسی سمت معرکہ آرائی میں رہی اس لیے خاندان بھاٹیہ کے راجہ جے پال کو دریا سندھ کے پار کا علاقہ مسخر کرنے کا حوصلہ ہوا۔ اگرچہ دو دفعہ اس نے سبکتگین کے مقابلہ میں شکست کھائی مگر اس کا اثر اس پر کچھ نہ ہوا ۳۹۶ھ / ۱۰۰۵ء میں محمود نے ملتان مسخر کر لیا۔ ۳۷۶ھ / ۹۸۶ء اسی کے قریب میں راجہ جے پال اور سبکتگین کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ ملتان اس وقت راجہ کی سلطنت میں شامل تھا۔ ملتان کافرستان اور کابل کے درمیان جانب شمال واقع ہوا۔ اس لڑائی میں قدرت نے سبکتگین کی مدد کی، برف نے ہندوستانیوں سے وہ کام کیا جو امیر کی تلوار سے نہ ہوتا۔ بے چارے ٹھٹھر کر رہ گئے۔ راجہ نے امیر سے صلح کر لی اور لوٹ آیا۔ سلطان محمود نے ملتان کو لے لیا تو راجہ لاؤ لشکر کے ساتھ دریا سندھ کو عبور کر کے بڑھا۔ "ویہند" پر محمود نے پیش قدمی روک دی۔ "ویہند" سندھ کے غربی کنارہ پر پشاور کے شمال مشرق اور کابل کے مشرق میں واقع ہے۔ کلہن اپنی تاریخ راج ترنگنی میں اسے "اودبھانڈا" لکھتا ہے اس کا موجودہ نام "ھنڈ" ہے۔

محمود غزنی سے پندرہ ہزار سوار اور مجاہدین کے ساتھ جو دور دور

سے بغرض جہاد فی سبیل اللہ غزنی میں جمع ہو گئے پشاور تک بڑھ آیا۔ اور
یہاں خیمے گاڑ دیئے۔ راجہ جے پال کے ہمراہ بارہ ہزار گھوڑ چڑھے۔ اور
تیس ہزار پیدل اور تین سو جنگی ہاتھی تھے۔ وہ بھی محمود کے سامنے اتر
پڑا۔ دونوں فوجوں کا تصادم ۲۷ نومبر ۱۰۰۱ء محرم ۳۹۲ھ میں ہوا۔ لڑائی سخت خونریز
تھی۔ ترکی سواروں کے پے در پے حملوں کی تاب ہندوستانی نہ لاسکے
پانچ ہزار تو میدان جنگ میں کھیت رہے۔ بقیۃ السیف بھاگ کھڑے
ہوئے۔ خود جے پال اور اس کے پندرہ بیٹے اور پوتے اسیر ہو گئے۔
جے پال نے دو لاکھ پچاس ہزار دینار اور پچاس ہاتھی دینے کا وعدہ
کیا اور گلو خلاصی کرائی۔ سلطان نے اس کا ایک بیٹا اور ایک پوتا بطور
یرغمال رکھ لیا کہ زر فدیہ کی ادائیگی پر ان کو بھی چھوڑا جائے گا۔

ویہنڈ یا ہند راجہ راجگان بھاٹیہ کی راج دھانی تھی۔ سلطان اس
فتح کے بعد اس طرف بڑھا اور گرد و نواح کا علاقہ مسخر کر کے غزنی کو لوٹ گیا۔

مسئلہ چھوت

اس مقام پر یہ تاریخی واقعہ اور اس کی حقیقت اچھی
طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے جس کا تعلق مسئلہ چھوت
سے ہے۔ اکثر مورخین نے اسی واقعہ سے ٹھوکر کھائی ہے اور اس کو ایک
ملی رنگ میں پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شکست کے بعد جے پال
نے خودکشی کی اور زندہ آگ کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بظاہر قیاس ہوتا ہے
کہ شکست کی ندامت غیور راجپوت راجہ برداشت نہ کر سکا مگر حقیقت
یہ نہیں۔ دو دفعہ شکست تو وہ پہلے بھی سبکتگین کے مقابلہ میں کھا چکا
تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہندوؤں میں ذاتوں کا امتیاز خاص شے
ہے اور اس کی بندھن اتنی سخت ہے کہ اعلیٰ ذات کا برہمن چھتری اور

اس سے ادنیٰ ولیش کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا۔ اور مسلمان تو ہندوؤں کے نزدیک ملیچھ اور ناکشش تھے۔ ان کی قید میں رہ کر کوئی ہندو ہندو نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے جب کبھی سلاطین اسلام کا مقابلہ کسی ہندو راجہ سے ہوا اور وہ تاب مقابلہ نہ لایا تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ اگر اسیر ہوا تو ہندو برادری سے خارج تصور ہوگا۔ اس لیے وہ اور اس کا خاندان زن و مرد جان پر کھیل جاتے۔ اس کو وہ اپنی اصطلاح میں "جوہر" کہتے، اور اگر زندہ رہنا پسند کرتا تو یا تو بھاگ کر جان بچاتا اور اگر اسیر ہوتا تو اسلام قبول کرتا۔ ہندوؤں میں ابتدائی دور سلاطین اسلام میں اشاعت اسلام کی ایک یہ بھی وجہ ہے۔ جب برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے اکثر حصہ پر چھا گئی تو مسیحی مشنری بھی تبلیغ دین کے لیے کلکتہ میں سرگرمی دکھانے لگے مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ انہیں چھوت کا راز معلوم تھا۔ ایک دن کچھ اکابر بنگالیوں کو کھانے پر مدعو کیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ کھانا برہمن ہی کے ہاتھ کا پکا ہوگا۔ برہمن کے ہاتھ سے ہر ایک ذات کا آدمی کھانا کھا سکتا ہے، حقیقت بھی یہی تھی کہ چند برہمن فرضی یا حقیقی عیسائی مذہب میں داخل ہو چکے تھے۔ اور ان کی ظاہری شکل و صورت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ ضیافت کے بعد غالباً یہ حال نہ کھلتا مگر پادریوں نے خود ہی تشہیر کیا کہ استنے اکابر نے عیسائیوں کا کھانا کھایا ہے۔ انہیں فوراً برادری سے خارج کیا گیا۔ اب ان کو اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ مسیحی مذہب قبول کیا۔ اور کئی چٹرجی اور مکرجی اور گھوش خاندان مسیحت کی آغوش میں آ گئے۔

انند پال راجہ جے پال کے بعد اس کا بیٹا انند پال جانشین ہوا۔

ہم بیان کر چکے ہیں بنو فاطمہ کے داعی قرمطی حسب فتویٰ علماء اسلام لیداد ملحد قرار پا چکے تھے، اور یہ کہ یہ نہ صرف الحاد جامہ مسلمانی میں شائع کرتے تھے بلکہ ہر وہ مسلمان جو بنو فاطمہ کا طرفدار نہ تھا ان کے نزدیک واجب القتل تھا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک دنیاء اسلام میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ محمد بن قاسم نے وادی سندھ ملتان تک فتح کی۔ اور ملتان تک علاقہ اب خلافت عباسیہ کے تحت تھا۔ لیکن یہ حکومت برائے نام ہی تھی۔ سلطان محمود کے عہد میں ملتان قرمطیوں کا گڑھ تھا۔ یہاں اس وقت ان کا حاکم ابوالفتح داؤد تھا۔ سلطان محمود حسب ایما خلیفہ عباسی اور علماء اسلام ان کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا اس لیے ۳۹۶ھ / ۱۰۰۶ء میں اس کا ارادہ ملتان پر لشکر کشی کا ہوا۔ دریا سندھ پشاور کے قریب عبور ہو سکتا تھا۔ اس لیے راجہ انند پال سے اجازت طلب کی کہ میری فوج کو اپنے ملک سے گذرنے دیں۔ انند پال داؤد سے ساز باز کر رہا تھا۔ اس لیے انکار کیا اور پشاور کی طرف لشکر کشی کی کہ سلطانی فوج کی پیش قدمی یہاں روک دی جائے۔ سلطان نے شکست فاش دی اور دریاء چناب تک تعاقب کیا۔ انند پال تو کشمیر کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوا سلطان ملتان کی طرف بڑھتا گیا۔ انند پال نے تلخ تجربہ کے بعد محسوس کیا کہ اکیلا سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہندوستان کے راجوں سے امداد طلب کی راجگان اجین اور گوالیار اور کالنجر اور قنوج اور اجمیر نے انند پال کی مدد اپنی سپاہ سے کی۔ یہ متحدہ عسکری قوت برہمن پال پسر راجہ انند پال کے تحت پشاور کی طرف بڑھی۔ "ہندو شاہی" کی یورش کی اطلاع سلطان کو ہوئی تو ۲۹ ربیع الثانی ۳۹۹ھ / ۳۱ دسمبر ۱۰۰۸ء کو غزنی سے کوچ کرتا ہوا دریاء سندھ کو

عبور کی اور " ہندہ کے بالمقابل انند پال کی فوج سے ٹکر لی۔ ہندو جان توڑ کر لڑے۔ تمام دن معرکہ کارزار گرم رہا۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا کہ سلطان کے محافظ دستہ نے اس زور کا حملہ کیا کہ ہندو سپاہ پسپا ہوتے ہوئے منتشر ہو گئی۔ میدان سلطان کے ہاتھ رہا۔ سلطان تعاقب کرتا ہوا قلعہ "نگر کوٹ" تک بڑھ آیا۔ یہ قلعہ کانگڑہ کے قریب میں واقع تھا اور دریائے گنگا نے اسے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ یہ درحقیقت قلعہ نما مندر تھا۔ تین دن محاصرہ کے بعد قلعہ سر ہو گیا۔ مندر کی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مال غنیمت میں سات کروڑ درہم مسکوکہ اور ستر ہزار من چاندی سونا اور بیش قیمت موتی اور جواہرات اور دیبا اور حریر کے تھان مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی اچھی طرح دل نشین کرنی چاہیئے کہ سلطان محمود کا حملہ کسی نہ کسی مندر پر ہی ہوا۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ مندروں میں جتنا مال و دولت جمع تھا وہ کسی راجہ کے خزانہ میں بھی نہ تھا۔ جو بھی بیش قیمت شے کسی راجہ کے ہاتھ لگتی بتوں کی نذر کرتا۔ حد ہے کہ راجے اپنی لڑکیاں بھی مندر کی خدمت کے لیے چڑھاوا چڑھاتے۔ سلطان محمود نے نہ کسی مندر کو مسمار کیا اور نہ کوئی بت سوائے سومناتھ توڑا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عبث کام ہے۔ ایک مندر اور ایک بت کی جگہ بے شمار مندر بن سکتے ہیں، کیونکہ ہر ایک ہندو کا گھر بت کدہ تھا۔

ابھی تک سلطان کا یہ ارادہ بھی نہ تھا کہ ہندو شاہی کے کسی حصہ ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لے لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہمسایہ راجہ نہ چین سے بیٹھتا ہے اور نہ چین لینے دیتا ہے اور ہندوستان کے ہندو

راجے بھی دعوت جنگ دے چکے ہیں تو سندھ تک تمام علاقہ اپنے قبضہ تصرف میں لے لیا۔ اگر راجگان بھاٹیہ لڑائی نہ چھیڑتے تو غالباً دریاؤ سندھ دونوں مملکتوں کی مستقل حدود قائم رہتی۔ سندھ کے پار عموماً ہندو بدھ مت کے پیرو تھے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ چھوت کی وجہ سے تمام ہندو آبادی برادری سے خارج ہو چکی تھی اور ان میں اسلام سرعت سے پھیل رہا تھا۔ سلطان نے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اور علماء اسلام ان کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

انند پال مر گیا تو اس کا بیٹا ترلوچن پال ، باپ کی جگہ بیٹھا۔ ترلوچن پال غالباً انند پال کے آخری ایام کی طرح امن سے گذار دیتا مگر اس کا بیٹا بھیم پال جو "نڈر" (بے خوف) کے لقب سے مشہور ہے شوریدہ سر واقع ہوا تھا اس نے سلطان سے ایک دفعہ دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ بھیم پال اس وقت کوہ نمک کے قلعہ "نندنہ" میں حملہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ یہ قلعہ اس سلسلہ کوہ کی ایک شمالی چوٹی پر واقع تھا۔ پہاڑیوں کے شمالی اطراف میں مضبوط مورچہ بندی کے بعد جنگی ہاتھیوں کی قطار سجا کے خود ایک سد سکندر رکھی۔ سلطان کو اس حملہ کی اطلاع ہوئی تو اس طرف بڑھا۔ چند روز معرکہ آرائی رہی مگر مورچہ بندی اتنی مضبوط تھی کہ پے در پے حملوں کا اثر کچھ نہ ہوا۔ سلطان دور تک پیچھے ہٹتا ہوا کھلے میدان میں آ گیا۔ بھیم پال نے خیال کیا کہ دشمن شکست خوردہ پیچھے ہٹ رہا ہے اس لیے دلیرانہ آگے بڑھتا ہوا مورچے چھوڑ دیے۔ اب کھلے میدان میں دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ سلطان بھی یہی چاہتا تھا۔ ہندو فوج ترکی تیر اندازوں کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ بھیم پال کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے

ہاتھیوں کے سامنے کیا اور سلطانی سپاہ پر ہلہ بول دیا لیکن ترکی تیر اندازوں نے ہاتھیوں کی آنکھوں کو ہدف بنایا ہندو سپاہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھیم پال قلعہ نندانہ میں محصور ہو گیا۔ یہ قلعہ بھی ایک مندر بھی تھا۔ عتبی اپنی تاریخ "یمینی" میں لکھتا ہے کہ اس میں "بدھ" کا ایک عظیم الشان بت تھا۔ محمد ناظم سلطان محمود کے سوانح نگار The Life and Times of Sultan Mahmud میں عتبی کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس کو "بت" اور "بدھ" سے مغالطہ ہوا ہے مگر اس نے یہ نہیں لکھا کہ اتنا بڑا بت آخر کس دیوتا کا تھا۔ عتبی سلطان محمود کا ہمعصر مورخ ہے اور اس نے صحیح لکھا ہے کہ یہ مہاتما بدھ ہی کا بت تھا، شمالی پنجاب میں بدھ مت کا زور صدیوں تک رہا ہے۔ اور ان کے "سٹوپا" کے آثار اب بھی یہاں موجود ہیں۔ اور یہ تمام مندر انہی لوگوں کے تعمیر کردہ تھے۔ مہاتما بدھ اور اس مت کے بزرگوں کے چھوٹے بڑے بت ان مندروں میں تھے جن کی پوجا ہوتی۔ ایرانی حکومت پنجاب پر سکندر اعظم کے حملہ تک رہی، انہوں نے جب بدھوں کی مورتیاں دیکھیں اور ان کو کہا گیا کہ یہ بدھ کی مورتیاں ہیں تو اپنی زبان میں "بدھ" کو "بت" کہا۔ دراصل ہندی "بدھ" اور فارسی "بت" ایک ہی لفظ ہے فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ رفتہ رفتہ فارسی زبان کے لفظ "بت" کا اطلاق ہر ایک مورتی پر ہو گیا۔ معنی میں اور وسعت ہوئی تو ہر ایک غیر خدا جو مظہر الوہیت تصور ہوتی بت بن گئی۔ اصطلاح تصوف میں پیر پرستی، رسول پرستی بت پرستی سے تعبیر ہوتی ہے۔ خسرو کہتا ہے

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند آرے آرے می کند با خلق عالم کار نیست

بھیم پال نے دیکھا کہ مقابلہ بے سود ہے چپکے سے کھسک گیا اور اپنے والد ترلوچن پال سے جا ملا۔ یہاں ترلوچن پال افواج کشمیر کے

ساتھ جہلم کے شمال میں پہاڑی علاقہ میں پڑا تھا۔ سپہ سالار افواج کشمیر "تنگا" تھا۔ نندانہ کی تسخیر کے بعد سلطان ادھر متوجہ ہوا۔ پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں اس معرکہ کا حال لکھا ہے۔ سلطانی فوج کو "تمرو کشا" (ترک) کہتا ہے اور سلطان کو ہمیر (امیر) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ پہلے ہی حملہ میں تنگا اور ترلوچن بھاگ گئے۔ اب شمالی پنجاب میں کوئی مقابل حریف نہ رہا، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سردار تحائف کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مطیع ہو گئے۔ بلکہ اسلام بھی قبول کیا۔ سلطان نے جا بجا مسجدیں تعمیر کیں اور ان کے ساتھ مدرسے اور مکتب کھول دیئے۔

ترلوچن اور اس کا بیٹا بھیم اب شوالک کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوئے۔ چندر رائے شروا کی بیٹی سے بھیم کا عقد نکاح ہوا تو پہاڑی راجوں کی امداد بھی حاصل ہو گئی۔ لیکن سلطان نے بھی اب مصمم ارادہ کر لیا کہ پنجاب میں ہندو شاہی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا جائے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہوئی کہ یہاں اسلام سرعت سے پھیل رہا تھا اور نومسلم رعایا کو ہندو شاہی کے رحم و کرم پر چھوڑنا نامناسب تھا۔ جب سلطان نے پہاڑی راجہ چندر رائے کو اطاعت کا پیغام دیا اور فوج کے ساتھ اس طرف بڑھا تو رائے اور بھیم پال جو اس کے پاس ہی تھا بھاگ گئے۔ وہ خوف زدہ تھے کہ اگر اسیر ہوئے تو یا تو خودکشی کرنی پڑے گی یا اسلام قبول کرنا ہوگا۔ ترلوچن کالنجر کے راجہ کے ہاں امداد کے لیے جا رہا تھا۔ کچھ سپاہ ساتھ تھی۔ لیکن یہاں بھی سلطانی سپاہ نے پیچھا نہ چھوڑا تو راجہ نے قنوج کی طرف رخ کیا۔ سلطانی سپاہ تعاقب میں تھی۔ دریا رہت (رام گنگا) نے سلطانی سپاہ کی پیش قدمی روک دی۔ دوسرے کنارہ پر

دشمن کی فوج راستہ روکے کھڑی تھی۔ سلطانی سپاہ تیروں کی بارش میں دریا عبور کر گئی، دریا کے دوسری طرف ترلوچن نے جم کر مقابلہ کیا مگر شکست کھائی، زخم خوردہ جان بچا کر نکل گیا۔ مگر راستہ میں ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء میں اس کے ایک سپاہی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور اس کے ساتھ پنجاب میں ہندو شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان نے یہ ملک سلطنت غزنی میں شامل کر لیا۔ سلطان محمود پہلا مسلمان بادشاہ پنجاب ہے۔ خاندان غزنیہ کے بعد یہ ملک ہمیشہ سلاطین اسلام کے تحت رہا۔ راجہ رنجیت سنگھ تک رہا اس کے بعد انگریزوں کی عملداری میں آیا۔ اب پھر اس کا نصف حصہ پاکستان کا ایک صوبہ ہے۔

خاندان بھاٹیہ کے اکثر افراد کشمیر میں پناہ گزین ہوئے۔ اس کے بعد ان میں سے کسی نے پنجاب کا رُخ نہ کیا۔ اور امن سے زندگی بسر کرتے رہے۔ لفظ "بھاٹ" کشمیری زبان میں "بٹ" ہے اور افغانستان میں ان کو "ٹپی خیل" کہتے ہیں۔ محمد جلال الدین اکبر مغلیہ شہنشاہ کا درباری رتن راجہ بیربل بھی بھاٹ تھا، بلکہ ابتدا میں ہر ایک بھٹیارہ بھی بھاٹ تھا کیونکہ برہمن کے ہاتھ کا کھانا ہر ایک ہندو کھاتا ہے۔ پنجاب میں بھٹی راجپوت عموماً مسلمان ہیں، ہندو اور مسلم امتیاز پیدا کرنے کے لیے بھاٹ تو ہندو اور بھٹی مسلمان کہلائے۔ یہ سب سارسوت برہمن ہیں۔ راجہ اور راجپوت ان کو اس لیے کہتے کہ یہ راجہ بھی تھے اور ان کے خاندان کے افراد جو بھی ان سے وابستہ تھا راجپوت کہلایا۔ راجپوت عموماً وہ غیر آریا اقوام ہیں کہ جو ہندوستان میں باہر سے تاجرانہ انداز میں آئے اور یہاں ان کی حکومت ہی چھتری نسل قریب ختم ہو گئی

اور برہمنوں نے اپنا دینی اقتدار اور دنیوی مفاد برقرار رکھنے کے لیے ان اقوام کو "شودر" کیا اور راجپوت ایک نئی "جاتی" بنا دی۔ ان میں سے اگنی کنڈ کے راجپوت مشہور ہیں۔ انہی کی مدد سے برہمنوں نے بدھ اور جین مت کو نیچا دکھایا اور مسلمانوں سے انہی کا مقابلہ ہوتا رہا۔

ابوالفتح داؤد بن نصر قرمطی

قرامطہ کا مختصر حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ ملتان محمد بن قاسم نے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں مسخر کیا۔ یہاں مسلمانوں کی آمد و رفت انہی ایام میں شروع ہو گئی تھی۔ لیکن جب اموی حکومت ایشیا میں ختم ہو گئی تو جانشین عباسی خلافت کا تعلق بھی ملتان سے منقطع ہو گیا۔ بنو فاطمہ کے داعیان نے ملتان کو اپنا مرکزی مقام دعوت بنا لیا۔ لہذا اس جگہ اپنی حکومت قائم کر لی۔ حاکم ملتان سبکتگین کے وقت سے ابوالفتح داؤد بن نصر قرمطی تھا۔ چنانچہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ کس لئے سلطان محمود ان کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا۔ سیدھا اور صاف راستہ ملتان کی طرف پنجاب سے گزرتا مگر انند پال نے سلطانی فوج کو گذرنے کی اجازت نہ دی تو اول سلطان کو اسی سے نپٹنا پڑا۔ انند پال کو شکست ہوئی تو راستہ صاف ہو گیا۔ سلطان نے ملتان محاصرہ میں لے لیا تو چند روز بعد ابوالفتح نے ہتھیار رکھ دیے۔ اسے قید کر کے غزنی بھیج دیا اور قرمطیوں کو جو بھی ملا تہ تیغ بدریغ کیا۔ اس قتل عام میں سلطان خود بھی شریک تھا۔ جو بچا کشمیر میں پناہ گزین ہوا یا ادھر ادھر جہاں سینگ سمائے روپوش ہو گیا۔

اگرچہ سلطان نے اپنی مملکت کے طول و عرض میں فرمان جاری کر دیا کہ قرمطی جہاں ملے مارا جائے مگر یہ لوگ جانتے تھے کہ کسی طرح زندہ

بھی رہ سکتے ہیں اور اپنا کام بھی کر سکتے ہیں۔

سومناتھ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ انند پال بھاٹیہ کے راجگان اور وغیرہ سے امداد طلب کی اور ان کی متحدہ فوج نے سلطان کا مقابلہ کیا۔ چونکہ وہ خود ہی دعوت جنگ دے چکے تھے اس لیے سلطان جب پنجاب کی جہات سے فارغ ہوا تو ان کی طرف توجہ کی ان جنگوں کے حالات بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں۔ مختصر یہ کہ تھانیسر اور متھرا اور قنوج اور گوالیار اور کالنجر غرض تمام مقامات ایک ایک کر کے سلطان نے مسخر کر لیے۔ چونکہ سلطان کی توجہ کا مرکز ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہندو "تیرتھ" ہی رہا اور کسی دیوتا نے اپنے پوجاریوں کی مدد نہ کی اس لیے شیومت کے پوجاری اپنا تفوق جتانے کے لیے کہتے کہ شیوجی مہاراج ان سب دیوتاؤں سے ناراض تھے اس لیے تو ملیچھ اور راکشس غالب آئے اور ان دیوتاؤں کے پوجاری مغلوب ہو گئے۔

ہندوستان میں سب سے بڑا مندر کاٹھیا واڑ گجرات میں سومناتھ تھا۔ "سوم" کے معنی چاند ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن "سوم وار" (MONDAY) میں بھی یہی لفظ ہے۔ روایت ہے کہ چندر دیوتا سے کچھ بے اعتدالی ایک رشی کی زوجہ محترمہ کے ساتھ ہوئی۔ اس گناہ کبیرہ کی پاداش میں وہ عذاب کے منہ میں آیا اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے شیوجی کی پوجا شروع کی۔ شیوجی کی مورتی "لنگا" ہے یہ مورتی اس نے سمندر کے کنارہ نصب کی۔ سمندر کے پانی کے اتار اور چڑھاؤ کا تعلق چاند کی کشش سے وابستہ ہے، لوگوں کے ذہن لیکن یہ

عقیدہ کیا گیا کہ چندر دیوتا شیوجی کی خدمت میں لگا ہوا ہے اور اس کی مورتی کے اشنان کی خدمت اس کے ذمہ ہے ، یہ وہ مقام ہے جہاں سومناتھ (آقائے ماہ) کا مندر تعمیر ہوا۔ علاوہ ازیں شیوجی کے بارہ میں اور روایات بھی مشہور ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ شیوجی کوہ ہمالیہ میں رہائش رکھتے ہیں۔ اور گنگا دیوی آپ کے سر سے نکلی، اس لیے سومناتھ کی مورتی کو روزانہ اشنان کے لیے دریا گنگا کے پانی کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا انتظام یہ کیا گیا تھا دریا کا پانی غسل کے لیے روزانہ یہاں پہنچ جاتا۔

بعض حضرات کی جدت طبع کی داد دینی چاہیے کہ مکہ والوں کی دیوی "منات" کو مشابہت لفظی کی وجہ سے بھی "سومناتھ" تصور کیا ہے۔ مجھے ان اصنام کی اصلیت دریافت کرنے کے لیے یونانی اور مصری اور ہندی ضمیات (MYTHOLOGY) کا مطالعہ بنظر غائر کرنا پڑا۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور میں نے اس پر علیحدہ بحث کی ہے۔ اس مقام پہ اتنا واضح کرنا کافی ہوگا کہ کعبۃ اللہ حضرت ابراہیم اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل کا تیار کردہ ہے۔ اور یہ معبد پہلا گھر ہے جو اہل توحید کی عبادت گاہ قرار پایا۔ اور اس کی تعمیر کا مقصد جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے۔ ذات ابراہیم کو اصنام پرستی سے دور تر رکھتا تھا۔ یہ "وادی غیر ذی زرع" ہے حضرت ابراہیم کی رہائش مستقل شام میں تھی جسے توراۃ میں "ارض جنت" کہا گیا ہے۔ لیکن شام میں بت پرستی کا بازار گرم تھا۔ اور اسی اصنام پرستی سے بیزاری کی وجہ سے حضرت ابراہیم نے عراق سے ہجرت کی تھی۔ آپ کی بالغ نظری کا یہ تقاضا تھا کہ اس ویرانہ میں یہ معبد تعمیر کیا۔

اہل مکہ عرصہ تک بت دبت پرستی سے واقف نہ تھے، لیکن وادی غیر ذی زرع کے رہنے والوں کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ شام اور مصر اور یمن میں ان کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت جاری رہی، شام میں وہ لوگوں کو آسودہ حال دیکھتے تو وجہ دریافت کرتے۔ وہ کہتے کہ سب کچھ ان دیوتاؤں کے صدقے مل رہا ہے اور یہ برکت اور فراوانی جو تم دیکھ رہے ہو اسی مورتی پوجا کا اجر ہے۔ یہ خود تو بت تراش نہ تھے ان سے خرید کر لائے جو ان کے خاندانی بت کی حیثیت سے ان کے گھروں میں رہتے۔ لیکن ان میں سے اگر کوئی زیادہ آسودہ حال ہو جاتا تو اس کا خاندانی بت قبائلی "صنم" بن جاتا۔ ارض حجاز میں چند ہی گنتی کے بت تھے، جن کو قبائلی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کا کوئی قومی بت نہ تھا۔ اور تمام بت ان کے خرید کردہ تھے۔ ان میں سے "ہبل" کی روایات بہت کچھ یونانی دیوتا "اپولو" سے ملتی جلتی ہیں اور یقیناً ہبل اسی کا معرب ہے "لات" یونانی دیوی "لیٹو" (LETO) سے ہے جو اپولو کی والدہ ہے۔

"شیو" کا مذکور ویدوں میں نہیں اور نہ آریا ہندو ویدوں کے زمانہ میں اس دیوتا سے واقف تھے۔ آثار قدیمہ جو "موہن جداڑو" واقع وادی سندھ سے برآمد ہوئے ہیں ان میں سے شیو کی مورتی بھی ہے، اس لیے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ پنجاب (برہماورت) میں آریوں کے داخلہ سے پیشتر یہاں کے باشندوں میں شیو پوجا رائج تھی۔ لیکن دراوڑ قوم جو وادی سندھ میں حکمران تھی۔ اس کی اصلیت کا سراغ مصر اور شام اور عراق میں ملتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "تاریخ پنجاب" میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ بلکہ ہندوستان کا مشہور خاندان گپتا اصل میں مصری "قبطہ" ہے

اس لیے ہمیں شیو پوجا کا سراغ شام اور مصر ہی میں تلاش کرنا چاہیئے۔ مورخ ہیروڈوٹس اور دیگر مورخین یونان یونانی دیوتا "ڈیونیسیس یا ڈائی او سی سیئس" کے وہی حالات بیان کرتے ہیں جو "شیو" کی روایات میں پائے جاتے ہیں، لیکن "ڈیونیسیس" کو بھی وہ عظمت ہومر کی نظموں میں حاصل نہیں جو بعد میں اس کے پجاریوں نے اسے دی، ہومر اور ویدوں کے منتروں کا زمانہ قریب تر ہے، اس یونانی دیوتا کی نسبت یہ روایت ہے کہ عالم وحشت میں یہ مصر اور شام اور ایران میں گیا اور ہندوستان میں کئی سال رہا۔ اس کی مورتی بھی لنگا ہے۔ حقیقت یہ ہے یونانیوں نے یہ خاص پوجا مصریوں ہی سے سیکھی۔ ہیروڈوٹس مصر کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک خاص تیوہار کا ذکر کرتا ہے جو بالکل ہندوستان کے "تیوہار" ہولی" کے مشابہ ہے۔ لوگ کشتیوں میں دریائے نیل پر سے گذرتے ہوئے جب کسی بستی کے قریب آتے تو زن و مرد پہلے ہی ان کے منتظر ہوتے۔ طرفین نشہ میں چور پہلے جی بھر کر ایک دوسرے کو مغلظات جو بھی ان کی لغت میں تھے سناتے پھر اہل کشتی کنارہ پر اتر آتے اور ننگے ناچتے، جس میں کنارہ کے لوگ بھی اس رقص عریاں میں حصہ لیتے۔

"شیو جی" کی خاص سواری کا بیل "نندی" مصریوں کا "بقرہ" ہے جس کی پوجا مصر میں عام تھی، مصری دیوتا "ادیسرس" کو جب اس کے بھائی "شیط" نے قتل کیا تو دیوتا کی زوجہ "آئی سس" نے شام کے کنارہ پر اپنے مقتول خاوند کی لاش پائی۔ اس کے ہر ایک عضو کو ایک خاص جانور کی مورتی میں رکھا اور عضو خاص کو "بیل" کی صورت دی اور خود گائے کا روپ دھارا، مصر میں گائے بیل کی پوجا ایسی ہی تھی جیسی کہ آج بھی ہندوستان

میں قدیم الایام سے چلی آتی ہے، یہ اشارات فہم و تفہیم کے لیے کافی ہیں۔
کسی وقت ہندوستان میں شیو پوجا اتنی عام تھی کہ آخر میں اس نے "وام مارگ" کی صورت اختیار کی انتہائی بے حیائی کی کوئی صورت ایسی نہیں جو اس کے پوجاریوں کے عقاید کے مطابق اعلیٰ ثواب نہ ہو۔ آج بھی اس کی پوجا عام ہے۔ عوام کا کیا مذکور ہے۔ مشہور کانگریسی لیڈر بال گنگادھر تلک "جنیو" سے ایک لنگا باندھ کر ہر وقت اپنے جسم کے ساتھ رکھتا۔ اس کے پوجاریوں نے "شیو پوجا" کے دقائق اور حقائق بیان کرتے ہوئے وہ وہ فلسفیانہ موشگافیاں کی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی ایک دیوتا قابل پرستش ہے باقی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔
مورخین نے سومناتھ کے مندر کے بارہ میں بہت کچھ لکھا ہے، دس ہزار دیہات کی آمدنی اس کے لیے وقف تھی۔ ایک ہزار برہمن مندر میں شب و روز اس کے گن گاتے تین سو موسیقی دان اور رقاصہ عورتیں اس کے حضور میں گانے بجانے میں مصروف رہتی، تین سو خدمت گار زائرین کے آرام و آسائش پر مامور تھے، راجے اپنی لڑکیاں بھی مندر یا مندر کے پوجاریوں کی خدمت کے لیے دان کرتے۔ اس مندر کی دولت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ زر و جواہرات کا انبار تہ خانوں میں لگا ہوا تھا۔ مندر سمندر کے کنارہ پر واقع تھا۔ بحر کا پانی اس کی بلند دیواروں سے ٹکراتا۔ عمارت سادہ قلعہ نما تھی۔ سقف کو چھپن ستون سہارا دیتے تھے کہتے ہیں کہ ستونوں کی لکڑی افریقہ سے درآمد کی گئی تھی۔ مندر اہرام مصر کے نمونہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے عام مندر مصری اہرام کی طرح مخروطی شکل کے ہیں۔ کلس سونے کا تھا۔ آفتاب کی کرنیں اس پر پڑتی تو

میلوں تک ایک شعلہ نظر آتا تھا جس کی چمک آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتی تھی۔

ان ایام میں غزنی سے سومناتھ تک سلطان محمود کی یورش بجائے خود ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی نسبت گبن لکھتا ہے کہ "ہینی بال" کی یلغار کوہ پرینیز پر ہیچ ہے۔ اس راستہ میں جو مقامات ملتان سے سومناتھ تک پڑے تو ہمعصر شاعر فرخی اپنے قصیدہ میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

بداں راہ اندر چنداں حصارہائے بزرگ
خراب کرد و بکند اصل ہر یک از بن و بر

سلطان کے راستہ میں جو بھی بلند دیواریں قلعوں کو احاطہ ڈالے تھیں مسمار اور بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیں۔

نخست "لاوردہ" کز روئی برج و بارہ او
چو کوہ کوہ فرو ریخت آہن و مرمر

سب سے پہلے "لادرا" کا قلعہ تھا جس کے برج اور مورچے سے لوہا اور سنگ مرمر لڑھکتے ہوئے نیچے اس طرح گر رہے تھے جیسے پہاڑوں سے پتھر

حصار او قوی و بارہ حصار قوی
حصاریاں ہمہ برساں شیر شرزہ نر
مبارزانی ہمہ دست و لشکری ہم پشت
دو تگ پیشہ بعز و شتاب کاریگر

فصیل قلعہ اور قلعہ دونوں مضبوط اور اہل قلعہ شیر نر کی طرح گرج رہے تھے، لڑاکے سپاہی دست بدست اور پشت بر پشت ایک دوسرے کی مدد کے لیے صف آرا تھے نقل و حرکت میں رفتار دھیمی مگر کارزار میں تیز تھے۔

چو "چکودر" کہ صندوقہای گوہر یافت
بکوہ پایۂ آن شہریار شیر شکر

دوسرا مقام "چکودر" راستہ میں آیا کہ
یہاں جواہرات سے بھرے ہوئے
صندوق شیر شکار سلطان نے اس
پہاڑی کے دامن میں پائے۔

چگونہ کوہے چونانکہ از بلندی او
ستارگان را تو گوئی فرو دارست مقر

اس پہاڑ کی بلندی کا منظر میں کیا
بتاؤں تو دیکھ کر کہے گا کہ آسمانی ستارے
اس کے نیچے قرار پائے ہوئے ہیں

چو نہروالہ کہ اندر دیار ہند بہیم
بر نہروالہ ہمی کرد بہر شاں مفتخر

اس (چکودر) کے آگے نہروالہ تھا
اس کا راجہ بھیم دیگر راجگان ہند
پر اس کی وجہ سے فخر کرتا تھا۔ بھیم
اس کی عظمت و شان کو ہند میں کوئی
شہر اور راجہ نہ پہنچ سکا۔

دویست پیل و کمابیش صد ہزار سوار
نود ہزار پیادہ مبارز و صفدر

نہروالا راجہ بھیم کے پاس دو سو ہاتھی
اور ایک لاکھ سوار کم و بیش اور نوے
ہزار پیدل فوج ہر ایک سپاہی جنگجو
اور صف شکن تھا۔

ہمیشہ رائے بھیم اندر مقیم و نعیم
نشستہ ایمن و دل پر نشاط و تازہ و تر

رائے بھیم نہروالہ میں داد عشرت دے
رہا تھا اور خوش و خرم اس کی زندگی
مزے سے بیٹھا بسر کرتا۔

چو مندھیر کہ مندھیر حوضے بود
چنانکہ خر یا شدے اندرو در چشم نگر

رائے کو نیچا دکھانے کے بعد سلطان
مندھیر کی طرف بڑھا، یہ ایک حوض کا

عالم ہے جسے دیکھ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

چگونہ حوضی چنانکہ ہر چہ اندیشم
نمی توانم گفتن ستائش اندر خور

اس تالاب کی نسبت کیا کہوں جہاں تک غور کرتا ہوں اتنا ہی اس کی اعلیٰ صفت جس کا یہ مستحق ہے بیان نہیں کر سکتا۔

فراخ پہنا حوضے بعد ہزار عمل
ہزار بت کدہ خود کردہ حوض اندر

یہ اتنا کشادہ تھا کہ کاریگروں نے اپنے فن کا کمال یہ دکھایا تھا کہ ہزار بتخانہ اس کے اندر تعمیر کیا ہوا تھا۔

دگر چو دیولواڑہ کہ ہم چو دیو سفید
بدید بود برافراشتہ میاں گذر

(اس کی تسخیر کے بعد سلطان) دیلواڑہ پر بڑھا جو سفید دیو کی طرح راستہ میں سر اٹھائے ہوئے نظر آتا تھا۔

یکے حصار قوی بر کراں و شہر درو
ز بت پرستاں گرد آمدہ یکے محشر

اس کے ایک کنارہ پر مضبوط قلعہ اور شہر تھا اور شہر میں بت پرستوں کا جم غفیر جمع تھا۔

بکشتن مردم و بت خانہا بکرد و سوخت
چنانکہ بتکدہ دارنی و تھانیسر

لڑائی میں کشت و خون اور بت خانوں کو آگ لگا کر خاک کے برابر کر دیا جیسا کہ دارنی اور تھانیسر کی لڑائیوں میں بت خانوں کا حال ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرخی اس مہم میں سلطانی فوج کے ساتھ تھا وہ ان مقامات کے حالات چشم دید بیان کرتا ہے۔ ملتان اور سومنات کے

درمیانی راستہ میں وہ پانچ مقامات کا بالخصوص ذکر کرتا ہے۔ "لودھر
جیسلمیر کے شمال کی مغربی جانب دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سلطان
محمود نے حملہ کے وقت بھاٹی یادو راجہ راج کرتا تھا۔ پالن پور کے شمال
میں سترہ میل کے فاصلہ پر "چیکو لودرہ" واقع ہے۔ جسے آج "پٹن" کہتے
ہیں نہر والہ سے موسوم تھا۔ یہ احاطہ بمبئی کے ضلع احمد آباد میں واقع
ہے۔ پٹن سے اٹھارہ میل جانب جنوب "منڈھیرہ" ہے۔ اس شہر کے
اب کھنڈر ہی باقی ہیں اور اس کے آثار سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ کسی وقت
بارونق وسیع شہر تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا تالاب بھی ہے اس کے اندر
وہ بت خانے چھوٹے بڑے تھے جس کا ذکر فرخی کرتا ہے۔ موجودہ دلوا
کی اصل "دیول واڑہ" ہے۔ "ادنا" اور جزیرہ "دیو" کے درمیان سومناتھ
چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

سلطان ۱۴ ذوالقعدہ ۴۱۶ھ / ۱۰۲۶ء کے دن سومناتھ کے سامنے نمودار
ہوا۔ قلعہ نما مندر کی دیواروں پر اہل قلعہ یا مندر کے محافظ اس طرح کھڑے
دیکھ رہے تھے گویا یہ ایک تماشہ ہے، قلعہ کی سنگین دیواریں سمندر
کے کنارہ پر وقار کے ساتھ سر اٹھائے ہوئے تھیں۔ سلطان کی یورش
کا علم گردونواح کے راجگان کو بھی ہو چکا تھا اس لیے اپنی اپنی سپاہ کے
ساتھ مندر کی حفاظت کے لیے جمع ہو چکے تھے اگرچہ پوجاری کہہ رہے
تھے کہ "سوم ایشور" ملیچھوں کو اس جگہ لایا ہے کہ آج تک جتنے مندروں
پر حملہ کیا اور دیوتاؤں کی مورتیوں کی بے حرمتی کی اس کو مجموعی سزا دی جائے
مگر قلعہ دار جی چھوڑ چکا تھا۔ چپکے سے ایک جزیرہ میں پناہ گزین ہوا
اور سلطان کی واپسی تک یہاں نہ آیا۔ مگر اور راجے اور ان کی سپاہ موجو

بھی سے کھلے میدان میں مقابلہ کی تاب نہ لائے تو قلعہ میں محصور ہو گئے۔
تین دن محاصرہ قائم رہا آخر قلعہ سر ہو گیا۔ سلطان مندر میں داخل ہوا۔
اس کے ہاتھ میں گرز تھا۔ ایک ہاتھ مورتی پر بھی صاف کیا۔ یہ سونے
کا لنگا تھا اور مجوف تھا۔ مندر سے مال غنیمت اتنا ہاتھ آیا کہ اس کا
اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سلطان کے حصہ میں دو کروڑ دینار آئے
(ایک کروڑ پانچ لاکھ پونڈ) فتح سومناتھ کے بعد سلطان نے جزیرہ نما
کاٹھیاواڑ کے راجوں کو اطاعت کے لیے لکھا۔ بعض نے سر تسلیم خم کر دیا،
اور بعض نے بھاگ کر جان بچائی۔ سلطان ۱۰ صفر ۴۱۷ھ / ۲ اپریل ۱۰۲۶ء کے دن غزنی
میں داخل ہوا۔ اس مہم پر وہ ۲۲ شعبان ۴۱۶ھ / ۱۸ اکتوبر ۱۰۲۵ء غزنی سے روانہ ہوا تھا۔ قریباً
نو ماہ اس مہم پر صرف ہوئے۔ فتح سومناتھ سلطان محمود کی زندگی کا
عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس لیے کہ غزنی سے پہاڑوں اور دریاؤں اور
ریگستانوں کو لاؤ لشکر کے ساتھ طے کرنا ان ایام میں ناممکن نہیں تو مشکل
ترین مہم خیال کی گئی تھی۔ اس لیے اس کی فتح کی خبر جب خلیفہ بغداد
القادر باللہ کو ملی تو پہلے خطاب یمین الدولہ امین الملۃ پر اضافہ کہف الدولہ
و موید الملۃ کیا۔ اور سلطان کے بیٹوں میں سے امیر مسعود کو شہاب الدولہ
جمال الملۃ اور امیر محمد کو جلال الدولہ و جمال الملۃ اور امیر یوسف کو عضد الدولہ
و موید الملۃ سے ملقب کیا۔

سلاطین اسلام کے دور دورہ میں بلکہ برطانوی گورنمنٹ کے تحت
بھی یہ ملک مسلمان نوابوں کی عملداری رہا۔ تقسیم ہند کے بعد بھارت نے
اس پر بزور قبضہ کر لیا۔

سلطان محمود کی لشکر کشی کے حالات بیان کرنا ہمارا مقصد نہ تھا۔ ہم نے چند معرکوں کا ذکر کیا ہے تاکہ یہ تذکرہ اس عنوان کے تحت خالی نہ رہے ہم نے مشاہیر اسلام میں سے چند شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے اور یہ ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے کچھ کام کرکے دکھایا۔ اور عالم انسانی کی ذہنی اور مادی ترقی کو تقویت دی یا انقلاب پیدا کیا۔ ان میں سے سلطان محمود ایک ہے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں اور بے جا بھی نہیں کہ ہندوستان میں دس کروڑ نفوس مسلمان نہ ہوتے اگر سلطان اشاعت اسلام کے لیے راستہ صاف نہ کرتا۔ اگر سلاطین اسلام جو سلطان کے بعد آئے سلطان کے دل و دماغ کے آدمی ہوتے تو جس طرح افغانستان اور وادی سندھ اور بلوچستان میں خالص مسلم آبادی ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت تھوڑے عرصہ میں نظر آتی۔ اور اگر یہ نہ بھی ہوتا تو پنجاب کی طرح اکثریت ضرور ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعد میں جو بھی سلاطین ہوئے بالخصوص شاہان خاندان مغلیہ ان کے دربار میں نہ صرف اشاعت اسلام رک گئی بلکہ اس میں ضعف بھی آیا۔ ہندوستان میں پنجاب پہلا ملک ہے جس کو سلطان نے اپنی مملکت میں شامل کیا۔ ہم بیان کر آئے کہ ہندو کیوں اسلام قبول کرتے گئے مسئلہ چھوت چھات نے ان کو خود بخود اسلام کے آغوش میں ڈال دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر آریا ہند نہ تھے اکثر وہ قومیں تھیں جو ہندوستان میں فاتحانہ انداز سے زمانہ نامعلوم سے داخل ہوتی رہیں۔ ان میں مصری اور شامی اور عراقی اور ایرانی اور تورانی اور مغل اور ترک بھی تھے۔ مگر برہمن کے زیر اثر آچکے تھے۔ برہمنوں نے ان کو کبھی نہ برہمن اور نہ چھتری اور نہ ویش میں جگہ دی اور

نہ اپنی کسی آریائی ذات میں شامل کیا۔ البتہ ان کی ایک نئی " جاتی " راجپوت اختراع کی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں بدھ مت کا زیادہ زور رہا ہے۔ ان کے مذہب کا اصل اصول " اہنسا پر مو دھرما " ہے، یعنی کسی کو آزار نہ دینا ہی اعلیٰ دھرم ہے۔ چنانچہ خلافت امویہ کے تحت جب مسلمان وادی سندھ اور ترکستان کی طرف بڑھے تو ان لوگوں نے کہیں مقابلہ نہیں کیا۔ برہمن ان کو پہلے ہی ہندو دھرم سے خارج کر چکا تھا۔ بلکہ انہی غیر آریا راجپوتوں کی مدد سے ہندوستان میں ان کا قلع قمع بھی کر چکا تھا۔ اسلام کی سرپرستی ان کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ اس لیے بعض انگریز مورخین کا یہ الزام کہ ہندوستان میں اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا محض ایک سیاسی مقصد کی تکمیل کے لیے تراشا گیا۔ دین ایک ایسی شے ہے کہ کبھی بزور شمشیر نہیں پھیل سکتا۔ اور ویسے بھی اصولاً جبری ایمان و عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ سلطان محمود پر یہ الزام کہ وہ محض سرکش راجوں اور راجپوتوں کو بزور شمشیر اسلام کا غلام بنانا چاہتا تھا۔ غلط ہے۔

فردوسی طوسی

دوسرا الزام سلطان پر بخل کا ہے۔ فرشتہ اپنی تاریخ میں سلطان محمود کے تذکرہ کے ضمن میں لکھتا ہے کہ " یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس سلطان والا شان سے بخل کو منسوب کرنا عزیزاں روزگار کی بے انصافی ہے۔ بلاشبہ وہ زردوست تھا اور خزانہ بھی اس کے پاس جمع رہتا تھا لیکن فتح بلاد میں دل کھول کر خرچ کرتا، کتاب مقالات ابو نصر مشکانی اور مجلدات ابوالفضل کی متفقہ شہادت ہے کہ اس قدر علماء فضلا اور سپاہ (مجاہدین) اس کے

دربار میں جمع ہوتے تھے اور اس کے خوان جود اور مائدہ احسان سے بہرہ مند ہوتے کہ ایسے عمائد کسی اور بادشاہ کو کم نصیب ہوئے اور نہ ہوں گے، اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ امر بدوں درم و دینار میسر نہیں ہوتا۔ اہل حیثیت اور وضعداروں کو دوست رکھتا اور مورد انعام فرماتا۔ انعام کے علاوہ وظائف سالانہ بھی مقرر کیے ہوتے تھے، دو چیزیں سلطان کے بخل کی تشہیر کا موجب ہوئیں۔ ایک قصہ فردوسی کا اور دوسرے توانگروں سے بے سبب زر بزور لینا۔ فرشتہ نے ان دونوں باتوں کی تردید نہیں کی۔ اس لیے اس کے زمانہ تک بلکہ ہمارے زمانہ تک جو بھی قصے سلطان بلکہ دشمنان دین نے گھڑے اور ان کو نظم و نثر میں شہرت دی تاریخی واقعات کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، ہم ایک تاریخی واقعہ قرمطیوں کا بیان کر چکے ہیں کہ ان کے ظلم و ستم اور قتل و غارت نے دنیائے اسلام میں اس حد تک ہیجان پیدا کر دیا تھا کہ خود خلفائے بنو فاطمہ جن کے یہ داعی تھے بیچ اُٹھے بلکہ ایک خلیفہ نے تو یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ قرمطی جہاں ملے مارا جائے۔ یہی کام سلطان محمود نے کیا، ملتان میں قرمطیوں کے خون سے ہاتھ اس حد تک رنگے کہ لڑائی کے بعد قبضہ شمشیر ہاتھ سے جدا نہ ہوتا تھا۔ پانی گرم کر کے خون بار بار دھویا گیا تب ہاتھیوں کی نسیں نرم پڑیں۔ سلطان نے بھی یہی اعلان کر دیا تھا۔ کہ قرمطی جہاں بھی ملے مارا جائے اور جس حال میں ملے مارا جائے۔ سلطان کی زندگی تو یہ لوگ دبے

رہے۔ لیکن جب سلطنت غزنویہ کو زوال آگیا۔ تو ان لوگوں نے سلطان کے متعلق افسانے گھڑنے شروع کیے۔ یہ حقیقت بھی دل نشین کرنی چاہیے کہ بنو فاطمہ اسماعیلیہ اور شیعیان علی اثنا عشریہ کے عقاید دربارہ استحقاق خلافت ایک ہی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ خلافت کا حق بنو فاطمہ کا ہے، چونکہ سلطان محمود سنی تھا اس لیے دونوں فرقوں کے نزدیک اس کی حیثیت ایک اجنبی تھی۔

ایک قرمطی سلطان کے بجٔی کی، ہجو کرتا ہے کہ ؎

نبودش ز فضل و سخاوت شرف ۔۔۔ نگہ داشتے در لبان صدف

خزائن بسے داشت پر از گہر ۔۔۔ و لے زاں نشد مفلسے بہرہ ور

فردوسی کے متعلق یہ افسانہ مشہور ہے کہ سلطان نے خود اس کو "شاہنامہ" کی تصنیف پر مامور کیا اور وعدہ یہ تھا کہ فی شعر ایک اشرفی دونگا بے چارہ شاعر تیس برس شاہنامہ لکھتے لکھتے بوڑھا ہو گیا جب کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی تو وعدہ سے پھر گیا اور اشرفی کی جگہ ایک روپیہ فی شعر دینے لگا۔ فردوسی نے یہ صلہ ٹھکرا دیا۔ شاہنامہ کے اشعار کل ساٹھ ہزار ہیں، ساٹھ ہزار روپیہ فردوسی کی نظروں میں نہ جچا، ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ "ملٹن نے دو مجلدات میں " پیراڈائس لوسٹ اور ریگینڈ" لکھی اس رقم سے نصف لینے پر رضامند تھا۔ سلطان کی وفات ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ ۲۲ اپریل ۱۰۳۰ء میں واقع ہوئی، مدت سلطنت پینتیس برس تھی، اگر فردوسی شاہنامہ تیس برس تک لکھتا رہا تو ظاہر ہے کہ سلطان کی تخت نشینی کو پانچ برس گذرے تھے کہ شاہنامہ کی فرمائش کی، حالانکہ پہلے پانچ سال تو اس کو ابائی مملکت کے اندرونی خرخشوں سے فرصت نہ ملی۔ اور اس کی شہرت ابھی غزنی کے پہاڑوں سے باہر دور تک نہ پھیلی تھی۔ مورخین نے سلطان محمود

کے درباری شاعروں میں جہاں ملک الشعرا حکیم عنصری اور منوچہر بلخی، غضایری رازی اور عسجدی مروی اور فرخی کا نام بنام ذکر کیا ہے، فردوسی بلکہ ان کے استاد اسدی طوسی کو درباری شعرا میں شمار نہیں کیا۔ اسدی اور فرخی دونوں عنصری کے شاگرد تھے،

تاریخ اور شاہنامہ کی داخلی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کے استاد اسدی طوسی کے چار ہزار ابیات اور دقیقی کے ایک ہزار ابیات شاہنامہ میں شامل ہیں۔ اس موضوع پر میرا ایک مقالہ ماہنامہ ایشیا (امرتسر) میں زیر ادارت حکیم محمد فیروز الدین طغرائی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ یہی مقالہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (مطبع وکیل امرتسر) زیر ادارت مولوی عبداللہ انصاری ۱۹۰۹ء میں اور پھر کتابی صورت میں زیر عنوان مشاہیر اسلام ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا۔ میرے ایک ہمعصر نے میری تحقیق کو اپنایا اور اپنے نام پر شہرت دی، خدا بخشے فوت ہو چکا ہے۔ اس مقالہ کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ قطعی داخلی شہادت شاہنامہ کی ہے۔ فردوسی کی زبانی سنئے کہ وہ شاہنامہ کی تصنیف کے بارہ میں کیا کہتا ہے۔

فردوسی کہتا ہے کہ ؎

من ایں نامۂ فرخ گرفتم بہ فال ۔۔۔ ہمی رنج بردم بہ بسیار سال
ندیدم سرافراز بخشندہ ۔۔۔ بگاہ کیاں بر دخشندہ

فردوسی جب کئی سالوں کی کاوش کے بعد شاہنامہ لکھ چکا تو اس نے دیکھا کہ شاہاں ایران کے تحت کیانی خاندان کے تخت کا کوئی وارث نظر نہیں آتا۔ شاہنامہ میں انہی شاہاں ایران کا تذکرہ ہے، اور اگر ان کی نسل میں سے کوئی وارث تخت و تاج ہوتا تو فردوسی کو اس کی محنت اور حسن عقیدت

کا حلہ خاطر خواہ ملنا۔ روایت تو یہ ہے کہ فردوسی تیس سال کے طویل عرصہ تک شاہنامہ لکھتا رہا۔ مگر وہ خود کہتا ہے کہ ؎

سخن را نگہداشتم سال بیست — بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میں شاہنامہ ختم کر چکا تھا تو بیس سال تک اس تلاش میں رہا کہ اس گنج شاہگاں کا خریدار کون ہو سکتا ہے، تخت کیاں تو خالی نظر آیا۔ اس لئے کسی اور قدرداں جوہر شناس کی جستجو کی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ بیس سال تک لکھتا رہا، ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ ؎

ہمیں گفتم ایں نامہ را چند گاہ — نہاں بد ز کیواں و خورشید و ماہ

فردوسی شاہنامہ مسلسل بیس یا تیس سال تک نہیں لکھتا رہا۔ دنیوی کام کاج بھی تھے، کبھی کبھی جب فرصت ملی لکھتا رہا۔ اگر شاہنامہ کے ابیات آٹھ ہزار شعر ہوں تو تیس سال کے عرصہ میں روزانہ پانچ ابیات ہوتے ہیں۔ ابیات وہ بھی مثنوی میں جس کے مضامین پہلے بھی قصص کی صورت میں مشہور تھے اور پانچ یا آٹھ روزانہ لکھنا کون سی بڑی بات ہے فردوسی بہت پایہ کا شاعر ہے۔ اس کو پیغمبر سخن کہتے ہیں ؎

سہ کس بر سخن پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

فردوسی کے نادان دوستوں نے ایک ایسا اختراع کیا ہے جس میں ذرا بھی معقولیت نہیں اور اس کو اعلیٰ پایہ سے گرا دیا ہے۔ وہ ایک کرایہ کا ٹٹو رہ جاتا ہے کہ انعام و اکرام کی طمع پر روزانہ پانچ یا آٹھ ابیات انتہائی ذہنی کاوش کے بعد تیس سال تک لکھتا رہا یعنی اس میں آمد

ہی سے آمد نہیں۔ ان ابیات سے واضح ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے لکھا بہ تقاضائے طبیعت ہی لکھا اور زمین و آسمان میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس شغل میں لگا ہوا۔ اگر سلطان کی فرمائش پر لکھتا تو کم از کم اس کے ہمعصر شعرا کو معلوم ہوتا۔ خاتمۂ شاہنامہ پر فردوسی کہتا ہے کہ ؎

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار   کہ گفتم من این نامۂ شاہوار

یعنی ۴۰۰ھ میں میں نے شاہنامہ لکھ کر ختم کیا۔ اگر تیس سال میں لکھا تو اس کا آغاز ۳۷۰ھ میں ہوتا ہے سلطان محمود کے والد امیر ناصر الدین سبکتگین کا انتقال ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ سلطان کی تخت نشینی (۳۸۷ھ) یعنی اٹھارہ سال پہلے شاہنامہ لکھ چکا تھا۔ ایک سال تو سلطان کو اپنے بھائی اسماعیل سے تنازعہ وراثت میں گذرا۔ دوسرا سال اور اندرونی شورشوں نے فرصت نہ دی۔ غرض بیس سال کا عرصہ رہا جاتا ہے اور بیس سال ہی میں فردوسی شاہنامہ لکھ کر ختم کرچکا تھا۔ یہ حساب تو ہم نے بہ تعلق تخت نشینی سلطان محمود لگایا ہے تیس سال ہی فرض کرلو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تخت نشینی سے بہت عرصہ پیشتر شاہنامہ لکھ چکا تھا۔ مگر سخن را نگہداشت تا سال بیست و بیس سال اس تلاش میں رہا کہ یہ نامۂ شاہوار کہاں اور کس قدرداں کے حضور پیش کرے۔

جب سلطان محمود کی شہرت تسخیر ایران و توران و ہندوستان کے شمالی بلاد کی وجہ سے دیار اسلام میں پھیل گئی اور عباسی خلیفہ نے اس کو یمین الدولہ امین الملۃ کے لقب سے افتخار بخشا تو شعرائے عصر بھی اس کے دربار کی طرف کھچے چلے آئے۔ فردوسی جس کی تلاش میں تھا وہ اس

وقت سلطان کی واحد شخصیت تھی۔ چنانچہ اس نے شاہنامہ ایک قصیدہ کے ساتھ جو شاہنامہ کی زمین میں لکھا پیش کیا۔ اس قصیدہ میں وہ ایک خواب کے پیرایہ میں پہلی دفعہ سلطان کے دربار سے روشناس ہو رہا ہے۔ فردوسی لکھتا ہے کہ میں نے خواب میں ایک شخص کو تخت پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے دونوں جانب سپاہ استادہ تھی دریافت کیا ؎

کہ این چرخ و ماہ است یا تاج و گاہ	ستارہ است پیش اندرش یا سپاہ

کہ یہ دربار شاہی ہے یا رفعت و عظمت آسمانی ہے اور یہ تاج پوش تخت نشین شاہ ہے یا ماہتاب اور یہ سپاہ دو رویہ صف بستہ ہے یا ستارے

یکے گفت این شاہ روم است ہند	ز قنوج تا پیش دریای سند
بایران و توران ورا بندہ اند	براۓ الفرمان او زندہ اند

فردوسی "طوس" کے گاؤں "شاداب" نامی کا باشندہ تھا۔ ایران و توران میں سلطان محمود کی فتوحات کا حال تو اس نے سن لیا ہو گا۔ مگر سلطان کی مہمات ہند کی تفصیل سے واقف نہ تھا۔ دریاۓ سندھ کے پار سلطان کے مشہور حملہ قنوج کی شہرت بھی دنیاۓ اسلام میں پھیل چکی تھی۔ اس لیے فردوسی نے بھی خصوصیت سے اس کا ذکر کیا ہے۔

قنوج کے حملہ کے واقعات بالاختصار حسب ذیل ہیں :۔

شعبان ۴۰۹ھ میں گنڈا چندل راجہ کالنجر اور ارجن راجہ گوالیار اور دیگر ریاستوں کی متحدہ فوج نے راجیہ پال راجہ قنوج پر اس لیے حملہ کر دیا کہ اس نے سلطان کی اطاعت لڑنے مرنے کے بغیر قبول کر لی تھی اب یہ دھرم سے خارج ہو چکا تھا۔ لڑائی میں راجیہ پال مارا گیا۔

سلطان کو اطلاع ہوئی تو ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں قنوج پر لشکر کشی کی۔ جب ہندو راجگان
کی متحدہ فوج کا جائزہ سلطان نے میدان جنگ میں ایک بلند مقام پر
کھڑے ہو کر لیا تو ان کی کثرت جمعیت اور جنگی ہاتھیوں کی قطار اور دیگر
ساز و سامان سے کچھ مرعوب ہو گیا۔ فرش خاک پر سر رکھ کر اللہ تعالٰے
کے حضور فتح و نصرت کی دعا کی، اٹھ کر دیکھا کہ ہراول فوج کا عرب دستہ
ابو عبداللہ محمد الطائی کے تحت راجگان کی متحدہ فوج پر حملہ آور ہو رہا
ہے۔ اور سلطانی فوج کے سوار دشمن کے بائیں دائیں بازو پر ٹوٹ پڑے
سلطان دیکھ رہا تھا کہ راجوں کی متحدہ فوج منتشر ہو کر پسپا ہو رہی ہے
سلطان اس مقام سے اتر کر اپنے محافظ دستہ کو لیے ہوئے دشمن پر
حملہ آور ہوا۔ دشمن کے پاؤں اکھڑ ہو گئے۔ اور راجگان نے راہ فرار اختیار
کی۔ سلطان نے تعاقب جاری رکھا۔ پہلے گوالیار کے قلعہ کو محاصرہ میں لیا
ارجن راجہ گوالیار یہاں پناہ گزیں تھا۔ آخر راجہ نے صلح کا پیغام بھیجا
اور پینتیس ہاتھی نذر کیے۔ اس کے بعد سلطان نے کالنجر کا رخ کیا۔ قلعہ ایک
پہاڑی پر واقعہ تھا۔ اس میں پانچ لاکھ سپاہ اور بیس ہزار مویشی
اور پانچ سو ہاتھی موجود تھے۔ سلطان نے اس قلعہ کی ناکہ بندی بھی خاطر خواہ
کی۔ راجہ گنڈا نے دیکھا کہ اتنے نفوس کا سامان خورد و نوش ختم ہو رہا
ہے تو صلح کی طرح ڈالی۔ تین سو ہاتھی نذر کیے اور آئندہ باج و خراج
کا وعدہ کیا۔ اور ایک نظم ہندی سلطان کی مدح میں لکھ کر بھیجی۔ سلطان
نے صلح منظور کر لی اور ۴۱۳ھ/۱۰۲۲ء کو غزنی واپس آیا۔

اس واقعہ سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ جب فردوسی نے قصیدہ
پیش کیا اس وقت سلطان مہم قنوج سے فارغ ہو کر غزنی میں موجود

تھا۔ اس لیے شاہنامہ ۱۴۰۱ھ کے بعد پیش ہوا۔ اگر ہم ان تواریخ کو مدنظر رکھیں تو یہ بات آسانی میں سمجھ میں آسکتی ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ ختم کرنے کے بعد بیس سال تک محفوظ رکھا جب قنوج کے حملہ کے بعد وہ دربار سلطان میں آیا اور شاہنامہ پیش کیا تو خلاف توقع "یمین الدولہ امین الملتہ" پڑھ کر چیں بجبیں ہوا۔ اور کہا کہ خدا داد قابلیت کو تم نے گبروں کے افسانوں پر صرف کیا۔ کیا شاہان اسلام اور خلفاء راشدین کے کارناموں میں ہمیں "رزمیہ نظم کا موضوع نہیں مل سکتا تھا؟ یہ حماقت صرف فردوسی سے سرزد نہیں ہوئی بلکہ ایرانی شعرا کا یہ شیوا رہا ہے کہ وہ فتوحات عرب کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے۔ اور کیانی اور ساسانی شاہان ایران کے گن گاتے رہے یا اغیار کے مشاہیر کا نام اچھالتے رہے نظامی گنجوی کو "خدائے سخن" کہتے ہیں اور بلاشبہ اس کا پایہ شعر و شاعری بہت بلند ہے، اس نے بھی یونانی "ہیرو" سکندر کو اپنی بے نظیر نظم کا موضوع منتخب کیا۔ اسی سے ان کی ذہنیت اور قومی تعصب کا پتہ چل سکتا ہے۔

فردوسی کے بھی حواس ٹھکانے ہو گئے۔ وہ خود ایک قطعہ میں کہتا ہے کہ ؎

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست — کدام دریا کہ آں را کنارہ پیدا نیست

شدم بدریا و غوطہ زدم ندیدم در — گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

اس کے بعد اس نے "یوسف زلیخا" لکھی، شروع میں لکھتا ہے کہ ؎

کنوں گر مرا روز چندے بقاست — بر آں نہ سپرم جز ہمیں راہ راست

اگر زندگی نے کچھ اور دن لگا رکھے ہیں تو میں آئندہ راہ راست

سے بھٹک کر کجروی اختیار نہ کروں گا۔

نگیرم سخن ہائے بیہودہ ہیچ   نگیرم بیہودہ گفتن بسیچ
کہ آں داستاں ہا دروغ است پاک   دو صد زاں نیرزد بیک ذرہ خاک
سخن را مایہ نہ دارد زبن   نہ خوانند خردمند آں سخن
ہمیں گو نہ سودا بخند دو خرد   زمن خود کجا کی لپسند و خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود کم کنم   جہانے پُر از نام رستم کنم

یں آئندہ ایسی بیہودہ گوئی سے معترز رہوں گا، جو کچھ میں شاہنامہ
میں لکھ چکا ہوں وہ محض فسانے ہیں ان کی تاریخی حقیقت کچھ بھی نہیں
ایسی نظم اور شعر جس کی بنیاد کچھ نہ ہو اس کو اہل عقل "سخن" کی تعریف
میں داخل نہیں کر سکتے۔ یہ وحشت جو مجھ پر سوار رہی ہے اس پر
عقل ہنستی ہے اور مجھ سے ایسی نامعقول حرکات کا سرزد ہونا عقل
کب گوارہ کرتی کہ اپنی عمر سے نصف زندگی تو صرف اس بات پر کردں
کہ ایک رستم کا نام یادگار زمانہ رہ جائے" مگر فردوسی اپنی شاعری
شاہنامہ کی نظر کر چکا تھا اور یوسف زلیخا اس لیے بھی مقبول نہ ہوئی کہ
اہل ایران کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

آخر میں مناسب ہے کہ ہم اس "ہجو" کا بھی جائزہ لیں، جو فردوسی سے
منسوب کی گئی ہے اور سلطان کے خلاف کسی ترملی نے لکھی۔ کوشش تو
بہت کی گئی ہے کہ فردوسی کی زبان کا چربہ اتارا جائے اور اس کوشش
میں مصنف ہجو فردوسی کے چند اشعار کے سرقہ کا بھی مرتکب ہوا، شاہنامہ
کے شروع میں حمد و نعت کے بعد فردوسی خلفاء راشدین کی منقبت
میں کہتا ہے کہ ؎

(۱) چو گفت آں خداوند تنزیل وحی	آنحضرت صاحب وحی تھے، آپ صاحب
خداوند امر و خداوند نہی	امر و نہی بھی تھے آپ نے فرمایا
کہ خورشید بعد از رسولاں مہ	کہ آفتاب نبوت اولو العزم انبیا و رسل کے بعد
(۲) نتابید بر کس ز بوبکر بہ	ابوبکر سے بڑھ کر کسی اور پر روشن نہیں ہوا
عمر کرد اسلام را آشکار	عمر نے اسلام کو آشکار کیا
(۳) بیاراست گیتی چو باغ دبہار	جہاں کو باغ و بہار کی طرح آراستہ کیا
پس از ہر دو بود عثمان گزیں	ان دونوں خلفاء کے بعد عثمان کی باری
(۴) خداوند شرم و خداوند دیں	آتی ہے جو صاحب شرم و حیا و صاحب دین ہے
چہارم علی بود جفت بتول	چوتھا خلیفہ علیؓ فاطمہ زہرا دختر آنحضرت
(۵) کہ او را بہ خوبی ستاید رسول	کا شوہر ہے کہ اس کا وصف خود
	رسول کریم بھی بیان فرماتے ہیں
۶۔ کہ من شہر علمم علی در است	وارث ایں سخن قول پیمبر است
۷۔ گواہی دہم تا ایں سخن راز اوست	تو گوئی در گوشم بر آواز اوست

آخری اشعار (۶، ۷) جو حضرت علی کی مدح میں شاہنامہ کے متن میں موجود ہیں ہجو میں بھی بلفظہٖ رکھ دیئے گئے۔ فردوسی اگر ہجو اور حضرت علی کی شان میں منقبت لکھتا تو اس شان کی لکھتا کہ زمانہ میں یادگار ہوتی نہ کہ صرف چند ابیات جو پہلے ہی کہہ چکا تھا دہرا دیتا۔

ہجو کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود نے فردوسی کو بھی قرمطی تصور کیا اس لیے لکھتا ہے کہ

جہاں تا بود تاجداراں بود	پیامم بر شہریاراں بود
کہ فردوسی طوسی پاک جفت	نہ ایں نامہ بر نام محمود گفت

بنامِ نبی و علی گفتہ ام گہرہائے معنی بسے سفتہ ام"

اگر حضرت رسول کریم اور علی مرتضےٰ کی خدمت میں یہ گبری فنا سنے پیش کرتا تو یقیناً اس کو وہی جواب ملتا جو سلطان محمود نے دیا

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی

سلاطین اسلام اول تو خود عالم تھے اور اگر علوم میں زیادہ دخل نہ تھا تو اس میں کچھ کلام نہیں کہ علم دوست ضرور تھے۔ اور ان کے دربار کی زینت زیادہ تر ہر ایک علم و فن کا ماہر ہی تھے وہ جس کسی ایسی ہی شخصیت کا نام سنتے اسے دعوت دیتے، اہل علم و ہنر خود بخود کھچے چلے آتے۔ ان حضرات میں یہ خوبی بھی تھی کہ نہ صرف اہل سیف تھے بلکہ اہل قلم بھی تھے۔ سلطان محمود کے دربار میں ہر ایک علم و فن کے یگانہ روزگار جمع تھے۔ اور اس کی داد و دہش نے ان کو سلطان سے وابستہ کر رکھا تھا۔ شعرا اور ادیب تو بہت تھے اور ان کلام سے سلطان کی فتوحات کا تاریخی مواد جمع ہو سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض حضرات کی تصانیف کا ہمیں دوسرے ذریعہ سے پتہ تو چلتا ہے مگر آج دنیائے اسلام میں مفقود ہیں یہ علمی خزانہ یورپ کے کتب خانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ اور اہل یورپ کبھی کوئی کتاب چھاپ دیتے ہیں تو ہمیں بھی اس کا مطالعہ کا موقع ملتا ہے مناسب تو یہ ہے کہ اسلامی حکومتیں کاتب ان ممالک میں بھیجیں جو ان کتب کی نقول حاصل کریں۔ لیکن کسی اسلامی سلطنت کی توجہ اس طرف

ابھی تک مبذول نہیں ہوئی۔

ابوریحان البیرونی کے حالات کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ اگر اسکی تصنیفات جن میں سے اکثر نہیں ملتیں ہمارے پاس ہوتیں تو انہی سے اس کے سوانح حیات کا بہت کچھ علم ہو سکتا ہے۔ مورخ بھی تھا فارسی تو اس کی مادری زبان تھی۔ اور ان ایام میں ممالک اسلامیہ میں ہر ایک عربی کا بھی عالم تھا۔ اس لیے یہ بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ سنسکرت کا بھی بہت بڑا عالم تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ زبان اس نے کہاں اور کس سے سیکھی۔ ہندوستان میں کئی سال رہا۔ لیکن اس نے سنسکرت ہندوستانی پنڈتوں سے ہندوستان میں رہ کر نہیں سیکھی۔ سنسکرت کا علم صرف برہمنوں میں محدود تھا اور غیر برہمن کو اس کی تعلیم دینا ان میں ممنوع تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب سلطان محمود نے پنجاب مسخر کر لیا۔ تو کئی پنڈت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ انہی سے بیرونی نے بھی اس کا علم حاصل کیا اس کو علم ہیئت سے خاص شغف تھا۔ اگرچہ اسنے دیگر علوم پر بھی عبور حاصل تھا۔ مگر اس کی شہرت اسی علم کی وجہ سے ہے۔ اسے معلوم تھا کہ علم ہیئت اور فلسفہ اور ہندسہ میں اہل ہند اپنی آپ ہی نظیر تھے۔ اور ان کے شاستروں کا مطالعہ سنسکرت کے علم کے ساتھ ہی ممکن تھا بیرونی نے غزنی میں رہتے ہوئے سنسکرت سیکھی اور ان شاستروں کا بھی مطالعہ بنظر غائر کیا۔ غالباً تکمیل کے لیے وہ پھر ہندوستان میں آیا وہ خود لکھتا ہے کہ جب اس موضوع پر یہاں کے پنڈتوں سے مکالمہ ہوتا اور میں بعض اغلاط بھی شرح و بسط سے بتاتا تو وہ سخت حیران ہو کر پوچھتے کہ آپ نے یہ علم کس پنڈت سے سیکھا ہے۔

بیرونی خوارزم (خیوا) کا باشندہ تھا۔ لیکن بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیبل، واقع وادی سندھ میں ۳۶۲ھ/۹۷۳ء میں پیدا ہوا۔ اگر یہ صحیح ہو تو وہ بسہولت سنسکرت سیکھ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں بیرونی سے پیشتر بھی علمائے اسلام ایسے گذرے ہیں جو سنسکرت کے عالم تھے اور بعض کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کر چکے تھے جو بیرونی کے زیر مطالعہ رہیں۔ ترجمہ کا کام ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جسے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ لیکن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، کئی پنڈت ان ایام میں حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔

معلوم نہیں کہ علم کی تشنگی اسے وادی سندھ سے پنجاب کے دریاؤں کے کناروں اور وادی گنگا اور جمنا میں لے گئی یا اس کے علاوہ کچھ اور سیاسی اغراض بھی تھیں۔ بیرونی ہیئت کے علاوہ جغرافیہ کا بھی عالم تھا اس لئے شمالی ہندوستان کے بعض مشہور شہروں کا جائے وقوع ان کے طول و عرض بلد کے ساتھ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ سلطان محمود کو ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ جو ان شہروں کا صحیح مقام اور آمد و رفت کے راستے بتائے۔

بیرونی کی تاریخی تالیف "آثار الباقیہ" سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ والئ جرجان شمس المعالی قابوس کے مقربین میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں آل سامان سے وابستہ ہو گیا۔ لہٰذا اس خاندان کے نویں تاجدار منصور ثانی (۳۸۹ھ/۹۹۹ء) ابن نوح ثانی (۳۸۷ھ/۹۹۷ء) کی سرپرستی میں وہ فراغت سے تحصیل علم میں مشغول رہا لیکن منصور کی شاہی بھی دولت مستعجل تھی۔ امرائے دربار کی باہمی رقابت اور بعض نمک حراموں کی سازش سے نظام سلطنت

درہم برہم ہو گیا۔ انہوں نے منصور کو معزول کر کے آنکھیں نکلوا دیں اور اس کے بھائی عبدالملک کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ امراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ سلطان محمود غزنوی سے لڑائی چھیڑ دی محمود نے اسے شکست فاش دی۔ یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے کہ آل سامان کے پانچویں تاجدار نوح ($\frac{۳۳۱}{۹۴۲}$ھ) کا بیٹا عبدالملک ($\frac{۳۴۳}{۹۵۴}$ھ) تخت نشین ہوا تو اس کی افواج کا سپہ سالار اس کا غلام الپتگین تھا۔ عبدالملک فوت ہوا تو امراء دربار عبدالملک کے بھائی منصور کے حق میں تھے مگر الپتگین خلاف تھا۔ منصور بادشاہ ہوا تو الپتگین کو بھاگنا پڑا اس نے غزنی کے پہاڑوں میں پناہ لی۔ اسی کے غلام اور داماد اور جانشین سبکتگین نے خاندان غزنویہ کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ سلطان محمود اسی کا بیٹا ہے خاندان غزنویہ کو آل سامان کا احترام ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا جب نوح ثانی اپنے باپ منصور کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تو نمک حرام امراء دربار کی سازش کی وجہ سے خراسان اور جرجان اور طبرستان ہاتھ سے نکل گئے حالانکہ تمام علاقہ ماوراء النہر اس کے قبضہ میں تھا نوح ثانی نے سبکتگین کو مدد کے لیے لکھا وفادار غلام نے اس وقت تک خود مختاری کا اعلان نہ کیا تھا اور اپنے آپ کو آل سامان کے تحت ہی سمجھتا رہا۔ اس نے اپنے بیٹے محمود کو مدد کے لیے بھیجا اس نے دشمنوں کو پے در پے شکست دے کر پھر سے نوح کو ماوراء النہر کی بادشاہت دلوائی، لیکن نوح ثانی کی تخت نشینی پر امراء کی پھر بن آئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ سلطان محمود ہی سنگ راہ ہے۔ لیکن جب لڑائی چھڑی تو آل سامان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور یہ علاقہ غزنوی مملکت میں شامل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی درباری علماء حکماء بھی دربار

غزنوی میں منتقل ہو گئے۔ ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی غزنی میں کچھ بہت عرصہ نہیں ٹھہرا۔ خود سلطان محمود کا قیام بھی غزنی میں سال بھر میں بمشکل چند ماہ مسلسل رہا ہوگا۔ وہ پا بہ رکاب ہی نظر آتا ہے۔ اس کے ہمراہ عموماً اہل قلم و سیف بھی رہتے، بلکہ شعراء دربار بھی ساتھ رہتے۔ ہر ایک حملہ اور فتح کی تقریب پر قصیدے لکھتے جس میں ان واقعات کا بھی مذکور ہوتا۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد بیرونی سلطان کے بیٹے ناصرالدین اللہ مسعود (۴۲۱ تا ۴۳۲ھ / ۱۰۳۰ء) کے دربار میں نظر آتا ہے اسی کے نام پر اس نے "قانون المسعودی" لکھی۔ بیرونی کا انتقال ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸ء میں غزنی میں ہوا اور یہیں مدفون ہوا۔

بیرونی کی مشہور کتاب "کتاب الہند" ہے، یورپ کی علمی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ابن بطوطہ یا مسعودی وغیرہ کا سفرنامہ نہیں بلکہ ان ایام میں جو کچھ ہندوؤں کی معاشرتی زندگی تھی اس کا صحیح نقشہ اس نے کھینچ کر رکھ دیا ہے اور اس سے بہتر و معتبر تاریخ کسی عینی شاہد کی نہیں ملتی۔ اس نے غائر نظر سے یہاں کے مذاہب اور ان کے رسم و رواج اور معاشرتی زندگی بالخصوص علوم ہیئت اور فلسفہ کا مطالعہ کیا اس کا مفصل مذکور اس کی کتاب تحقیق الہند میں ہے بیرونی اگرچہ ہندوؤں کی ذہانت اور ان کے علم و فن کا مداح ہے مگر بعض باتیں ایسی بھی تھیں اور آج بھی ان کی شہادت موجود ہے جو اس کے اپنے نقطۂ نگاہ میں بحیثیت مسلمان مذموم تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ صنف ضعیف کی درگت جو یہاں ہو رہی ہے انتہائی مذموم ہے۔ "ستی" کی

انسانیت سوز رسم عام ہے۔ بیوہ اپنے متوفی شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلائی جاتی ہے۔ بیان یہ کیا جاتا ہے کہ اسے اپنے خاوند کا عشق مجبور کرتا ہے اس کی فرقت گوارا نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے سوا اس کا اور کوئی سرپرست بھی نہیں۔ اس لیے بخوشی خاطر آگ کی بھینٹ ہو جاتی ہے۔ لیکن کوئی مرد اپنی زوجہ متوفیہ کے ساتھ جل کر اس "ست دھرم" کا ثبوت نہیں دیتا۔ صغرسنی میں شادی عام ہے۔ حکماء و علماء ہند تو توحید کے قائل ہیں مگر عوام مورتی پوجا کرتے ہیں۔ برہمن خواہ کسی جرم کا مرتکب ہو سنگین سزا سے بری ہے۔ راجہ اور برہمن معصوم سمجھے جاتے ہیں۔ (نرکلنک) برہمن کسی قسم کا مالیہ ادا نہیں کرتے۔ شمالی ہند میں کچھ خود مختار ریاستیں کشمیر اور سندھ اور گجرات اور مالوہ اور قنوج اور بنگال میں ہیں اور ان کے تحت چھوٹے چھوٹے راجہ اور رئیس ہیں۔

بیرونی کتاب الہند میں علم ہیئت اور ریاضی اور جغرافیہ اور تقدیم اور طبعیات پر بھی سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اور ان کی غلطیوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

ایّو ایاز

سلطان محمود اور ایاز کے بارہ میں تذکروں اور شعرا کے کلام میں فسانے مذکور ہیں، بات تو صرف اتنی ہے کہ سلطان کے پاس ہزاروں غلام تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر حسن و جمال رکھتا تھا۔ ان میں سے ایاز بھی ایک تھا۔ مگر جو بات اس میں تھی وہ کسی اور میں نہ تھی۔ بلکہ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ فراست میں اکثر امراء دربار بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ سلطان کا منظور نظر تھا۔

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہو یں بلندی منزلت
کہ براں مکاں چو ندم بنی خم گردشے نخورد سرت

ایاز تو آخر ایک غلام ہی تھا۔ ہم نے اکثر ایسے سنے دیکھے ہیں کہ اگر فلک سفلہ پرور نے انہیں مال و جاہ دے دیا تو بھول جاتے ہیں کہ وہ کیا تھے۔ وہ اپنے پرانے احباب سے ملنا بھی عار سمجھتے ہیں۔ ایاز کی نسبت ایک روایت مشہور ہے کہ چونکہ سلطان کا منظور نظر تھا۔ اس لیے دربار میں اکثر امرا بھی حسد کے مارے جل بھن کر کوئلہ ہو رہے

نخے اور اس تاک میں تھے کہ موقعہ ہاتھ لگے تو اسے نیچا دکھائیں۔ ایاز کبھی کبھی خزانہ شاہی میں بھی جایا کرتا۔ حاسدوں نے خیال کیا کہ ضرور چوری کرتا ہے سلطان کے پاس جڑ دی۔ سلطان نے کہا کہ جب ایاز اس طرف جائے مجھے خبر کرنا۔ ایک دن ایاز خزانہ کے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا کہ حاسد سلطان کو وہاں لے آئے۔ سلطان نے چھپ کر دیکھا کہ ایاز ایک کمرہ میں داخل ہوا۔ اور ایک صندوق کھولا۔ حاسد بھی ہمراہ تھے۔ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج چور پکڑا گیا۔ ایاز نے اس صندوق سے کپڑے نکالے جو پھٹے پرانے تھے۔ اپنا درباری لباس اتار کر یہی کپڑے پہنے اور اپنے آپ کو کچھ دیر ان کپڑوں میں دیکھتا رہا۔ آخر کہا کہ

"ایاز قدر خود بشناس"۔ تو اس حال میں تھا جب سلطان کے حضور آیا۔ اور آج تو اس لباس میں ملبوس ہے (درباری لباس کی طرف اشارہ کیا) حاسد تو وہیں زمین میں گڑ گئے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر ایاز کو گلے سے لگا لیا۔

یہ فقرہ کہ "ایاز قدر خود بشناس" ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اور بات بھی یہی پسندیدہ ہے کہ انسان کو کبھی ایسے بلند مرتبہ کی ہوس نہ کرنی چاہیئے کہ جب اس مقام پر پہنچے تو سر چکرا جائے۔ ایسے عالی فطرت بھی ہوتے ہیں کہ تواضع کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست　　گدا گر تواضع کند خوئے اوست

غرض یہ سیرت کی پاکیزگی تھی جس نے سلطان کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ حسن صورت کے لحاظ سے تو اور بھی بہت تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سلطان

ایاز کے کان میں سر دربار کچھ کہا۔ جب دربار برخاست ہوا بعض مقربین
ایاز سے پوچھا کہ سلطان نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ جواب دیا کہ سلطان سے
پوچھو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں جرأت نہیں۔ جواب دیا کہ اتنا تو سوچو کہ اگر کوئی
بات ہوتی جو سلطان تمہیں بتانا چاہتا تو میرے کان میں نہ کہتا۔ اور
یقین ہے کہ کوئی بات ایسی ہی رازدارانہ تم میں سے کسی وقت کسی کے
ن میں کہے تو مجھے بھی آگاہ نہ کروگے۔
رز مملکت خویش خسروان دانند۔
شیخ عطارؒ جن کی بزرگی کے عارف رومی اور تمام متاخرین مداح ہیں
ود ایاز کے پیرایہ میں درس عشق دیتے ہیں "خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں،
گفتہ آید در حدیث دیگراں" یہ واقعات خواہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے صحیح
ہوں مگر بلحاظ نتائج سبق آموز ہیں اور یہی بات شیخ عطارؒ اور دیگر
عراء ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک حکایت اس طرح بیان
ماتے ہیں کہ

ایک دفعہ سلطان محمود ایک غلام کی کسی حرکت ناشائستہ پر غضب
اک ہوا۔ اور اس کے قتل کا حکم دیا۔ ایاز موجود تھا اسے کہا کہ تم تھوڑے
رصہ کے لیے مجلس سے باہر چلے جاؤ۔ غرض یہ تھی کہ ایاز قہر سلطانی کو
دیکھ کر آزردہ نہ ہو۔ ایاز نے تو آج تک مہر و محبت کے سوا اور کچھ
سلطان کی جانب سے مشاہدہ نہ کیا تھا۔ عرض کی کہ کتنا خوش نصیب
وہ غلام ہے کہ بادشاہ اس کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ یہ بات
میرے نصیبا میں نہ ہوئی۔

کار من بنگر کہ روز سے چند بار | میری حالت دیکھ کہ ہر روز کئی
کشتم از تیغ ہیبت کشتہ زار | اس کی تیغ ہیبت سے قتل ہوتا
با ادب در پیش سلطان دم زدن | سلطان کے حضور مودبانہ بات کر
سخت تر باشد ز صد گردن زدن | سو گردن کاٹنے سے بھی سخت ہے
روز و شب از قہر او سوزم مدام | میں تو دن رات اس کی آتش قہر
وانگہم پروردہ لطفست تام | کے خوف سے جل رہا ہوں ہر کہ
| یہ مشہور ہو رہا ہے کہ میں اس کے
| لطف کا پروردہ ہوں۔
| جس کسی کے حق میں اس کا لطف
| زیادہ ہوگا بلا شبہ وہ لہو میں غرق
| ہوا ہوگا۔

پس سچ ہے کہ "نزدیکاں را بیش بود حیرانی" ۔ تقرب حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان باخود ہے، "شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی" شیخ عطارؒ ۔ اسی لطف و قہر کے موضوع کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ

ایک رات سلطان بستر پر مزاحمت فرما رہا تھا۔ اور ایاز اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی پاؤں چومتا تھا۔ سلطان نے کہا کہ میرے پاؤں کیوں چومتا ہے، میرے چہرہ کی قدر دیگر اعضا سے زیادہ ہے چہرہ پر بوسہ دیا ہوتا۔ عرض کی کہ ہر ایک شخص سلطان کا چہرہ چاند کی طرح دیکھتا اور دیکھ سکتا ہے۔ سلطان کی قدم بوسی کا شرف ہر ایک کو میسر نہیں، ابلیس نے ہر ایک شے ترک کی اور اللہ تعالے کے قہر کی درخواست کی۔ کیونکہ اللہ کے لطف و کرم کے خریدار بہت ہیں۔

چو لعنت خلعت درگاہ او بود — جبکہ لعنت کا طوق دیا خلعت)
چو ز ان درگاہ بود او را نکو بود — اسی درگاہ سے ملا اور اسی درگاہ سے جو بھی ملا اچھا ہی تھا۔

بداں لعنت حریف مرد و زن شد — اسی لعنت کا حربہ اس کے ہاتھ لگا
بسے خلق جہاں را راہزن شد — کہ زن و مرد کے مقابلہ میں آیا اور اکثر مخلوق کو گمراہ کیا۔

ازاں لعنت گرش قوت نبودے — اگر اسے اس لعنت سے تقویت نہ
کجا با خلق ایں قدرت نمودے — ملتی تو کیسے مخلوق پر قدرت پایا۔

شیخ عطار اس حکایت کے آخر میں فرماتے ہیں کہ

زحق اں لعنش پر برگ آمد — خدا کی جانب سے یہ لعنت اس
اگرچہ دیگراں را مرگ آمد — کے لیے زندگی کا برگ و بار ہے۔
اگرچہ دوسروں کے لیے موت کا پیغام ہے

اس قسم کی حکایات بہت ہیں، ہم نے بغرض تفنن ایک حقیقت آگاہ کے کلام سے اقتباس کیا ہے،

ابوالفضل بیہقی لکھتا ہے کہ ۳۸۱ھ میں سلطان محمود اور نور خان بادشاہ ترکستان باہم ملاقی ہوئے شاہ ترکستان نے دیگر تحائف کے ساتھ عام دستور کے موافق چند غلام بھی پیش کیے جنہیں سلطان غزنی میں ہمراہ لایا۔ ان میں ایک کم سن لڑکا نوشتگین خوبی نامی تھا۔ اس سے زیادہ اور مقبول صورت تو اس وقت تک کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ سلطان نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ سلطان کی وفات کے بعد نوشتگین سلطان محمد پسر سلطان محمود کی خدمت میں ساقی گری پر مامور ہوا

اور سلطان محمد نے اسے مالا مال کر دیا مگر جب سلطان محمد کو برطرف کر کے سلطان مسعود جو سلطان محمود کا بڑا بیٹا تھا جانشین ہوا تو نوشتگین کا وہی رتبہ اور اعزاز بحال رہا جو ایاز کا سلطان محمود کے عہد میں تھا۔ بلکہ سلطان مسعود نے اسے اسے ولایت "کوزکانان" کا والی بھی مقرر کر دیا اور آخر سپہ سالار افواج سلطانی ہو گیا۔

ایاز کی ایک بہن بھائی سے بھی زیادہ مقبول صورت تھی۔ سلطان محمود چاہتا تھا کہ اسے حبالہ نکاح میں لائے مگر یہ خیال رہ رہ کر آتا کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے بندہ زادوں سے نکاح کیا۔ ایک رات ابو نصر شکانی جس نے کتاب "مقالات" تصنیف کی ہے موجود تھا۔ یہ شخص مورخ تھا۔ سلطان نے اس سے دریافت کیا کہ تو شاہان عالم کے حالات سے واقف ہے کسی بادشاہ نے اپنے بندہ زادوں سے بھی نکاح کیا ہے۔ ابو نصر نے کہا کہ ایسے واقعات بہت ہیں آل سامان نے اپنے موالیوں سے نکاح کیا۔ قباد شہنشاہ ایران نے ایک دہقان کی لڑکی سے نکاح کیا اور اسی کے بطن سے نوشیرواں پیدا ہوا۔ بہرام گور نے ایک دھوبی کی لڑکی سے بیاہ کیا۔ سلطان خوش ہو گیا اور ایاز کی بہن سے عقد نکاح کیا۔

یہ قصہ ہم نے عوفی کی کتاب جوامع الحکایات سے نقل کیا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ سلطان کے دل میں وسوسہ کس لیے پیدا ہوا۔ بنو عباس تمام کنیزک زادگان تھے اور مسلمانوں میں چوٹی کے علماء حکماء و فقہا اکثر لونڈیوں کے بیٹے تھے اور سب سے بڑھ کر بروئے نص قرآن زیردستوں سے نکاح جائز ہے "ما ملکت ایمانکم" بظاہر یہ بھی ایک حکایت ہی ہے جیسے اور بیشمار افسانے ایاز کے بارہ میں ہیں۔

گردیزی لکھتا ہے کہ ۴۲۰ھ میں سلطان فتح رے کے بعد غزنی میں واپس آیا تو مرض دق کے آثار ظاہر ہوئے کچھ عرصہ کے بعد اس کی شدت بڑھ گئی۔ اور سلطان ہر روز ضعف زیادہ سے زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن کاروبار سلطنت میں بدستور اس طرح مشغول رہتا کہ گویا بیمار ہی نہیں۔ اور غالباً غرض یہ بھی تھی کہ لوگوں پر اس کا ضعف ظاہر نہ ہو۔ اور اسی حالت میں خراساں میں آیا اور بلخ میں گیا اور موسم سرما وہیں بسر کیا۔ جب بہار کا موسم آیا، بیماری زور پکڑ گئی۔ غزنی کی طرف لوٹا۔ اگرچہ بہت علاج معالجہ ہوا مگر پھر تندرست نہ ہوا مگر آخر دم تک کاروبار سلطنت سرانجام دیتا رہا۔ آخر بروز پنجشنبہ ۲۳ ماہ ربیع الاخر ۴۲۱ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

بیہقی لکھتا ہے کہ سلطان کا بڑا بیٹا اور ولی عہد سلطان مسعود اس وقت "سپاہان" میں تھا۔ اور ہمدان اور بغداد کی طرف جانے کا ارادہ تھا غزنی سے بہت دور تھا۔ اس لیے امرا دربار نے باہمی مشورہ سے سلطان کے چھوٹے بیٹے ابو احمد محمد کو "گوزگانان" سے بلوایا جو غزنی سے نزدیک تر تھا اور تخت و تاج حوالہ کر دیا۔ اس مشورہ میں ارکان دولت محمودی میں امیر علی صاحب بزرگ عضد الدولہ امیر ابو یعقوب یوسف بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود مرحوم جو سپہ سالار بھی تھا اور امیر حسن وزیر المعروف بہ ... و ابو نصر مشکان صاحب دیوان رسالت و ابو القاسم کثیر صاحب دیوان عرض وغیرہ شامل تھے۔

گردیزی کہتا ہے کہ سلطان محمود کی وفات کو پچاس روز گذر چکے تھے کہ امیر ایاز نے غلاموں کو جمع کیا اور ان سے اس امر پر بیعت لی کہ

سب امیر مسعود کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر سب مسلح گھوڑوں پر سوار ہو کر غزنی سے نکل آئے۔ جب اس کی اطلاع امیر محمد کو ہوئی تو اس نے سوندھ رائے کو جو ہندوؤں کے دستہ فوج کا افسر تھا تعاقب میں روانہ کیا۔ اس نے اُغوان کو جا لیا۔ لڑائی میں سوندھ رائے مارا گیا۔ اور اس کی ہندو فوج بھاگ گئی۔ اکثر غلام بھی مارے گئے۔ فتح مند ابوالنجم ایاز بن ایماق بلقیہ السیف کے ساتھ نہایت سرعت کے ساتھ نیشاپور میں امیر مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب امیر کو دیکھا تو سب نے وہیں سجدہ شکر اللہ تعالےٰ کے حضور ادا کیا۔ اور امیر کو تمام حالات گذشتہ بتائے۔

ادھر امیر محمد نے عیش و نشاط کی مجلس گرم کر رکھی تھی۔ مقربین نے بہت کہا کہ تجھے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ اور ابھی تیری سلطنت کو استقلال بھی حاصل نہیں ہوا بڑا بھائی مسعود عراق سے ضرور آئے گا اور ممکن ہے کہ تاج و تخت چھین لے۔ مگر اس نے اس ناصحانہ مشورہ پر کان نہ دھرا۔ جب پرچہ لگا کر برادر بزرگ امیر مسعود ایک لشکر جرار کے ساتھ آرہا ہے تو ہوش میں آیا۔ فوج کے ساتھ غزنی سے کوچ کیا امرا نے یہ مشورہ دیا کہ تمام لوگ دل و جان سے امیر مسعود کو چاہتے ہیں اور یقیناً تو اس کے مقابلہ کی تاب نہ لائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تو غزنی میں مطمئن ہو کر بیٹھا رہے اور ہمیں اجازت دے۔ ۔ ۔ امیر مسعود کے پاس جا کر اپنی اور تیری طرف سے عذر خواہی کریں تاکہ تیری اور ہماری جان بھی سلامت رہے۔ امیر محمد نے دیکھا سب امرا متفق الرائے ہیں اور تمام سرداران لشکر بھی برگشتہ ہیں اس لیے مجبوراً ان کا کہنا مان لیا۔ امرا و سرداران

لشکر امیر مسعود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اظہار اطاعت کیا۔

جب سلطان مسعود باپ کے تخت پر متمکن ہو گیا تو ایاز کی خدمات شائستہ کا صلہ وہی کچھ تھا کہ جو سلطان محمود کی زندگی میں اسے ملتا رہا۔ صف امرا میں اسے جگہ دی۔ مسعود بھی جانتا تھا کہ ایاز اس کے باپ کا منظور نظر تھا اور اس نے حق وفاداری بھی کما حقہ ادا کیا تھا۔

سلطان مسعود چاہتا تھا کہ رے کا والی کسی سالار محتشم اور کاردان کو مقرر کرے۔ کیونکہ یہ خاص شہر بلحاظ وسعت و آبادی و مالیہ کسی ایسے ہی والی کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔ وزیر داعیان و ارکان دولت نے چند امرا کا نام لیا اور ایاز کی نسبت بھی کہا کہ یہ نہایت موزوں ہے کیونکہ سلطان مرحوم کے ہمراہ ہر ایک مہم میں رہا ہے۔ سلطان مسعود سمجھ گیا کہ وزرا کا کیا منشا ہے، کہا کہ اس کی ضرورت سردست وہاں نہیں اسی جگہ ہے۔

سلطان مسعود ہر ایک جنگ میں ایاز کو ہمراہ رکھتا۔ اور اس کی خدمات شائستہ کا صلہ بھی انعام و اکرام و نوازشات سے دیتا، غالباً ۴۲۲ھ کا واقعہ ہے کہ سلطان مسعود کو مکرانی سپاہ سے جنگ کرنی پڑی ایاز سپہ سالار افواج سلطانی تھا۔ دشمن کو شکست فاش دے کر غزنی کی طرف مظفر و منصور لوٹا تو سلطان نے چالیس ہزار دینار دیے۔ حکیم فرخی نے اس واقعہ کا ذکر ایک قصیدہ میں کیا ہے۔

غم نادیدن آں ماہ دیدار	اس ماہ میں رو کے دیدار سے
مرا در خوابگاہ ریزد ہمی خار	محرومی کا غم مجھے خوابگاہ میں بھی کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

شب تارے ہمہ کس خواب یابد
من از بلیشار او تا روز بیدار

اندھیری رات میں سب میٹھی نیند سوتے ہیں لیکن میں اس کے غم میں صبح تک بیدار رہتا ہوں۔

گہے گویم ترا کے بینم اے دوست
گہے گویم لبت کے بوسم ای یار

کبھی تو میں دل ہی دل میں کہتا ہوں کہ اے دوست تجھے میں کب دیکھوں گا کبھی کہتا ہوں کہ کب تیرے لبوں پر بوسہ دوں گا۔

زگریانم کہ مہتر مرغ د ماہی
ہمی گریند بر من ہمچو من زار

جس طرح میں آہستہ آہستہ آنسو رو رہا ہوں اسی طرح ہوا کے پرندے اور دریا کی مچھلیاں بھی رو رہی ہیں

مرا گوئی چہ سرا گریی ترا ندوہ
مرا گوئی چہ را نالی د بلیشار

تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ مجھے کیا غم ہے کہ رو رہا ہے تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ تجھے کیا رنج ہے کہ رو رہا

نہ وقت باز گشتن سوئے معشوق
نہ غیر با راز داران روئے گفتار

حالت یہ ہے کہ نہ تو معشوق کی طرف مراجعت کا وقت ہے اور نہ سوائے کرم راز کے کسی اور سے بات کر سکتا ہوں۔

ہر آں کا سال آمد سوئے من گفت
نہ آنی خود کہ من دیدم ترا پار
دگوژی پشت من چوں پشت پیراں
دستی پائے من چوں پائے بیمار

جو بھی اس سال مجھے ملتا ہے کہتا ہے کہ کیا تو وہی نہیں جسے میں نے گذشتہ سال دیکھا تھا میری کمر بوڑھے آدمیوں کی پیٹھ کی طرح خمیدہ ہے اور پاؤں بیماروں کی طرح

ضعف سے اٹھ نہیں سکتے۔

خروشم چوں خروش رعد بہمن
سرشکم چوں سرشک ابر آزار

میں اس طرح نالہ و فریاد کرتا ہوں جس طرح رعد بہمن کے مہینے میں اس طرح آنسو بہاتا ہوں جس طرح بادل برسات میں۔

تن مسکیں من بگداخت چوں موم
دل غمگیں من بشگافت چوں نار

میرا بیچارہ جسم موم کی طرح پگھل رہا ہے میرا غم زدہ دل انار کی طرح پھٹا ہے۔

زدل برداشت خواہم بار اندوہ
چوں نزد میر سید یافتم بار

یہ بوجھ جو میرے دل پر ہے اس وقت ہلکا ہوگا جب میں سردار سرداروں کے پاس پہنچوں گا۔

تن چوں موی چوں بردارد ایں رنج
دل بیچارہ چوں بر دارد ایں بار

میرا جسم ضعف سے بال کی طرح باریک رنج کو کیسے برداشت کر سکتا ہے بیچارہ دل یہ بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔

زدل برداشت خواہم بار اندوہ
چو نزد میر سید یافتم بار

اس وقت میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا جب امیر سالار کی خدمت میں باریابی ہوگی۔

امیر جنگجو ایاز الیاق
دل و بازوئی خسرو وقت پیکار
سوار گر در میداں در آید
زپا اند رفتند دلہا سے نظار

امیر جنگجو ایاز بن الیاق ہے جس دل اور بادشاہی قوت جنگ کے وقت رکھتا ہے جب سوار ہوکر میدان کے در دادہ میں داخل ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کو

یکے گوید کہ آں سرو است بر کوہ
دگر گوید گل تازہ ست بر بار

کوئی کہتا ہے کہ یہ پہاڑ پر سرو ہے اور کوئی کہتا ہے کہ شاخ پر پھول تازہ ہے۔

زنان پارسا از شوی گردند
بلا بیں کردنی او را خریدار

پرہیزگار عورتیں چاہتی ہیں کہ شوہر ہو تو ایسا ہو اس لیے کچھ پڑے سے ہے کر اس کی خریداری کے لیے تیار ہیں

دلیراں از نہیبش روز کوشش
ہمی لرزند چوں برگ سپیدار

لڑائی کے وقت بڑے بڑے دل گردہ والے بہادر اس کے خوف سے اس طرح کانپتے ہیں جیسے سفیدہ کے درخت کے پتے۔

اگر بر سنگ خارا بر زند تیر
بسنگ اندر نشاند تا بسوفار
بروں پر انداز نخچیر ناوک
من ایں صد بار دیدستم نہ یک بار

اگر سرخ پتھر پر تیر مارے تو اس کے اندر پیکاں تک دھنس جائے شکار کو چیرتا ہوا اس کا تیر باہر پرواز کرتا ہے یہ تو میں نے ایک بار نہیں سو بار مشاہدہ کیا ہے۔

نہ برخیرہ برد دل داد محمود
دل محمود را بازی پسندار

محمود نے اسے دل والہانہ یونہی نہیں دیا تھا محمود کا دل لینا کچھ کھیل نہیں ہے۔

چو او در پیش سلطان نیز کس بود
بجز او سلطاں غلاماں داشت بسیار

یہ تو کہو کہ سلطان کے مقربین میں سے کوئی اس جیسا بھی تھا حالانکہ اس کے علاوہ سلطان کے پاس بیشمار غلام تھے

اگرچوں میر یک تن بود زاہما — اگر ان میں سے کوئی امیر تنہا بھی
نہ چندیں بر ادا تیز بازار — تھا پھر بھی یہ گرم بازاری جو اسے حاصل
تھی اسے میسر نہ تھی۔

حکیم فرخی کے اس قصیدہ کے اشعار سے واضح ہوتا ہے سلطان محمود کے دربار میں یوں تو ہزاروں غلام تھے مگر ایاز ہی ایک ایسی شخصیت تھی جو منظور نظر تھی اور اس کے وجوہ بھی ہیں کہ حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کا بھی مالک تھا۔ فرخی نے پتہ کی بات کہی کہ سلطان محمود کا دل کچھ بازیچۂ طفلاں نہ تھا۔ ایسی ہی شخصیت جیسی ایاز تھی اسے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔

۴۲۱ھ کا واقعہ ہے کہ سلطان مسعود ہندوستان میں ایک مہم کے سرانجام میں الجھا ہوا تھا، غزنی میں امیر نوشتگین نے امراء سلطان سے میدان خالی دیکھا، محمد برادر سلطان مسعود کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ نوشتگین اور محمد کے حالات بعد وفات سلطان محمود، ہم بیان کر چکے ہیں۔ سلطان مسعود کو جب واقعہ کی اطلاع ہوئی ہندوستان سے مراجعت کی۔ چھوٹے بھائی نے اس عرصہ میں کافی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ لڑائی میں مسعود شکست کھا گیا۔ محمد نے اسے مع اہل و عیال اسیر کرکے قلعہ "کیدی" میں بند کر دیا۔ اب سلطان محمد کے نام کا سکہ و خطبہ جاری ہو گیا۔ اس نے اپنے بیٹے احمد کے حوالہ امور سلطنت کر دئے۔ احمد نے سلطان منتخب معزول کو قتل کرا دیا۔ شہاب الدولہ مودود پسر سلطان مسعود اسوقت خراسان میں تھا باپ کے قتل کی خبر سنی تو غزنی پر فوج کشی کی لڑائی میں محمد نے شکست کھائی اور سلطان مسعود تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔ ملک ایاز اس کے عہد میں بھی طبقہ امراء میں ممتاز خدمت پر فائز رہا اور بقیۃ العمر امن اور خوشحالی میں بسر کی۔

بُو علی سینا!

ابو علی الحسین المعروف بو علی سینا مشاہیر اسلام میں ممتاز مرتبہ کی شخصیت ہے۔ اس کے حالات مفصل ہم علیحدہ لکھیں گے، لیکن سلطان محمود غزنوی کا تذکرہ نامکمل رہ جاتا ہے اگر ان شخصیتوں کا ذکر نہ کیا جائے جو نہ صرف سلطان کے معاصرین تھے بلکہ کم و بیش ان کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ سلطان سے رہا ہے۔ ان میں ایک بو علی سینا بھی ہے

جسے اب "تاجیکستان" کہتے ہیں سکندر یونانی کے دور فتوحات میں "باختر" (BACTARIA) سے موسوم تھا۔ دوسری صدی قبل از مسیح میں "تاجیک" قوم کی سلطنت کے حدود میں دریائے آموں کی وادیاں اور وسط ایشیا کا ایک حصہ جو ایک طرف ایران اور دوسری طرف چین اور افغانستان اور شمال مغربی ہندوستان شامل تھے۔ اس قوم نے سکندر اعظم کے جانشین سلوکس کی مملکت کا خاتمہ کر دیا۔ تاجیک قدیم الایام سے وسط ایشیا میں آباد تھے۔ عموماً مورخین ان کو ایرانی نژاد سمجھتے رہے مگر میری ذاتی تحقیق یہی ہے کہ یہ لوگ ترک تھے۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ایرانیوں سے ان کا اختلاط قدیم ایام سے رہا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں خلافت بنوامیہ منتہائے عروج پر تھی۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ایک سپہ سالار "قتیبہ" نے یہ علاقہ مسخر کر لیا۔ اس وقت "بدھ مت" ان لوگوں کا قومی مذہب تھا۔ "بودھ" اور فارسی لفظ "بت" ایک ہی ہے۔ یہ بودھ مت کے پیرو مہاتما بدھ اور اسی مت کے بزرگوں کے بتوں کی پوجا کرتے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو بھی ان مورتیوں کو نقصان پہنچائے گا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ یہ ایک دلیر جنگجو قوم تھی مگر بدھ مت کے اصل اصول دین "اہنسا پرمودھرما" نے اس حد تک انہیں کمزور بنا دیا تھا کہ قوت مدافعت بھی سلب ہو چکی تھی۔ قتیبہ بے تکلف ادھر بڑھتا چلا آیا۔ اور بدھوں نے کہیں جم کر مقابلہ نہیں کیا۔ جب قتیبہ کو ان لوگوں کے مذہبی عقیدہ کا علم ہوا تو چند اکابر کو جمع کر کے ایک مندر کے بتوں کو شکست و ریخت خاطر خواہ کی اور ان کو سمجھایا کہ تمہارا عقیدہ بت پرستی فاسد ہے۔ وہ تو یقین کیے بیٹھے تھے کہ دوران شکست و ریخت میں آسمان سے اس مسلمان پر بجلی گرے گی یا ان کے مہاتماؤں کا غضب کسی نہ کسی صورت میں اس پر نازل ہوگا۔ لیکن جب خلاف توقع کچھ نہ ہوا تو ان کا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا دیوتا ہمارے مہاتماؤں سے بھی بڑھ کر زبردست ہے۔ یہی یقین فرعون مصر کو بھی "یم نیل" میں غرق ہونے وقت ہوا اور کہا کہ میں موسےٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لایا۔ اس وقت اصنام پرستوں کے مختلف فرقے تھے اور آج بھی ہندوستان میں موجود ہیں اور اپنے دیوتاؤں کا تفوق دوسرے فرقہ کے دیوتاؤں پر جتاتے ہیں۔ جب بودھوں کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا خدا سب دیوتاؤں سے بڑھ چڑھ کر طاقتور ہے تو اسلام قبول کر لیا۔

بنو امیہ کی خلافت کا یہ ایک خاصہ ہے کہ جہاں کہیں ان کا فاتحانہ قدم پڑا وہاں اسلام اور عربی زبان کی عام اشاعت ہوگئی یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے مفتوحہ ممالک (ماسوی ہسپانیہ) میں دین اسلام اور عربی کے عالم کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وادی سندھ اور بلوچستان اور افغانستان اور تمام وسط ایشیا اور ایران میں خالص مسلم آبادی اموی خلافت کی سعی کی مرہون ہے یہ بات ان کے بعد کسی حکمران کو نصیب نہ ہوئی الا ماشاء اللہ، سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کا سلسلہ بلاشبہ بہت وسیع تھا مگر غیر مسلم علاقہ جس نے اسلام قبول کیا صرف پنجاب تھا۔ اور ہندوؤں نے جن حالات کے تحت اسلام قبول کیا ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو بھی اسلام قبول کرتا خاص مراعات کا مستحق ہوتا مگر اس نے کسی کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر مجبور نہ کیا۔ اس کی اپنی فوج کے خاص دستے مذہباً ہندو دھرم کے پیرو تھے اور اس کے جانشین سلطان مسعود وغیرہ کے لشکر کے دستے بھی ہندو تھے۔ افسران ہندو تھے اور پنجاب میں مختلف اضلاع پر اس کے نائب السلطنت بھی ہندو تھے۔

خلفاء بنو امیہ کا نصب العین نہ صرف اسلام کی اشاعت تھی بلکہ عربی کے ذریعہ مختلف علوم و فنون کی ترویج بھی تھی چنانچہ ان ایام میں اور ہمارے زمانہ تک "بخارا" جو "تاجیک" قوم کا صدر مقام تھا علم و حکمت کا مرکز وسط ایشیا میں قائم ہو چکا تھا۔ یہ علاقہ اب سوویٹ روس میں شامل ہو چکا ہے۔ اسی "تاجیک" قوم کے ایک ممتاز خاندان کا ممتاز رکن "عبداللہ ابن سینا" تھا، اس کی رہائش بخارا کے نواح میں ایک قصبہ "افشانہ" میں تھی۔ اس وقت یہ تمام علاقہ "آل سامان" کے قبضہ میں تھا۔ عبداللہ ابن سینا

سامانی سلطان نوح ثانی ابن منصور (۳۵۰ھ / ۹۶۱ء) کے ہاں ملازم تھا۔
یہی وہ آل سامان ہے جس کی فوج کا سپہ سالار الپتگین تھا۔ اور اسی الپتگین
کا داماد سبکتگین تھا جس کا نامور بیٹا سلطان محمود غزنوی ہے۔

بوعلی ابن سینا افشار میں ۳۷۰ھ / ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ ایک ہزار سال کا
عرصہ گذرتا ہے کہ سویٹ روس میں عالمگیر انجمن امن (WORLD PEACE COUNCIL) نے بوعلی سینا کی برسی منائی۔ ۱۹۵۲ء میں اس تقریب پر
جو کچھ اس ادیب اور حکیم اور طبیب اور ہیئت دان اور عالم دین اور فلسفی کی نسبت
کہا گیا اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ یہ شخصیت ان مشاہیر
میں سے ہے، جن کے افکار عالیہ نے عالم انسانی کی ذہنی اور مادی ترقی کو
چار چاند لگا دیئے۔ اور یہی وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو امن اور علوم و
حکمت کی علم بردار تھیں۔ اس وقت "دنیائے اسلام جس دور سے گذر رہی ہے وہ
ایک عظیم الشان "ذہنی انقلاب کی خبر دے رہا ہے۔ اور یہ "انقلاب"
جس سے یورپ گذر چکا ہے بوعلی سینا جیسی شخصیتوں نے پیدا کیا تھا۔ یورپ
نے تو ان بیگانوں کو اپنایا اور خاطر خواہ اٹھایا لیکن بوعلی وغیرہ حکماء اسلام
کی آزادی فکر، علماء دین نے برداشت نہ کی۔ اور اسے الحاد کفر سے متہم
کیا اس کا جواب بوعلی نے ایک شعر میں دیا کہ

در دہر یکے چو من او ہم کافر پس در دو ہر کسے مسلماں نبود

ان ایام میں بخارا نہ صرف علم و حکمت کا مرکز ہی تھا بلکہ وسط ایشیا میں تجارت
اور صنعت و حرفت میں اس کا جواب نہ تھا۔ بوعلی سینا کی تعلیم و تربیت
کا فخر بھی اسی شہر کو حاصل ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ
ہر کسے را بہر کارے ساختند الفستق لیا دو دلش اندا ختند (سعدی)

اگر ہر ایک شخص اسی کام میں لگ جائے یا لگایا جائے جس سے اس کو فطری لگاؤ ہوتا ہے تو عالم انسانی کی ذہنی اور مادی ترقی تھوڑے عرصہ میں اس مقام پر پہنچ سکتی ہے جو انسان کی تخلیق کا فطری مقصد ہے لیکن اس کو وہاں پہنچنا ضرور ہے۔ مگر بعد از ہزار رسوائی۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ایک دور میں چند نفوس ہی ہوتے ہیں جو تقاضائے فطرت کو پورا کرتے ہیں اور اکثریت کی پست ذہنیت ان کے ذہنی مرتبہ سے روشناس نہیں ہوتی اور صدیوں بعد پہچانتی ہے جب ایسے اشخاص کی ذہنیت کی سطح تک صدیوں بعد آتی ہے، ایسی ہی شخصیت ایک بوعلی سینا بھی تھی۔

چھوٹی سی عمر میں علم و حکمت سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اس نے طالب علمی کے زمانہ میں نیند اپنے اوپر حرام قرار دی تھی۔ رات کے وقت ایک شمع اس کے سامنے ہوتی۔ اور کتاب اور گوشہ خلوت۔ اصل اصول تعلیم اس نے یہ مقرر کر رکھا تھا کہ "علم در جلد تو لیش یا مد نہ در چرم ملیش۔" اس لیے جو بات مطالعہ کتب کے وقت اس کی توجہ جذب کرتی ازبر کر ڈالتا۔

ان ایام میں نصاب تعلیم میں اول فقط قرآن اور زبان عربی تھی۔ بوعلی سینا کی قوت حافظہ کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید ڈیڑھ سال میں حفظ کر لیا۔ عربی پر اس کو جس حد تک عبور تھا وہ اس کی تصانیف سے واضح ہو سکتا ہے۔ علم ادب عربی میں بھی استادوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ علم ہیئت کی طرف خاص توجہ تھی اس کے علاوہ ریاضی اور فلسفہ جس میں علم منطق نمایاں تھا اور دینیات تو خاص موضوع تھا۔ مگر ابن سینا کی توجہ طب کی طرف زیادہ مائل تھی۔ بلاشبہ وہ علوم مروجہ کا مالک تھا مگر علم طب کی وجہ سے جو شہرت اسے حاصل

ہوئی وہ نہ صرف اپنے زمانہ بلکہ آج تک قائم ہے۔ سولہ برس کی عمر تک وہ سب علوم مروجہ پر حاوی ہو چکا تھا۔ یہ حقیقت بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ خلافت اسلامیہ اشاعت علم و حکمت میں ہمیشہ فراخ دل رہی ہے۔ جو ہمارے زمانہ میں بھی یورپ اور امریکہ کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب مشاہیر اسلام (مطبوعہ ۱۳۳۶ھ) میں کافی بحث کی ہے۔ ان ایام میں قلمی نسخے ہی خلفاء اور سلاطین کے کتب خانوں میں تھے۔ آل سامان نے جو کتب فراہم کی تھیں ان کی تعداد بھی ہزاروں تھی۔ اور بو علی کی خوش قسمتی تھی کہ یہ کتب خانہ اس کے زیر نگرانی تھا۔ یونانی فلسفہ میں جو کتب افلاطون اور ارسطو وغیرہ کی تصانیف تھیں ان کا عربی ترجمہ ہو چکا تھا۔ اور مشہور اسلامی شہروں کے کتب خانوں میں ان کے نسخے موجود تھے۔ بو علی سینا کو یہ سب ازبر تھے۔ یونانی حکماء کی تصانیف پر حکماء اسلام نے شرح بھی لکھی۔ اور بعض حکماء نے ان کے اغلاط بھی واضح کیے۔ بو علی سینا نے بھی ان کی غلطیاں نمایاں کیں اور اپنا نظریہ پیش کیا "حکیم الرازی" (م ۳۶۵ھ) کے مقالات پر بھی ابن سینا نے شرح لکھی اور بعض مقامات پر اختلاف بھی کیا۔ اس نے نظم و نثر میں اپنی تصانیف لکھیں۔ نظم میں "منظومہ" مشہور ہے۔ نثر میں اس کی تصنیف "کتاب الادویات التعلیمات" اور "کتاب النبض" اور "کتاب القولنج" وغیرہ چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ لیکن علم طب میں جس تصنیف نے اسے غیر فانی شہرت دی وہ اس کی "کتاب القانون فی الطب" اور "کتاب الشفاء" اور "نجات" اور "اشارات" اور "دانش نامہ" ہیں۔ آخر الذکر کتاب اس نے فارسی میں لکھی۔ باقی تمام کتب عربی میں ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربی

ان ایام میں دنیائے اسلام میں کتنی مقبول ہو چکی تھی۔

آل سامان کے دربار میں علماء و حکماء کثرت سے موجود تھے۔ ان میں سے بوعلی ابن سینا اور ابوریحان بیرونی خاص شخصیتیں تھیں۔ ہر ایک حکمران یہ چاہتا تھا کہ اس کے دربار کی زینت ہمعصر مشاہیر کی موجودگی سے ہو۔ وہ خود بھی علم دوست تھے اور انہی کی سرپرستی میں علم و حکمت کی اشاعت بھی ہو رہی تھی۔ ان ایام میں آل سامان کی حکومت میں نمایاں ضعف آچکا تھا، درباری امراء کی رقابت نے آخر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور یہ سلطنت غزنوی حکومت کے تحت آگئی۔ سلطان محمود کی نظر ان علماء و حکماء پر تھی جو دربار آل سامان کی شہرت کا موجب تھے۔ کہتے ہیں تین ذرائع ہیں جن سے انسان اپنا کوئی مقصد حاصل کر سکتا ہے، زور یا زر یا زاری۔ زاری تو سلطان محمود کے حالات سے بعید تر تھی۔ البتہ زور اور زر صرف کیا۔ ابوریحان بیرونی وغیرہ تو زور و زر کی قوت سے مرعوب ہو گئے مگر بوعلی سینا پر یہ جادو نہ چلا۔ بات اصل یہ ہے کہ بوعلی سینا کی " آزادی فکر " کچھ مطلق الشان واقع ہوئی تھی۔ اور سلطان محمود کٹر مسلمان تھا۔ بوعلی سینا نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ سلطان سے بگاڑ دیر سویر ضرور ہو گا تو اس کی جان کی بھی خیر نہیں۔ اس لیے آبائی وطن کو خیرباد کیا اور جرجان میں آیا۔

بحیرہ دمیش کے مشرقی کنارہ پر یہ علاقہ واقع ہے یہاں اس نے طبابت جاری رکھی مگر ارادہ گمنامی کی حالت میں رہا مگر تھوڑے عرصہ میں اس کا دست شفا اتنا مشہور ہوا کہ سلطان جرجان نے اپنے برادر زادہ کے معالجہ کے لیے اسے طلب کیا۔ علاج کامیاب رہا تو سلطان کا منظور نظر ہو گیا۔ سلطان محمود کو بھی اطلاع ہوئی کہ جناب حکمت مآب جرجان میں براجمان

میں والیٔ جرجان کو لکھا کہ بوعلی کو دربار غزنی میں بھیج دو۔ اب والیٔ جرجان کی بھی آنکھیں کھلیں کہ اس کا درباری طبیب ہی بوعلی سینا ہے۔ اس نے سلطان محمود کو لکھا کہ آپ کے دربار میں تو منتخب روزگار موجود ہیں بوعلی نہ ہوا تو کمی واقع نہ ہوگی میرے پاس لے دے کے ایک یہی ہے اس لیے یہ میرے پاس ہی رہنے دیں۔ مگر بدقسمتی سے بوعلی کا سرپرست امرائے دربار کی سازش کا شکار ہوا اور مارا گیا۔ جانشین والیٔ جرجان نے سلطان محمود کا اقتدار تسلیم کر لیا۔ بوعلی اس سے پیشتر جرجان سے "رے" میں نقل مکانی کر چکا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد "رے" (نواح تہران) بھی محمودی سلطنت میں شامل ہو گیا تو بوعلی ہمدان میں چلا گیا۔ والیٔ ہمدان شمس الدولہ تھا، اس نے بوعلی کو وزارت پیش کی بوعلی سے یہ غلطی ہوئی کہ وزارت قبول کی۔ فطرت نے اس کو سیاسیات کی گتھی سلجھانے کے لیے نہیں بنایا تھا درباری امرا کی رقابت اور سازشوں کے جال میں یہ خود بھی الجھ کر رہ گیا شمس الدولہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کو امراء نے بوعلی کی طرف سے بدظن کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ بوعلی والیٔ اصفہان ابوجعفر علاء الدولہ سے ساز باز کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے والی ہمدان اور علاء الدولہ میں لڑائی بھی شروع ہو گئی۔ بوعلی کو جیل میں ڈال دیا۔ مگر خوش قسمتی سے علاء الدولہ نے ہمدانی فوج کو شکست دی اور بوعلی کو بھی قید سے نجات ملی۔ اور علاء الدولہ اسے اپنے ساتھ اصفہان میں لے گیا اور اب بوعلی کو بھی تلخ تجربہ کے بعد ہوش و حواس کے فتویٰ پر عمل کرنا پڑا۔ سیاسیات سے بالکل علیحدہ ہو کر اس نے امن اور سکون کے ساتھ اپنے افکار عالیہ کو قلم بند کیا۔ اصفہان آخر سیاسی سازشوں کی جگہ تھی۔ کامل سکون کے لیے اس نے

ہمدان ہی کی رہائش پسند کی۔ یہاں اس نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی
جاری کر دیا۔ اور یہی ایک کام ایسا تھا کہ جس نے اسکے نام کو زندہ رکھا۔
دو واسطہ سے ابو نصر محمد الفارابی اس کا شاگرد ہے۔ اس کے شاگردوں
کی فہرست طویل ہے۔

۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء میں ۵۸ سال کی عمر میں ہمدان ہی میں فوت ہوا۔ اور یہاں اس کی
قبر موجود ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

بوعلی سینا کی تصانیف کی تعداد تین سو ہے۔ ابن سینا غالباً پہلا شخص ہے
جس نے "جراثیم" کا نظریہ امراض میں واضح کیا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارے
گرد و پیش ہوا اور پانی کے ذریعہ جراثیم امراض پیدا کرتے ہیں۔ صحت کے
بارہ میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ بیماری کا علاج صرف دواؤں سے نہیں
ہوتا۔ بلکہ بیماری کے اسباب کا سدباب کرنا چاہیے۔ اور کھلی اور صاف
ہوا میں ورزش بھی ایک مجرب نسخہ ہے "کشش ثقل" جو بوعلی سینا
کی وفات کے چھ سو سال بعد نیوٹن سے منسوب کی جاتی ہے۔ بوعلی ہی
نے پہلے دریافت کی۔ اور اس موضوع پر نیشاپور میں حکماء کے ساتھ اس
کا مباحثہ بھی ہوتا رہا۔

بوعلی سینا کی حکمت اور طبابت کے متعلق اتنے افسانے مشہور ہیں
کہ اگر ایک جا جمع کئے جائیں تو ایک دفتر مرتب ہو سکتا ہے کہتے ہیں
کہ بوعلی نے چالیس دوائیاں ایسی اختراع کی تھیں کہ ان کے ذریعہ مردہ زندہ
اور بوڑھا جوان ہو سکتا ہے اور اس کا راز اس نے اپنے ایک شاگرد کو
بتایا تھا۔ اور ہدایت کی تھی کہ جب میں مرجاؤں تو یہی ادویہ جو مرہم کی

کی صورت میں تیس میرے جسم پر ملنا۔ چنانچہ شاگرد رشید نے عمل کیا جوں جوں شاگرد ایک ایک مرہم لگاتا بوعلی کا جسم توانا اور تندرست محسوس ہوتا۔ آخر ایک نوبت صورت نوجوان کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ لیکن ابھی مکمل جسم میں زندگی کے آثار محسوس نہ ہوئے، اب صرف ایک ہی مرہم کا عمل باقی رہ گیا تھا۔ لیکن بوعلی کی لاش پر سرعت سے جو حیرت انگیز تغیر واقع ہو رہا تھا اس نے شاگرد کو مبہوت کر دیا۔ آخری شیشی ہاتھ سے گر کر چور چور ہوگئی۔ اور دوا بھی ضائع ہوگئی۔ اس لئے بوعلی دوبارہ زندہ نہ ہو سکا، یہ قصہ مشہور تو بہت ہے مگر وہی بات کیمیا گروں کی ہے کہ ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی۔

خواجہ شمس الدین محمدؒ

حافظ شیرازی

آں کس کہ گفت قصۂ ما ہم ز ما شنیدا

خواجہ شمس الدین محمد حافظ علیہ الرحمتہ کے سوانح حیات کسی تذکرہ میں اس سے زیادہ نہیں ملتے کہ آپ "شیراز" میں پیدا ہوئے۔ یہیں سپردِ خاک ہوئے۔ البتہ آپ کے شعر و شاعری پر کم و بیش بعض تذکرہ نویسوں نے بحث کی ہے، بات بھی یہی ہے کہ حقیقی شعرا کی زندگی ان واقعات سے مبرا ہوتی ہے جو سکندر دارا کو پیش آئے۔ اشعار ہی ان کے افکارِ عالیہ کے آئینہ دار ہیں اور اسی آئینہ میں ان کی صورت اور سیرت کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ خواجہ حافظ خود فرماتے ہیں کہ؂

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　　از من بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

قصہ سکندر دارا تو آپ نے ضرور پڑھا ہو گا۔ مولانا نظامی گنجوی نے سکندر نامہ بری و بحری لکھا اور آپ نظامی کی شاعری کے مداح ہیں شاہنامہ فردوسی بھی ضرور آپ کی نظر سے گذرا ہو گا فردوسی اپنی دوسری تصنیف "یوسف زلیخا" میں اس محنت کے ضائع ہونے کا افسوس کرتا ہے کہ ایسا کلام جو محض فسانہ ہو اور فسانہ بھی جھوٹ کا طومار اس لائق نہیں کوئی عقلمند اسے "سخن" کی تعریف میں داخل سمجھے۔ اور یہ بھی کہاں کی عقلمندی تھی کہ

یکے نیمہ از عمر خود کم کنم　　　جہانے پر از نام رستم کنم

شاہنامہ کا مہیرو، رستم ہے۔ فردوسی نے عمر کا بہترین حصہ نصف رستم کا نام اچھالنے میں صرف کر دیا۔ سلطان محمود کے دربار میں پیش کیا تو "یمین الدولہ امین الملۃ" نے چیں بجبیں ہو کر کہا کہ تو نے اپنی خدا داد قابلیت پر جتنا ظلم کیا ہے اس کا افسوس مجھے ہے، کیا تجھے خلفاء راشدین اور سلاطین اسلام کے کارناموں میں رزمیہ نظم کا موضوع نہیں مل سکتا تھا۔ یہ گبروں کے افسانے جن کی تاریخی سند بھی نہیں ایک ایسا شخص جو دعویٰ مسلمانی بھی کرتا ہے کبھی لکھنا پسند نہیں کرے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے طنزاً کہا ہوگا کہ خواجہ غزل تو اچھی کہتا ہے مگر وہ بات کہاں جو نظامی اور فردوسی کی رزمیہ نظموں میں ہے۔ یہی طعن کسی نے شیخ سعدی کے کلام پر بھی کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے دو تین مختصر رزمیہ لکھ کر جواب تو دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی عذر پیش کیا کہ ؎

ندانی کہ مارا سر جنگ نیست　　　وگرنہ مجال سخن تنگ نیست

یہ صحیح کہ شیخ غزل میں اپنی طرز کا موجد ہے اور کوئی شاعر غزل گوئی کے میدان میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور آپ کی قادر الکلامی نظم و نثر میں مسلم ہے مگر رزمیہ نظم کے مناسب آپ کی طبیعت واقع نہ ہوئی تھی۔ قصیدہ گوئی ان ایام میں ایک ایسا فن سمجھا گیا تھا کہ اصناف شعر میں جس کو اس میں کمال حاصل ہوتا وہ مستند استاد سمجھا جاتا ہے۔ قصیدہ میں شاعر نہ صرف ممدوح کے اوصاف بیان کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملاتا بلکہ تشبیب میں اپنے تخیل و افکار کی بلندی کا بھی اظہار کرتا۔ شیخ سعدی نے اکثر قصائد لکھے۔ وہ ممدوح کے بعض اوصاف حسنہ کی طرف اشارہ بھی

کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پند و نصائح کا دفتر بھی کھول دیتا ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ گوئی سے اس کی غرض ہی یہ تھی کہ امراء و وزراء
و ملوک کو ان کے فرائض منصبی اور مذہبی کی طرف توجہ دلائے۔

شیخ سعدیؒ نے دو تین مختصر مدحیہ بعض حاسدوں کا منہ بند کرنے کے
لیے لکھیں لیکن خواجہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "ما قصہ سکندر دارا نخواندہ ایم
ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس"۔ یہ سکندر دارا کیا بلا تھے کہ مر کھپ گئے
اور ناکردہ گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم
رکھا، تمام عمر داد عیش دیتے رہے وہ شاعر کتنی پست ذہنیت رکھتے
ہیں جو انہی کے گن گاتے ہیں اور انہی کے ذکر خیر میں لگے ہوئے۔ حالانکہ
ان سے کسی صلہ کی توقع بھی نہیں۔ البتہ انسانیت کے شایاں "مہر و وفا"
ہے انسان مدنی الطبع ہے اور ہر ایک ذہنی اور مادی ترقی اس کے تمدن،
اس کی شہری زندگی ہی میں باہمی تعاون یعنی "مہر و وفا" سے ممکن ہے۔
خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ اس مہر و وفا کے بارہ میں اگر کچھ پوچھنا ہو تو مجھ
سے پوچھو، مگر یہی بات ہے کہ پست فطرت عوام کالانعام کو نہیں بھاتی۔ ان
کو قصہ سکندر دارا ہی میں مزا ملتا ہے۔ یہ حکایت "مہر و وفا" خواجہ حافظ
اپنی دلاویز نظم اور مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں یہ حکایت خواجہؒ
کی "آپ بیتی" ہے اس لیے آپ کی زبان ہی سے آپ کی کہانی سنی
جائے تو لطف ہے اس لیے فرماتے ہیں کہ

"آں کس کہ گفت قصۂ ما ہم زما شنید"

شیراز

خواجہ محمد حافظ کا مولد شیراز ہے۔ اسی خاک شیراز سے مدح شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے اور دیگر اکابر کا بھی مولد ہے اس لیے یہ کہنا چاہیئے کہ سرزمین شیراز کا بھی کچھ طبعی اثر ہے جس نے سعدی و حافظ سے شعرا پیدا کیے۔ ایک حساس انگریز سیاح کہتا ہے کہ شیراز کی آب و ہوا میں شاعری کا نشہ ہے۔

یہ ایک اسلامی شہر ہے، خواجہ حافظ کا ہمعصر اور ہم شہر احمد بن ابی الخیر اپنی کتاب "شیراز نامہ" ۷۳۴ھ میں جیسا کچھ یہ شہر تھا اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے (کہ زبدہ ممالک روئے زمین ہے۔ بلکہ نزہت نامۂ بہشت بریں ہے)۔

مصفی آب آں چوں اشک وامق   معطر خاک آں چوں جیب عذرا
ہوائی تر صفت چوں دین فاسق   نسیمے خوش گند چوں عمر ناداں

بچپن لڑکپن نادانی کی عمر بھی خوش خوش گذر جاتی ہے وہ تفکرات لوازم امور جو بلوغ میں اہل عقل محسوس کرتے ہیں ناداں نہیں کرتے، (فاسق کا دامن معصیت سے تر ہوتا ہے اسی طرح) دونوں باتیں نسیم اور ہوائے تر میں پائی جاتی ہیں۔

حاجی زین العابدین شیروانی اپنی کتاب "بستان السیاحت" میں اپنے سفر ۱۲۴۲ھ کے حالات میں شیراز کے بارہ میں کہتا ہے کہ "محمد بن القاسم (بن عقیل) ابن عم حجاج بن یوسف ثقفی نے ۷۴ھ میں یہ شہر بسایا، عضد الدولہ ابن معز الدولہ دیلمی نے (جو خلیفہ و خلافت عباسیہ پر چھایا ہوا تھا)

اسے اور وسعت دی، اور اس کے قبلہ رخ ایک اور قصبہ کا اضافہ کیا جس کا نام "فنا خسرو گرد" رکھا، کہتے کہ یہ قصبہ اتنا آباد تھا کہ اس کا مالیہ بیس ہزار دینار تھا۔ لیکن اب اس کے آثار مٹ چکے ہیں، صمصام الدولہ نے شیراز کے گرد ایک فصیل تعمیر کی لیکن نفاز کی دستبرد سے منہدم ہو گئی۔ "شرف الدین محمود انجو" نے اس کی دوبارہ تعمیر کی، یہ بھی خراب و خستہ ہو گئی شاہ شجاع بن مبارز الدین محمد بن منظفر نے پھر تعمیر کی، یہ بھی نہ رہی "کریم خان زند" نے (جو خاندان صفوی کے بعد شاہ ایران ہوا) ایک قلعہ مضبوط برج سے مستحکم تر تعمیر کیا۔ آقا محمد خان بن حسن خان قاجار نے اس کو گرا دیا۔ حسین قلی خان برادر شاہ قاجار نے فصیل تعمیر کی، زلزلہ نے اسے بھی نہ چھوڑا۔

لیکن خواجہ حافظ کے زمانہ میں شیراز ان آفات سے مصئون و مامون تھا آپ شیراز اور اس کے مناظر کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

خوشا شیراز و وضع بے مثالش خداوندا نگہدار از زوالش

(شیراز کیا ہی اچھا شہر ہے۔ اور اس کی وضع سے کوئی اور شہر لگا نہیں کھاتا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا نگران حال ہو تاکہ زوال سے محفوظ رہے)

ز رکنا آباد ما صد لوحش اللہ کہ عمر خضری بخشد زلالش

(نہر رکنا آباد پر اللہ کی سو سو برکتیں نازل ہوں کہ سینکڑوں تحسین و آفرین کا مستحق ہے اس لیے کہ اس کا میٹھا پانی خضر کی عمر بخشتا ہے۔ یعنی اس میں آب حیات کی تاثیر ہے)

میان جعفر آباد و مصلیٰ عبیر آمیز می آید شمالش

(جعفر آباد اور مصلےٰ کے درمیان باد شمال کے جھونکے خوشبو سے لدے ہوئے آتے ہیں)

بشیراز آئی و فیض روح قدسی   بخواہ از مردم صاحب کمالش

شیراز میں آ اور روح القدس کا فیض یہاں کے باکمال ہستیوں سے طلب کر۔

کہ نام قند مصری برد آنجا   کہ شیرینان ندادند انفعالش

قند مصر کا نام اگر کسی نے یہاں لیا تو یہاں کے شیریں لب حسینوں نے اسے سخت شرمندہ کیا ۔

صبا زاں لولی شنگول سرمست   چہ داری آگہی چون است حالش

اے صبا اگر تجھے اس رقاصہ شوخ و ظریف نشہ حسن میں سرشار کے حال کی کچھ خبر ہے تو مجھے بھی بتا کہ کس حال میں ہے۔

مکن بیدار ازیں خوابم خدا را   کہ دارم عشرتے خوش باخیالش

اے نسیم سحر مجھے چھیڑ کر بیدار نہ کر کیونکہ میں اس کے تصور میں مسرت انگیز عشرت میں ہوں ۔

ان اشعار میں رکن آباد اور جعفر آباد اور مصلی کا مذکور ہے اور ساتھ ہی شیراز کے باکمال لوگوں اور بالخصوص کسی حسین صورت کا بھی ذکر ہے جس نے خواجہ حافظ کی توجہ کو جذب کر رکھا تھا ۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ ؎

ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا آباد و گلگشت مصلی را

اے ساقی شراب جو کچھ بھی باقی ہے دے دے کیونکہ جنت میں نہر رکنا آباد کے کنارے اور مصلی کی گلگشت تو نہیں ہوگی۔ اس لیے ان دونوں کی موجودگی کے ساتھ جو کچھ مے نوشی کا لطف ہے باغ جنت میں میسر نہ ہوگا۔ اس لئے ہر وقت کوشش کر دست دید مغتنم شمار۔

ایک اور جگہ شیراز کے ایک خاص دلکش منظر کا ذکر کرتے ہیں کہ

فرقست ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست ‏ ‏ ‏ ‏ تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

آب خضر یعنی چشمۂ آب حیات" کی نسبت روایت ہے کہ "ظلمات" (بحر ظلمات کے کسی جزیرہ) میں ہے، "شیخ سعدی" بھی فرماتے ہیں "کہ آب چشمۂ حیوان اردن تاریکی است"۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ آب حیات سے بلی کر خضر تا قیامت زندہ رہے گا اس میں اور ہمارے پینے کے پانی میں بہت فرق ہے۔ آب حیات کا چشمہ تو ظلمات میں ہے، اور ہمارے پانی کا منبع "اللہ اکبر" ہے، کجا دنیوی زندگی اور کجا فنا فی اللہ و بقا ما بعد،

"رکن آباد" یا "آب رکنی" کے وصف میں ایک شعر اور بھی ہے۔

شیراز و آب رکنی و آں باد خوش نسیم ‏ ‏ ‏ ‏ عیبش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است

شیراز اور نہر رکن آباد اور نسیم کے فرحت افزا جھونکے ایسی باتیں نہیں کہ کوئی ان کا عیب بیان کرے اور اگر کسی کی نظر میں خال سیاہ روشن چہرہ پر عیب ہو تو نظر بد کے لیے اس کی موجودگی واجب ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خوب صورت چہرہ کے حسن کو خال نہ صرف نظر بد سے بچاتا ہے بلکہ اس کی خوبی کو دوبالا بھی کرتا ہے۔

نسیم باد مصلیٰ و آب رکناباد ‏ ‏ ‏ ‏ غریب را وطن خویش میبرد از یاد

مصلیٰ کی ہوا کے جھونکے اور رکنا آباد کے پانی کی روانی ہر ایک کو جو یہاں مسافرانہ وارد ہو اپنے وطن کی یاد بھلا دیتی ہے۔ وطن کی محبت ہر ایک شخص کو ہوتی ہے مگر نسیم مصلیٰ اور نہر رکنا آباد میں وہ کشش ہے کہ ہر ایک جو اپنے وطن سے بچھڑا ہو اسی کو اپنے وطن پر ترجیح دے کر یہاں مقیم ہونا پسند کرے گا۔

عماد فقیہ کرمانی کہتا ہے کہ

خوشا بہ جائے مصلیٰ و آب رکن آباد   کہ آں مفرح جاں دیں مقوی دل ہا

نہر رکن آباد کو رکن الدولہ حسن دیلمی دو پہاڑوں کے درمیان سے شیراز سے دو تین میل کے فاصلہ سے کھدوا کر لایا تھا۔ اس کے منبع کو جو ان پہاڑوں میں واقع ہے "تنگ اللہ اکبر" کہتے ہیں، رکن الدولہ کی وفات ۳۶۶ھ میں واقع ہوئی۔ یہ نہر شیراز کے باغ مصلیٰ اور باغ جہاں اور باغ نو اور تکیہ ہفت تنان اور چہل تنان اور حافظیہ کو سیراب کرتی تھی۔ لیکن اب اگرچہ نہر موجود ہے مگر پانی کی اس میں اتنی کمی ہے کہ مشہور ہے کہ اگر اس کے پانی سے وضو تازہ کرے تو ختم ہو جاتا ہے۔

خاک مصلیٰ

مصلیٰ کی زمین اسی نہر رکن آباد سے سیراب ہوتی تھی۔ یہ خاک اس لیے بھی متبرک ہے کہ خواجہ حافظ کا مدفن یہاں ہے۔ آپ کی وفات کی تاریخ بھی حسن اتفاق سے "خاک مصلیٰ" (۷۹۱ھ) سے نکلتی ہے یہ تاریخ مولانا جامی نے کہی ہے۔

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ   کہ شمعے بود از نور تجلی

چو در خاک مصلیٰ یافت منزل   بجو تاریخش از خاک مصلیٰ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (ملفوظات) کہ ایک روز میرے والد (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کے روبرو ایک شخص نے اپنا حال بیان کیا کہ شیراز میں سیاحت کے دوران میں وارد ہوا۔ خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی قبر شہر سے باہر واقع ہے اکثر رند اور میخوار اس جگہ جمع ہوتے ہیں۔ خواجہ خود فرما چکے ہیں کہ

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ   کہ زیارتگہ رندانِ جہاں خواہد بود

"ہمت" اصطلاح تصوف کی ہے۔ مراد یہ ہے ادھر متوجہ ہو گا تو تجھے
فیض حافظ سے تقویت روحانی ملے گی، اور میری تربت کی دنیا جہاں
کے رند زیارت کیا کریں گے۔

یہ لوگ اس جگہ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے ہیں اور محفل سماع و سرود
بھی گرم رکھتے ہیں، خواجہ حافظ کا ارشاد بھی ہے کہ

بر سر تربتِ من بے مے و مطرب منشیں   تا ببویت ز لحد رقص کناں برخیزم

(میری قبر پر شراب اور مطرب کے بغیر مت بیٹھ، تاکہ شراب کی بو اور گویے
سریلی اور رسیلی آواز کا اثر مجھ پر بھی ہو اور میں قبر سے وجد کرتا ہوا نکلوں)
شام تک ان لوگوں نے محفل گرم رکھی، آخر گھروں کو لوٹے، میں مسافر تھا۔
کہاں جاتا یہیں شب باش ہوا۔ اور کہا کہ خواجہ صاحب آج میں آپ
کا مہمان ہوں۔ بھوکا ہوں اور خرچ راہ بھی نہیں۔ پہر شب سے کچھ زیادہ
گذر چکا تھا۔ کہ رات کی تاریکی میں دیکھا کہ ایک مشعل میری ہی طرف ہوا
میں معلق آ رہی ہے۔ خوف زدہ ضرور ہوا۔ پھر دل کو کڑا کر کے انتظار کرنے
لگا۔ دیکھا کہ ایک شخص کے سر پر خوان ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں
مشعل ہے، جب دونوں قریب آئے تو مشعل والے نے باآواز بلند کہا
کہ مہمان حافظ کہاں ہے۔ میں ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا جواب دیا کہ
میں ہوں۔ کہا کہ میں سویا ہوا تھا خواجہ حافظ کو خواب میں دیکھا کہ مجھے
مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ ایک شخص میرے ہاں میرا مہمان ہے بھوکا
بھی اور زادِ راہ بھی نہیں۔ میں طعام حسب معمول تقسیم کر چکا تھا مگر خوش قسمتی
سے کچھ بچ رہا یہ حاضر ہے اور یہ پانچ اشرفیاں زادِ راہ ہیں۔

سوانح حیات حافظ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خواجہ حافظ حقیقی شاعر تھے اور اس طبقہ کے لوگوں کا عملی زندگی میں بہت کم حصہ ہوتا ہے اور نہ مرد و عمل کے مناسب ملتی ہے۔ اس لیے شعرا کو ہمیشہ تنگی معاش کی شکایت رہی ہے، چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں ؎

فلک بمردم سفلہ معدہ دام مراد   تو اہل دانش و فضلی ہمی گناہت بس

آسمان تو کمینہ لوگوں کی پرورش کرتا ہے، تو اہل دانش اور فضل ہے تیرا یہی گناہ کافی ہے کہ تجھے خوار و خستہ بنا رکھا ہے، بات اصل میں یہ ہے کہ کسی کی دانش اور فضل سے کسی کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا، شعرا کا کلام خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو آخر باتیں ہی تو ہیں اور باتوں کے لڈو سے شکم پروری ممکن رہی۔ لوگوں کا بھی عجیب حال ہے ۔ ہمارے ایک ہمعصر کے اعلیٰ افکار کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ چار وانگ عالم میں ہے۔ اس نے زندگی جس طرح بھی بری بھلی تھی بسر کر ہی لی، وفات کے بعد اس کا روضہ رنگین تعمیر کیا گیا۔ سالانہ عرس بھی ہوتا ہے اور پاکستان بلکہ بیرونی دنیا میں آپ کی برسی پر خراج عقیدت بھی ادا کیا جاتا ہے، بلکہ آپ کا کلام شرح لکھنے والوں کا ایک ذریعہ روزگار بن گیا ہے، اور آپ کے بارہ میں اتنا کچھ چند سالوں میں لکھا گیا ہے کہ آپ کا اپنا کلام اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ غنی نے سچ کہا ہے کہ ؎

"نیا شد شعر من مشہور تا جاں در بدن باشد   کہ بعد از مرگ آہو نافہ بیروں می دہد بورا"

مرحوم کے اشعار تو مرحوم کی زندگی میں مشہور ہو چکے تھے مگر عزت افزائی بعد از مرگ ہی ہوئی جس کا فائدہ مرحوم کو تو نہیں شاید اس بت کے پجاریوں کو کچھ ہو۔

خواجہ حافظ شیراز اور اس کے دلکش مناظر کا ذکر اس لیے فرماتے ہیں کہ آپ کو اس سے دلبستگی اور وابستگی مدت العمر رہی، عسرت کی شکایت آپ ضرور کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دل برداشتہ ہو کر کہتے ہیں کہ

آب و ہوائے پارس عجب سفلہ پرور است ۔۔۔ کو ہمرہے کہ خیمہ ازیں خاک بر کنم

ایران کی آب و ہوا سخت سفلہ پرور ہے اگر کوئی رفیق ہمسفر مل جاتا تو یہاں سے لدیا بستر باندھ کر چل دیتا۔

سخن دانی و خوش خوانی نمی ورزند در شیراز ۔۔۔ بیا حافظ کہ ما خود را بملک دیگر اندازیم

سخن گوئی اور خوش کلامی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی قدر و قیمت کو شیراز میں کوئی نہیں جانتا، بہتر یہی ہے کہ کسی دوسرے ملک میں ڈیرہ جمایا جائے۔

ما آزمودہ ایم دریں شہر بخت خویش ۔۔۔ باید برون کشید ازیں ورطہ رخت خویش

میں اس شہر شیراز میں قسمت آزمائی کر چکا ہوں۔ تلخ تجربہ کے بعد مناسب یہی ہے کہ اس طوفان بے تمیزی سے نکل کر سفر اختیار کیا جائے۔

خواجہ حافظ کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک دفعہ شیراز سے یزد میں آئے، والئی یزد کی مدح میں غالباً قصیدہ کہا ہوگا۔ خواجہ کے دیوان میں تو کوئی قصیدہ مدحیہ نہیں ملتا۔ البتہ چند غزلیں ہیں اور ان میں بھی مدحیہ اشعار گنتی کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ کی طبیعت مدح سرائی کے لیے موزوں نہ تھی، موجودہ دیوان کے آخر میں چند مدحیہ قصائد جو دیگر شعرا نے کہے اور ان کی کلیات میں موجود ہیں کسی نے کسی وقت خواجہ کے دیوان میں شامل کر دیئے۔ یزد میں شاہ سے ملے اور اپنا کلام مدحیہ پیش کیا۔ بعض تذکرہ نویسوں کی رائے یہ ہے کہ یہ غزل ہی تھی جس کا مطلع ہے۔

ولائی جہاں نصرت دین خسرو کامل یحییٰ بن مظفر ملک عالم وعادل

اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ نصرت الدین یحییٰ خست میں مشہور تھا۔ اس لیے کچھ صلہ نہ دیا۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں کہ

دل نہادی جان من بر وعدہ شاہ مظفر کس نمی داند کہ کارش از کجا خواہد کشاد

ای جان من شاہ مظفر کے وعدہ پر نہ جا، کوئی نہیں جانتا کہ اس کی مشکل کاحل کہاں سے ہوگی، عموماً جس سے توقع ہوتی ہے اس کی طرف سے مایوسی ہوتی ہے، اللہ تعالےٰ کچھ ایسا سامان غیب سے پیدا کر دیتا ہے کہ کام اس شخص سے بن جاتا، جس کا خیال بھی نہیں ہوتا اس کی تصدیق خواجہ آپ بیتی سنا کر کرتے ہیں ؎

رو توکل کن نبیسانی کہ اوک ملک من نقش بر صورت کہ زد رنگے دگر بیروں نتاد

مولانا صاحب مشورہ یہ ہے کہ اللہ پر توکل کر وہ خالق ہے اور رب العالمین تیرا بھی رازق ہے، اس حقیقت سے تو واقف نہیں۔ مجھ پر جو کچھ گذری وہ یہ ہے کہ میں نے مدحیہ اشعار اس توقع پر کہے کہ ممدوح مناسب صلہ دیگا۔ مرے نوک قلم سے صفحہ قرطاس پر جو کچھ لکھا گیا اس کا مفہوم یہی کچھ تھا مگر جو رنگ بیں جمانا تھا وہ تو نہ جما کچھ اور رنگ پیدا ہو گیا ؎

شاہ ہرمزم ندید و بے سخن صد لطف کرد شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچ نداد

شاہ یزد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مدح بھی کہی لیکن اس نے مجھے کچھ نہ دیا۔ شاہ ہرمز سے نہ میں ملا اور نہ اس کی مدح میں کچھ کہا مگر اس نے غائبانہ مجھ پر سو لطف و کرم کیا۔ اول الذکر سے میری توقع وابستہ تھی، مایوس ہونا پڑا، شاہ ہرمز کے دل میں اللہ نے میری طرف مہربانی کا جذبہ خود بخود پیدا کر دیا۔

کار شاہاں این چنیں باشد تو ای حافظ مرنج داور روزی رساں توفیق نصرت شاں دہاد

اے حافظ بادشاہوں کے کام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں اس لیے رنجیدہ ہونا
بے فائدہ ہے۔ البتہ دعا کر اللہ تعالےٰ جو سب کو روزی دیتا ہے انہیں بھی
نصرت عطا فرمائے۔ قطعہ کے آخری شعر میں لفظ "نصرت" کا اشارہ اگر نصرت الدین
یحیٰی کی طرف ہے تو لطف پیدا ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ یحیٰی نے اپنے وزیر کی معرفت کچھ مناسب صلہ
دینے کا وعدہ ضرور کیا ہوگا۔ خواجہ ایک غزل کے مقطع میں جس کا مطلع ہے
دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن، درکوئے او گدائے برخسروی گزیدن؛ کہتے ہیں کہ

گوئی برفت حافظ از بادشاہ یحیٰی
یارب بیادش آور درویش پروریدن

اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ حافظ بادشاہ یحیٰی کے یاد سے اتر گیا تو دعا
ہے کہ اے خدا اس کو درویش پروری یاد دلا۔ لیکن بعض نسخوں میں یحیٰی کی جگہ
"منصور" ہے۔ محمد یسین تذکرہ "حافظ شیریں سخن" میں لکھتا ہے کہ "آملائے
پژمان" مقدمہ باب دوم دیوان میں لکھتا ہے کہ خواجہ نے مدح شاہ یحیٰی
میں بھی غزل کہی جس کے مطلع کا پہلا مصرع "دارائے جہاں نصرت دیں خسرو
کامل" ہے محمد یسین اس پر تنقید کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس غزل میں یہ شعر
ہے۔

می نوش و جہاں گیر کہ از زلف کمندت
شد گردن بدخواہ گرفتار سلاسل

یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے شاہ منصور نے زین العابدین کو گرفتار
کرکے قلعہ "سلاسل" واقعہ "شوستر" میں قید کیا تھا۔ خواجہ حافظ شاہ یحیٰی
اور شاہ منصور دونوں کا ہمعصر ہے اس لیے یہ تاریخی واقعہ جو منصور سے
منسوب کیا گیا ہے دراصل شاہ یحیٰی ہی کے متعلق ہے۔ کیونکہ غزل کے تشریح
میں خواجہ حافظ شاہ یحیٰی کا نام لیتا ہے اور تمام غزل مدحیہ ہے۔

بہر حال خواجہ کو اپنی مفلسی کا شکوہ ضرور ہے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں کہ ؎

شیراز معدن لب لعلست و کان حسن   من جوہری مفلس از آنرو مشوشم

شہریست پر کرشمہ و خوباں ز شش جہت   چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

شیراز تو حسن و خوبی کی کان ہے۔ اگرچہ میں حسن شناش جوہری ہوں مگر مفلس ہوں اس لیے تشویش میں ہوں کہ کسی کے لب لعل کو بوسہ دوں یا کسی کے حسن کا خریدار بنوں تو کس برتے پر شہر میں ہر طرف حسن کرشمہ ساز ہے اور ہر خریدار کو دعوت دیتا ہے مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں اگر ہوتا تو میں شش جہت خرید لیتا جو کرشمہ سے معمور ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ ؎

شہریست پر حریفاں وز ہر طرف نگارے   یاراں صلائے عشقست گر می کنید کارے

ہر تار موئی حافظ در دست زلف شوخے   مشکل تواں نشستن درایں چنیں دیارے

کہ شہر تو حریفوں سے بھرا ہوا ہے اور ہر طرف حسین صورتیں دعوت عشق دے رہی ہیں۔ اگر کچھ کام کرنا ہو تو یہی عشق بازی ہے جو یہاں میسر ہے۔ میرا بال بال ہر ایک شوخ کی زلف میں بندھا ہوا ہے۔ جب یہ کیفیت ہو اور مفلسی کچھ کام نہ کرنے دے تو ایسے شہر میں مجھ جیسے مفلس قلاش کا قیام مشکل ہے۔ کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم ، کہ حریف تو دلو عشق دیں اور میں منہ دیکھتا رہ جاؤں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ ؎

چہ شکر ہاست دریں شہر کہ قانع شدہ اند   شاہبازان طریقت بمقام مگسے

کہ اس شہر میں جو نعمتوں کا گھر ہے کون سی مٹھاس ہے کہ شاہبازان طریقت قناعت کئے بیٹھے ہیں۔ بوجہ مفلسی جب شیراز باہمہ حسن و خوبی کھٹکنے لگا تو

سفر کی ٹھان لی۔ اس لیے کہتے ہیں کہ ؎

من کہ زوطن سفر نگزیدم بعمر خویش　　در عشق دیدن تو ہواخواہ غربتم

میں نے تمام عمر کبھی سفر کی زحمت گوارا نہ کی مگر تیرے دیدار کی کشش اتنی غالب ہے کہ غیر الوطنی کو ترجیح دیتا ہوں، غرض پہلا سفر اگرچہ کچھ دور کی مسافت نہ تھی "یزد" کی طرف پیش آیا۔ اسی ایک سفر میں جو کچھ مایوسی اور تکلیف کا سامنا ہوا کافی تلخ تجربہ تھا کہ فرماتے ہیں

گر ازیں منزل ویراں بسوئے خانہ روم　　دگر آنجا کہ روم عاقل و فرزانہ روم

اگر میں اس ویران مقام سے لوٹ کر اپنے گھر بخیر و عافیت پہنچ جاؤں تو پھر اگر سفر کی خواہش دل میں گدگدی لے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کروں گا یعنی یہ حماقت تھی کہ سفر کی ٹھان لی اس کے بعد ایک دفعہ اپنے وطن میں پہنچ جاؤں تو سفر کا کبھی نام نہ لوں کہ عقل کا یہی فتویٰ ہے۔

زیں سفر گر بسلامت بوطن باز رسم　　نذر کردم کہ ہم از راہ بمیخانہ روم

ایک دفعہ اگر اس سفر سے صحیح و سلامت بخیر و عافیت وطن میں پہنچ جاؤں تو میں نے نذر مان رکھی ہے کہ راستہ ہی سے سیدھا میخانہ کی طرف رخ کروں گا ؎

تا بگویم کہ چہ کشفم شد ازیں سیر و سلوک　　بدر صومعہ با بربط و پیمانہ روم

"کشف" اور "سیر و سلوک" تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ سالک اسے کہتے ہیں جو مجاز سے حقیقت کی طرف مقامات صبر و رضا و شکر و توکل وغیرہ طے کرتا ہوا منزل معرفت پر پہنچتا ہے۔ اور جو کچھ نکات معرفت اس پر اس سیر انفسی و آفاقی، میں منکشف ہوتے ہیں اسے "کشف" کہتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر اس سیر کے

دوران میں کیا کچھ منکشف ہوا۔ جسے اصطلاح میں "حال" کہتے ہیں تو وہ ایک ایسی مسرت انگیز بات ہے کہ میں شراب خانہ کے دروازہ پر بربط بجاتا ہوا۔ پیمانہ ہاتھ میں لیے، وجد کرتا ہوا جاؤں گا۔ یعنی اتنی بات منکشف ہوئی کہ "سرود و مستی" ہی اس زندگی میں ایسی چیز ہے جسے اختیار کرنا چاہیئے۔ ؎

ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی کیں کیمیائے ہستی قارون کند گدا را

مفلسی کے دن ہوں تو عیش و مستی میں غم غلط کرنا چاہیئے۔ لفظ عیش بہ از عیش ۔ کیمیائی ہستی یعنی عیش و مستی ایسی ہے کہ فقیر کو امیر بنا دیتی ہے۔ اس شعر کی خوبی کو نفسیات کے عالم خوب سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں آج کل اگر آپ کسی تفریح گاہ سینما وغیرہ کی طرف جائیں تو وہاں لوگوں کا ہجوم نظر آئے گا اور ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جن کو دو دفعہ پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا اور ویسے بھی آج کل قحط کا یہ حال ہے کہ ایک متوسط الحال کے اہل و عیال کا گذارہ فراغت کیا عسرت سے بمشکل ہوتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ زندگی کی تلخی کو کم کرنے کے لیے لوگ جو کچھ تھوڑا بہت کماتے ہیں تفریح کی نذر کر دیتے ہیں۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ ؎

شراب تلخ می خواہم کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش

شراب کا ذائقہ تلخ تو ہے مگر اس کے نشہ میں دنیا کے شور و شر سے تو کچھ عرصہ نجات مل جاتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

مے نوشی سے میری غرض یہ نہیں کہ عیش و نشاط کا دلدادہ ہوں۔ میں تو

مجبوری چاہتا ہوں اور مجبوری میں سکون ہے، دنیوی تفکرات اور غم واندہ سے تو چھٹکارا ہو جاتا ہے، یہی فلسفۂ تحت الشعور ہر ایک کے دل میں کارفرما ہے جو نشہ کی عادت ڈال لیتے ہیں لیکن یہ فریب نفس ہے نفس انسانی حظ کا طالب ہے اور اسی حظ نفس کا نتیجہ ہے کہ انسان "رھبانیت" اختیار کرتا ہے۔ اس میں اور شراب نوشی میں اصولاً کچھ فرق نہیں، سعدی کا ارشاد ہے کہ ؎

برہمن اگر بے عیبت را کہ ہرگز | نخواہد دیدروئے نیک بختی
تن آسانی گزیند خویشتن را | زن و فرزند بگزارد بسختی

جو لوگ تجرید پسند کرتے ہیں وہ بھی نادانستہ "حظ نفس" چاہتے ہیں،

معاادستی ملبس ہمیں آزار بود | ورنہ در کنج حرم آسودگی بسیار بود

زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ اور اسی جدوجہد کو "آزار" سے تعبیر کرتے ہیں، جو لوگ آسودگی کے طالب ہیں وہ مقصد اور منشاء کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب زندگی اسی جدوجہد میں ہے، جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں۔ وہ مقصد زندگی کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اس "آزار" ہستی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے تنگ آکر "خودکشی" کرتے ہیں، خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ ؎

"تو مے بجد و جہد نہادند وصل دوست | تو مے دگر حوالہ تقدیر می کنند"

دنیا میں "دونوں قسم کے آدمی موجود ہیں، ایک تو مقصد زندگی جدوجہد سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور دوسرے "تقدیر" پر شاکر ہیں۔ اور جو شاکر نہیں وہ تیسرے قسم کے آدمی ہیں جو تقدیر کو کوستے ہیں، حقیقت یہی ہے کہ "لیس الانسان الا ماسعی" انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے سعی کرتا ہے

اور ہر ایک ذہنی اور مادی ترقی اسی "سعی" سے وابستہ ہے، یہ ایک مستقل موضوع ہے، فہم و تفہیم کے لیے یہی اشارات کافی ہیں۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب سا روشن دماغ جو "سعی" کے راز سے واقف تھا کیوں توکل اور قناعت دینا پر زور دیتا ہے، ایسا توکل اور قناعت کہ انسانی قویٰ مفلوج ہو کر رہ جائیں۔ توکل اور قناعت کا مقام بہت بلند ہے وہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریست　　راہرو گر صد ہنر دارد توکل بایدش

پرہیزگاری اور عقل و دانش پر بھروسہ کرنا کہ یہی زندگی کا سہارا ہیں۔ طریقت میں کفر ہے، سالک اگر سو ہنر رکھتا ہے ان پر تکیہ نہ کرنا چاہیئے، بہرحال "توکل علی اللہ" مناسب ہے، یہی وہ حقیقت ہے جس پر اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰ کو متنبہ فرمایا کہ "اے موسےٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے تو عرض کی "عصا" اس سے میرے دیئے ہزاروں کام نکلتے ہیں۔ اپنے بھیڑ بکری کے ریوڑ کے لیے پتے جھاڑتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا ہاتھ سے پھینک دے جب پھینک دیا تو اس عصا کی حقیقت منکشف ہوئی کہ خطرناک سانپ ہے آپ ڈر کر اس سے کنارہ کرنے لگے تو فرمایا "مت ڈر، اسے پکڑ لے" اٹھایا تو وہ وہی عصا ہی تھا۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ "ایں عصا چہ بود تیاسات و دلیل"۔ علامہ محمود شبستری "تذکر و عبرت و تدبر و تفکر" کی تعریف کے بعد کہتے ہیں

؎ دعوے دو دانا ست ایں رہا کن　　چو موسےٰ اندریں ترک عصا کن

محض عقل کا سہارا لینا اسباب کو مسبب الاسباب یقین کرنا ہے یہ کفر ہے، ہم مناسب قیام پر آگے چل کر وہ واقعات بھی بیان کریں گے جبکہ اثر کے تحت خواجہ حافظ دنیا کے شور و شر سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

المختصر خواجہ صاحب نے یزد کے سفر کے بعد آئندہ سفر سے توبہ کی،
ایک دفعہ خیال میں آیا کہ چلو بغداد میں قسمت آزمائی کریں مگر یزد کے سفر کلفت
نے باز رکھا، فرماتے ہیں :-

رہ نبردیم بہ مقصود خود اندر شیراز | خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد گرفت

اور نیز :-

از گل فارسیم غنچہ عیشی نشگفت | حبذا دجلہ بغداد و می روحانی

اس وقت احمد جلایر عراق عرب کا والی تھا، خواجہ کو بغداد میں تشریف لانے
کی دعوت دی، آپ نے عذرخواہی کی اور ایک غزل لکھ کر ارسال کر دی:-

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان | احمد شیخ اویس حسن ایلکانی

سلطان احمد شیخ اویس حسن ایلکانی کے عدل و داد کی وجہ سے ملک میں امن
اور آسودگی کا دور ہے اس لیے میں اس پر اللہ کی حمد و ثنا کہتا ہوں کہ ایسا
سلطان عادل عنایت فرمایا :-

خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد | آنکہ می زیبد اگر جاں جہانش خوانی

سلطان احمد خود خان ہے اور خان کا بیٹا ہے بلکہ شہنشاہ اور شہنشاہ
کی نسل ہے، زیب دیتا ہے اگر تو ایسے جان جہان سے مخاطب کرے:-

دیدہ نادیدہ باقبال تو ایماں آورد | مرحبا ای بہمہ لطف خدا ارزانی

وہ آنکھ جس نے تجھے دیکھا تک نہیں تجھ پر بن دیکھے ایمان لائی، خدا کو بھی
تو کسی نے نہیں دیکھا مگر ایمان اللہ پر سب کا ہے مرحبا اللہ تعالے کا لطف و
کرم تجھ پر ارزانی ہو رہا ہے :-

برشکن طرہ ترکانہ کہ در طالع تست | بخشش و کوشش قاآنی و چنگیز خانی

اپنی ترکانہ زلف کے پیچ و خم کو ذرا اور بھی تابدار کر کیونکہ قاآنی اور چنگیز خانی

حملوں سے جس طرح لوگ اسیر ہوئے اور ان کی جان بخشی ہوئی۔ تو تیری کاکل میں بھی تاب و طاقت ہے۔ ؎

ماگر بے تو برآید بدو نیمش بزند — دولت احمدی و معجزہ سلطانی

آنحضرت کا معجزہ شق القمر مشہور ہے، آنحضرت کا اسم مبارک احمدؐ ہے اور خواجہ ممدوح کا نام بھی احمدؔ ہے آنحضرتؐ شاہ عرب ہیں اور ممدوح بھی شاہ عراق عرب ہے۔ اس لیے اس نام اور مقام سلطنت کی رعایت کی وجہ سے یہ معجزہ ممدوح بھی سرزد ہو سکتا ہے کہ اگر چاند ممدوح کے بغیر اکیلا طلوع ہو تو "دو نیم" ہو جائے۔ ؎

جلوہ حسن تو دل می برد از شاہ و گدا — چشم بد دور کہ ہم جانی و ہم جانانی

امیر ہو کہ فقیر، شاہ ہو یا گدا تیرے حسن کا جلوہ دیکھ کر دل ہاتھ سے دے دیتا ہے۔ چشم بد دور تو جان بھی ہے اور جاناں بھی ہے۔ ؎

گرچہ دیم بیاد تو قدح می نوشیم — بعد منزل نبود در سفر روحانی

بغداد کو دجلہ نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک مشرقی اور دوسرا مغربی بغداد ہے، آخر الذکر کو "الروحاء" اور مشرقی حصہ کو "الزوراء" کہتے۔ اس لیے روحاء سے روحانی سفر مراد سفر بغداد ہے۔ لیکن "راح"، اور "روحانی" شراب کو بھی کہتے ہیں، چنانچہ خواجہ کے اشعار ہی میں اس کو اس طرح باندھا گیا ہے۔ ؎

می دمد صبح و کلہ بست سحاب — الصبوح الصبوح یا اصحاب

پو پھٹ رہی ہے اور گھٹا چھائی ہوئی ہے اے ہم نشینو، "صبوحی" یعنی صبح کے وقت کی شراب لاؤ۔ ؎

تحفت زدہ است گل بچمن — راح چوں لعل آتشیں دریاب

گل نے چمن میں تخت زریں بچھا رکھا ہے۔ "زر گل" اس زرد زرد سی شے کو کہتے ہیں جو پھول کی پنکھڑیوں کے درمیان ہوتی ہے اور اسی کی خوشبو ہوا میں پھیلتی ہے۔ ایسے وقت "راح" یعنی سرخ رنگ کی انگارہ کی طرح دہکتی ہوئی شراب طلب کرو۔ ؎

بر بیں بلال محرم بخواہ ساغر راح — کہ ماہ امن و اماں ست و سال صلح و صلاح

ماہ محرم کی پہلی تاریخ کا چاند دیکھ کر شراب کا پیالہ پیو کہ امن و اماں کے مہینے اور صلح و صلاح کے سال کی بشارت دے رہا۔

"گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم" کا مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ جسمانی لحاظ سے آپ سے دور ہوں لیکن آپ کی یاد میں جام شراب پی رہا ہوں۔ روحانی سفر میں بعد یا دوری نہیں ہوتی جو مادی زندگی میں مشاہدہ ہوتی ہے۔

از گل پارسیم غنچہ عیشے نشگفت — حبذا دجلہ بغداد و مے ریحانی

عیش عربی لفظ ہے اور معنی "زندگی" ہے۔ یعنی میرا غنچہ دل یا زندگی خاک ایران سے کھلنے میں نہیں آتا۔ کیا ہی اچھا بغداد کا دریا دجلہ اور بغداد کی شراب ہے کہ اس سے کار بستہ کے کھلنے کی توقع ہے۔ ؎

اے نسیم سحری خاک رہ یار بیار — تا کند حافظ ازاں دیدہ جان نورانی

اے نسیم سحر دوست کے راستے کی خاک اٹھا کر لا تاکہ حافظ اسے سرمہ چشم بنائے اور دیدہ جان روشن کرے۔

غالباً یہ غزل خواجہ نے ۷۶۵ھ میں کہی جب قطب الدین محمود نے سلطان اویس کی مدد سے شیراز اپنے بھائی شاہ شجاع کو بے دخل کر کے لیا۔ مفصل حالات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے خواجہ کے "سفر ہرمز" کا بھی ذکر کیا ہے لیکن

آپ خود ایک قطعہ میں جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے کہتے ہیں کہ شاہ ہرمزم ندید
دل سخن صد لطف کرد، کہ شاہ ہرمز سے میری ملاقات بھی نہ ہوئی اور میں نے
اس کی مدح میں بھی کچھ نہ کیا مگر مجھ پر ہر طرح لطف و کرم سے نوازش فرمائی
یہ ممکن ہے کہ خواجہ صاحب ایک دفعہ ہرمز تک آئے ہوں مگر نہ تو شاہ سے
ملنے کا ارادہ تھا اور نہ اس سے ملاقات ہوئی مگر جب شاہ کو معلوم ہوا کہ آپ
آئے بھی اور ملنے کے بغیر واپس چلے گئے تو کسی کے ہاتھ روپیہ بھیج دیا ہو۔
قصہ یہ ہے کہ خواجہ کا ہمعصر دکن (ہندوستان) میں محمود شاہ بہمنی بادشاہ تھا،
جو عالم اور علم و حکمت دوست تھا۔ بقول مورخ فرشتہ لوگ اس کو "ارسطو" کہتے
اس کے دربار میں منتخب روزگار کا اجتماع ہو رہا تھا۔ وزیر "میر فضل اللہ انجو"
نے ایک روز عرض کیا کہ اگر خواجہ شمس الدین محمد حافظ بھی آپ کے دربار کے
ایک رکن ہوتے تو پھر کسی بات کی کمی نہ رہتی۔ نام تو سنا ہوا تھا۔ اور غالباً کلام
بھی نظر سے گذرا ہوگا۔ وزیر میر فضل اللہ کو کہا کہ جتنا روپیہ درکار ہو خواجہ
کی خدمت میں بھیج دو اور یہاں آنے کی دعوت دو، اس وقت دو تاجر
خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی نے ایران اور دکن میں تجارتی سلسلہ
قائم کیا ہوا تھا۔ انہی دو کے سپرد یہ خدمت ہوئی کہ خواجہ کو دکن میں لائیں،
خواجہ کے ہاتھ میں روپیہ آیا تو بقول شیخ سعدی "قرار بر کف آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال" کچھ تو قرض کی ادائگی میں اٹھ گیا اور
چند بیوگان و یتامیٰ کی نذر کیا۔ جو باقی بچا وہ زاد راہ لے کر ہرمز تک آئے
یہاں ایک مفلوک الحال آشنا سا تھا یہ روپیہ بھی اسے دے دیا۔ تاجروں
نے کہا کہ روپیہ کا فکر نہ کریں ہم زاد راہ کے کفیل ہیں، اتفاق تلاطم کہ بحر
میں امواج اٹھ رہی تھیں اور کشتیاں خس و خاشاک کی طرح بہ رہی تھیں۔

شاید خواجہ نے پہلی دفعہ یہ خطرناک نظارہ دیکھا۔ وہیں بیٹھ کر ایک غزل لکھی۔ اور تاجروں کے حوالہ کی۔

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد۔ بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

ایک دم غم سے بسر کرنا دنیا جہاں کی مسرتیں بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ مناسب یہی ہے میری فقیرانہ گودڑی شراب کے عوض فروخت کر دو کہ اس سے بہتر سودا اور کوئی نہیں۔

بکوی می فروشانش بجامے برنمی گیرد
زہے سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

مشکل یہ ہے کہ یہ دلق دیا۔ اس لائق بھی نہیں کہ می فروش اسے شراب کے عوض خرید لے، اس سجادہ تقوی کی کیا بات ہے کہ اس کے عوض ایک پیالہ شراب بھی نہیں ملتا۔

رقیبم سرزنش ہا کرد کز ایں باب رخ برتاب
چہ افتاد ایں سرما کہ خاک در نمی ارزد

رقیب نے بہت سرزنش مجھے کی کہ میں کسی طرح اس دروازہ سے منہ موڑ لوں مگر خدا جانے میرے سر پر کیا افتاد پڑی ہے کہ اس دروازہ کی خاک سے جدا نہیں ہوتا، بھلا ایسی شے اور کہاں میسر ہو سکتی۔

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہی خوشترا است اماّ بترک سر نمی ارزد

تاج سلطانی کی عظمت تو ظاہر ہی ہے مگر اس میں جان کا خطرہ بھی پوشیدہ ہے اس لیے کلاہ تو بہت ہی اچھا ہے مگر نہایت مہنگا ہے کہ اس کے ساتھ سر کٹنے کا خطرہ عظیم ہے۔

بس آسانی نمود اول غم دریا ببوئی سود
غلط کردم کہ ہر موجش بصد گوہر نمی ارزد

دریائی سفر کی تکلیف منافع کی امید پر کچھ آسان قابل برداشت معلوم ہوتی ہے۔ نہیں نہیں میں غلطی کر رہا ہوں اس کی ایک ایک موج کی برابری سو گوہر بھی نہیں کر سکتے۔ ؎

چو حافظ در قناعت کوش واز دنیای دوں بگذر، کہ یک جو منت دوناں بصد من زر نمی ارزد

حافظ کی طرح کوشش کر کہ تو بھی قناعت پیشہ ہو اور کمینی دنیا سے گذر جا کہ کمینے لوگوں کی منت و خوشامد ایک جو کے برابر کی جائے تو سو من سونے کی قیمت اس کے مساوی نہیں ہو سکتی۔

تاجروں نے میر صاحب کی خدمت میں غزل پیش کیا اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ میر صاحب نے محمود شاہ کے گوش گذار کی، بادشاہ نے اور روپیہ اور ہندوستان کے تحائف خواجہ کی خدمت میں ارسال کئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب خواجہ حافظ یزد کی طرف جا رہے تھے۔ اصفہان کے راستہ سے گذرے۔ اصفہان آپ کے والد کا مولد تھا اور یہاں شاید کچھ رشتہ دار اور دوست آشنا بھی تھے، کچھ دن ان کے پاس رہے، چنانچہ اس صحبت کو کبھی نہ بھولے اور بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے کہ ؎

روز وصل دوستداراں یاد باد　　　یاد باد آں روزگاراں یاد باد

اس کا ایک شعر ہے کہ ؎

گرچہ صد رود است در چشمم مدام　　　زندہ رود و باغ کاراں یاد باد

زندہ رود، مخفف زاینده رود ہے، اسی نہر یا پہاڑی نالہ کے کنارہ پر باغ کاران ہے۔ اس کے آثار اب بھی اصفہان میں پائے جاتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میری آنکھیں ہی سو نہریں بہا رہی ہیں لیکن اس پر

بھی زندہ رود اور باغ کا ماں بھول نہیں سکتا۔ ایک غزل کا مطلع ہے

سلیمی منذ حلت بالعراق   الاقی من نواها ما الاقی

اس کا ایک شعر ہے ؂

خرد در زندہ رود انداز و می نوش   بگلبانگ جوانان عراقی

عقل کو زندہ رود میں ڈبو دے اور جوانان عراق کے ترانوں کے ساتھ شراب پی۔

مگر شیراز کو اصفہان پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے

وصال دوست عمر جاوداں به   خداوندا مرا آں ده که آں به

معشوق کا وصل عمر جاوداں سے بہتر ہے۔ اے خدا مجھے بھی کچھ عنایت فرما جو یہی بہتر ہے، یعنی وصل دوست۔

اس غزل کا شعر ہے کہ ؂

اگرچه زنده رود آب حیات است   ولے شیراز ما از اصفهان به

اگرچہ زندہ رود آب حیات ہے اور آب حیات پی کر خضر کی طرح حیات جاوداں ملتی ہے، مگر مجھے شیراز میں وصل دوست حاصل ہے اور وصل دوست پر عمر جاوداں قربان کی جا سکتی ہے اس لیے میرا شیراز اصفہان سے بہتر ہے اور مجھے شیراز ہی میں اس چند روزہ زندگی میں رہائش مجبوب ہے

معاصران حافظ

یہاں تک تو ہم نے خواجہ کی آپ بیتی آپ ہی کی زبانی سنائی مگر خواجہ کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ افکار عالیہ کے بیان سے پیشتر مناسب ہے کہ اس ماحول کا بھی ذکر کیا جائے جس میں آپ کی پرورش ہوئی اور جس کے اثر سے کوئی شخص کسی زمانہ میں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک اس

کا صحیح نقشہ سامنے نہ ہو خواجہ کے بعض اشعار جو معاصرین کے بارہ میں لکھے ہیں سمجھنا مشکل ہے، خواجہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں کہ ؎

بعہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحاق   بہ پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

شاہ ابو اسحاق کے عہد میں ملک فارس پنج اشخاص سے آباد تھا جو نادرہ روزگار تھے، ؎

نخست پادشہے ہمچو او ولایت بخش   کہ جان خویش بپرورد و داد عیش بداد

سب سے پہلے خود شاہ ابو اسحاق تھا کہ بخشش کا یہ عالم تھا کہ جس کو چاہا کسی حصہ ملک کا والی بنا دیا۔ اپنی زندگی بھر داد عیش بھی خوب دی۔ ؎

دگر تو ہم چو حاجی قوام دریا دل   کہ نام نیک ببرد از جہاں بخشش و داد

دوسرا اسلام کا حامی اور سرپرست شیخ محمد الدین کہ اس سے بہتر روئے زمین پر آسمان نے بھی کوئی قاضی نہ دیکھا اور نہ اسے یاد ہے کہ اس کا نظیر پہلے کبھی کوئی تھا۔ ؎

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف   زہیں ہمت او کار ہائے بستہ کشاد

دوسرا شہنشاہ ملک عقل و دانش عضد کہ جس کے تدبر سے مشکل سے مہمات ملکی کی گتھی سلجھتی رہی۔ ؎

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین   بنائے کار موافق بنام شاہ نہاد

دوسرا باقیات الصالحات میں سے شیخ امین الدین جو یادگار ابدال تھا۔ اس نے بادشاہ کے نام اور کاروبار سلطنت میں موافقت پیدا کی۔ ؎

دگر تو ہم چو حاجی قوام دریا دل   کہ نام نیک ببرد از جہاں زبخشش و داد

دوسرا حاجی قوام الدین جو دریا کی طرح فراخ دل واقع ہوا تھا، اس نے اپنا نیک نام جہاں میں بخشش اور داد و دہش سے زندہ ہے۔

نظیر خویش نگذاشتند و بگذشتند   خدائے عزوجل جملہ را بیامرزاد

اپنا مثل پیچھے نہ چھوڑا اور چل بسے اللہ تعالےٰ عزوجل سب کی مغفرت فرمائے

ہم لکھ چکے ہیں کہ خواجہ حافظ کی طبیعت مدح گوئی کے مناسب واقع نہ ہوئی تھی، کسی مدح کہی تو مختصر ایک غزل یا غزل کے دو تین اشعار ہیں، لیکن منہ پر کسی کے اوصاف بیان کرنا خواہ صحیح ہی ہوں تو شامد بھی ر جاتی ہے انہی کے مدح میں کچھ شعر کہے جب یہ لوگ جہاں سے گذر گئے، تو کس درد منداں کے ساتھ ان کی حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور مدحیہ الفاظ بھی وہی دہراتے ہیں جب ان کی زندگی میں پہلے کہہ چکے تھے۔ ان چیدہ ہستیوں کے حالات تاریخی ہیں ذیل میں ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔

شاہ ابواسحاق

خواجہ حافظ کے معاصرین میں تخت دہلی پر فیروز شاہ تغلق اور دکن میں محمود شاہ بہمنی اور بنگالہ میں غیاث الدین بن اسکندر متمکن تھے۔ فارس میں طوائف الملوکی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انتہائی بدامنی کا دور تھا کسی شخص کی جان و مال محفوظ نہ تھا اس کا اثر خواجہ حافظ کی ذہنیت پر بھی پڑا۔ مختلف خاندان ایران کے مختلف حصوں پر حکمران تھے اور آئے دن باہمی جنگ و جدل کا بازار گرم رکھتے۔ بالآخر کامیابی آل مظفر کو ہوئی۔

اس خاندان کے جد اعلیٰ غیاث الدین حاجی خراسانی کے نام سے مشہور ہیں۔ خاوندشاہ اپنی تاریخ " روضۃ الصفا " میں لکھتا ہے کہ یہ شخص نہایت قوی ہیکل اور بلند قامت تھا۔ اس کی تلوار کا وزن ساڑھے تین من تھا اسی پر اس کی جسمانی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ ہلاکو خاں کی ترکتازی تھا۔ ہلاکو خاں چنگیز خاں کا پوتا ہے۔ چنگیز خاں اور

اس کے بعد ہلاکو خاں نے جو تباہی دنیائے اسلام میں برپا کی اس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر کہیں نہیں ملتی۔ ایک قیامت تھی جو مسلمانوں پر گذری ہلاکو نے آخر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شیخ سعدی اس وقت زندہ موجود تھے آپ نے درد انگیز مرثیہ لکھا اور اس واقعہ کو "قیامت" سے تعبیر کیا۔

حاجی خراسانی کے تین بیٹے ابوبکر اور محمد اور منصور تھے۔ ابوبکر اور محمد نے تاتاریوں کی رفاقت اختیار کی، اور حق وفاداری ادا کرتے ہوئے داد مردانگی دی۔ ابوبکر تو سرحد مصر پر مارا گیا اور کچھ بعد محمد بھی فوت ہوا۔ تیسرا بیٹا منصور باپ کی خدمت میں رہا۔ منصور کے تین بیٹے محمد اور علی اور مظفر تھے۔ مظفر سب سے چھوٹا مگر سب سے بڑھ کر صاحب اقبال ہوا۔ شجاعت اور اولوالعزمی میں بھی سب سے بڑا تھا۔ حسن صورت اور سیرت میں بھی بڑا تھا۔

اس وقت ہلاکو خاں کی اولاد فارس پر قابض تھی۔ مظفر کا ستارہ اقبال اوج پر تھا۔ شاہ غازان نہایت مہربان تھا۔ شاہ خاناں کے بعد اس کا بھائی اولجائیتو سلطان ~~۷۰۳ھ~~ ~~۱۳۰۴ء~~ میں تخت نشین ہوا۔ اور مظفر کو زمرا امرا میں شامل کر لیا اور "ہرات" اور "مرد" وغیرہ کی صوبہ داری تفویض کی۔ تھوڑے عرصہ بعد انتقال ہو گیا۔ لیکن اپنے خاندان میں جو

آل مظفر

آل مظفر کے نام سے مشہور ہے شاہی کی بنیاد رکھ گیا۔

امیر مظفر کا بیٹا امیر مبارز الدین محمد خواجہ حافظ کا ہمعصر تھا۔ سلطان اولجائیتو کی وفات کے بعد سلطان ابوسعید بہادر خاں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ یہ ہلاکو خاں کی آٹھویں پشت میں تھا۔ سلطان ابوسعید کے

عہد میں ملک کے طول و عرض میں عام بدنظمی پھیل رہی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ایران ہلاکو خاں کی اولاد کے ہاتھ سے عملاً نکل چکا تھا۔ ان کی شاہی برائے نام تھی، ہر ایک صوبہ دار کے سر میں ہوائے خودسری سمائی ہوئی۔ نہ صرف خودمختار تھا بلکہ ہمسایہ صوبہ داروں کے ملک میں تصرف کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک امیر شیخ ابواسحاق تھا اس کا باپ امیر محمود عراق اور فارس کے ایک حصہ کا والی تھا۔ امیر مبارز الدین محمد اس وقت "یزد" کا حاکم تھا۔ اور شیراز امیر پیر حسین کے تصرف میں تھا۔ ایک اور امیر ملک اشرف امیر پیر حسین چوپانی والی شیراز کے بھائی بندوں میں سے تھا۔ اس نے شیراز پر قبضہ کرنے کے لیے بہت سی جماعت فراہم کر لی۔ اور امیر شیخ ابواسحاق کو بھی اپنے ساتھ ملایا اور شیراز کو محاصرہ میں لے لیا۔ شہر مسخر ہو گیا۔ لیکن شیخ ابواسحاق نے ملک اشرف کی خدمت میں یہ گذارش کی کہ اگر مجھے اجازت دیں میں شہر میں پہلے داخل ہو کر وہاں آپ کی رہائش کا انتظام کروں، اسکے بعد تزک و احتشام کے ساتھ جلوس کی صورت میں تشریف لائیں، اہالیان شہر پر آپ کا دبدبہ بیٹھ جائے گا۔ اگر آپ فوراً داخل ہوں تو کسے معلوم ہے کہ دشمن کے آدمی گھات میں ہوں اور آپ پر کیا افتاد پڑے اس لیے یہ خدمت جاں نثاروں کے سپرد کریں، ملک اشرف نے شیخ کی دور اندیشی کی تعریف کی اور خوشی خوشی اجازت دے دی، ابواسحاق شہر میں داخل ہوا اور اپنی فوج چاروں طرف پھیلا دی اور ساتھ ہی اہل شہر کو ملک اشرف کے خلاف ابھار دیا۔ احمق تو کسی اور امید پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ جب شیخ کا قبضہ شہر پر خاطر خواہ ہو گیا اور اسے اطلاع ہوئی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جبکہ اسی غفلت میں ابواسحاق نے اس پر حملہ کر دیا۔ بھاگتے ہی بن پڑی

شیخ کے لیے میدان خالی تھا۔ تاج شاہی سر پر رکھا اور شاہ شیراز ہو گیا۔

شاہ اسحاق کو بخوبی علم تھا کہ ملک فارس میں اگر کوئی نبرد آزما اس کا حریف ہے تو مبارز الدین محمد ہے، اس لیے امیر کی بیخ کنی کی تدبیر سوچنے لگا۔ مبارز الدین اپنی شجاعت اور سخاوت کا سکہ لوگوں کے دل پر جما چکا تھا اسے بھی علم ہو گیا کہ شیخ اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ امیر خود بھی داعیہ سلطنت رکھتا تھا۔ ۷۵۱ھ میں مبارز الدین یزد میں شیخ ابو اسحاق شیراز میں ایک دوسرے کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ ماہ رمضان میں شیخ ابو اسحاق نے پیش دستی کی اور یزد پر یورش کی۔ اگرچہ پے در پے دلیرانہ حملے کئے مگر شہر مسخر نہ ہوا۔ مایوس ہو کر شیراز کی طرف لوٹ آیا۔

بروز چہار شنبہ ۱۴ جمادی الاول ۷۵۴ھ بن هجرائے پنج انگشت پھر دونوں لشکروں میں مٹھ بھیڑ ہوئی۔ اور ابو اسحاق نے شکست فاش کھائی اب امیر مبارز الدین محمد کی باری تھی۔ اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا، شیراز پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ ابو اسحاق کو اطلاع ہوئی تو قاضی عضد الدین عبدالرحمٰن کو صلح کا پیغام دے کر بھیجا۔

قاضی عضد الدین

قاضی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ ؎

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف	بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

بلاشبہ قاضی کا احترام ہر ایک کرتا تھا۔ اب علم و فضل کا شہرہ دور و نزدیک تھا۔ تمام عراق و فارس میں آپ کے شاگرد موجود تھے اور جب کبھی شیخ ابو اسحاق کو کوئی مشکل پیش آتی آپ کی طرف رجوع کرتا آپ اپنے اثر و رسوخ سے بگڑا ہوا کام سنوار دیتے مگر اس دفعہ کامیابی نہ ہوئی۔

قاضی عبدالرحمن بن احمد شیخ ابو اسحاق اور مبارزالدین اور اس کے بیٹے شاہ شجاع اور خواجہ حافظ کے ہمعصر تھے۔ آپ ایک واسطہ سے قاضی القضاۃ ناصرالدین بیضاوی کے شاگرد تھے۔ سلطان ابو سعید اور خواجہ غیاث الدین محمد رشیدی اور شاہ شیخ ابو اسحاق اور دیگر ملوک کے ہاں آپ کا بہت بڑا احترام تھا۔ ابو سعید کے عہد میں منصب قاضی القضاۃ ممالک ایران پر فائز تھے۔ سلطانیہ میں رہائش تھی، ملوک اور امرا اور وزرا عموماً بصد عقیدت نذر و نیاز بھیجتے تھے۔

شیخ ابو اسحاق کے ہاں آپ کی عزت و توقیر ہر ایک شخص سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ اور تمام مہمات ملکی میں آپ سے مشورہ لیا کرتا۔ چنانچہ امیر مبارزالدین کے پاس آپ کو پیغام صلح دے کر بھیجا۔ "سیرجان" پر ملاقات ہوئی امیر نے پچاس ہزار دینار آپ کی ذات گرامی کے لیے اور دس ہزار نوکر چاکروں کے خرچ کے لیے پیش کیے۔ اور یہاں اپنے بیٹے شاہ شجاع کو شاگردی کے لیے پیش کیا۔ اور نہایت احترام سے رخصت کیا، جب امیر مبارزالدین نے شیراز پر لشکرکشی کی تو قاضی "شبانکارہ" کی طرف چل دیئے۔ امیر شبانکارہ سے نہ بنی۔ اس نے آپ کو قلعہ میں قید کردیا۔ اور اسی قید و بند میں ۲۱ رمضان ۷۵۶ھ میں فوت ہوگئے۔

قاضی کی تالیفات حکمت و بیان و اصول میں بہت ہیں ان میں سے مشہور ترین کتاب "مواقف" ہے یہ علم کلام میں ہے اور خواجہ غیاث الدین محمد کے نام پر تالیف کی مگر خواجہ حافظ قطعہ کے شعر محولہ بالا میں "بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد" کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مواقف کی شرح شاہ ابو اسحاق کے نام پر لکھی۔ اس کتاب اور اس کی شرح میر سید

شریف جرجانی کے توسط سے علم کلام میں مشہور ترین درسی کتاب ہے دیگر تالیفات میں "فوائد غیاثیہ" اور شرح مختصر ابن حاجب مشہور ہیں۔ عثمان بن عمر معروف با بن حاجب (۵۷۰-۶۴۶ھ) نے کتاب منتہی الاصول کا خلاصہ لکھ کر اس کو "مختصر" سے موسوم کیا تھا۔ اس پر بہت علماء نے شرح لکھی۔ ان میں سے قاضی عضد الدین کی شرح مشہور ہے۔

قاضی صاحب کی رہائش شیراز میں تھی، قیاس غالب یہی ہے کہ خواجہ حافظ نے بھی ایسے فاضل اجل سے ضرور استفادہ اور قاضی صاحب تصنیف و تالیف کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔

خواجہ حافظ شیخ ابو اسحاق کے بارہ میں قطعہ مذکورہ میں اشارہ کر گئے کہ جب تک زندہ رہا داد عیش دیتا رہا، خوش صورت نیک سیرت تھا۔ چودہ سال شیراز اور اصفہان پر حکومت کی، پچاس سوار ترک اور ایرانی اس کی فوج میں تھے۔ شیراز میں کسریٰ کے ایوان واقع مداین کے نمونہ پر ایک قصر تعمیر کیا مگر تکمیل سے پیشتر ہی فوت ہوگیا۔ اس کے عیش و عشرت کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں بھی کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ دیتا خواجہ حافظ کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے کہ ؂

"ہر وقت خوش کہ دہد دست مغتنم شمار کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست"

امیر مبارز الدین نے شیراز کو محاصرہ میں لیا ہوا تھا، بہار کا موسم تھا۔ اپنے ندیم شیخ امین الدین جہرمی کو کہا کہ مبارز الدین عجب بے وقوف ہے کہ اس خوشگوار موسم میں مجھے تو عیش و خوشدلی سے منع کر رہا ہے اور خود آپ بھی اس سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ اور شاہنامہ کا یہ بیت پڑھا۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم چو فردا رسد فکر فردا کنیم

آمل کر آج رات تو رنگ رلیوں میں بسر کریں جب کل آئے گا تو کل کا فکر بھی کر لیں گے۔

امیر مبارز الدین فتح و ظفر کا شادیانہ بجاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا اور یہ بستر خمار پر بیٹھا ہوا تھا، پوچھا کہ یہ شور و غوغا کیسا ہے۔ ملازم نے کہا امیر مبارز الدین شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ کہا کیا ابھی تک مردک لڑاکا یہاں سے نہیں گیا۔ شیخ بروز جمعہ ۲۱ جمادی الاول ۷۵۸ھ اکابر شیراز کے ایک بیٹے کے ہاتھ سے مارا گیا اس کے باپ کو شیخ نے قتل کیا تھا۔ اس نے باپ کا انتقام مناسب وقت لیا۔

شیخ خود عالم اور ادیب تھا اس لیے دو رباعیاں محمد معین نے نقل کی ہیں :-

افسوس کہ مرغ عمر را دانہ نماند　　امید ہیچ خویش و بیگانہ نماند
در داد دریغا کہ دریں مدت عمر　　از ہر چہ بگفتم جز افسانہ نماند

با چرخ ستیزہ کار مستیز و برو　　با گردش چرخ در میاویز و برو
یک کاسہ زہر است کہ مرگش خوانند　　خوش درکش و جرعہ بر جہاں ریز و برو

خواجہ حافظ کے تعلقات شیخ ابو اسحاق سے دوستانہ تھے۔ شاہ شیخ نے ایک دفعہ اپنے امرا میں سے "سلطان شاہ جاندار" کو امیر مبارز الدین کے دشمنوں کی کمک کے لیے روانہ کیا، سلطان شاہ الٹا امیر مبارز الدین سے جا ملا۔ شاہ ابو اسحاق کو سخت صدمہ ہوا اس موقع پر وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے کہ

سپیدہ دم کہ صبا بوی بوستان گیرد　　چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جہاں گیرد

اس کے ضمن مدحیہ اشعار یہ ہیں کہ ؎

بجمال چہرہ اسلام شیخ ابو اسحاق — کہ ملک در قدمش زیب بوستان گیرد
چراغ دیدہ محمود آں کہ دشمن را — زبرق تیغ ری آتش بدودماں گیرد

اگرچہ محمد معین " اس قصیدہ کا شانِ نزول بھی بیان کرتا ہے جس کا مذکور اوپر کیا گیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نے یہ قصیدہ اس وقت کہا جب شاہ ابو اسحاق امیر مبارزالدین سے پہلی دفعہ لڑائی میں شکست کھا کر شکستہ دل شیراز کی طرف لوٹا۔ کیونکہ خواجہ حافظ اسی شکست کی طرف اس قصیدہ میں اشارہ کرتے ہیں ؎

ملالتے چو کشیدی، سعادتے دریاب — کہ مشتری نسق کار خود ازاں گیرد

شکست زدہ تو ملامت زدہ ہو رہا ہے مگر پروا نہیں کیونکہ اس کے بعد سعادت یعنی نیک نیتی کا دور شروع ہوگا۔ مشتری ستارہ کے دونوں حکم محسن و سعد ہیں، اس لیے امیدوار فضل و رحمت الٰہی رہنا چاہیے کہ ؎

از امتحان تو ایام را غرض آنست — کہ از صفائی ریاضت دلت نشاں گیرد
ز لطف غیب بسختی رخ امید متاب — کہ مغز نغز مقام اندر استخواں گیرد

جس طرح ہڈی سخت ہوتی ہے اس کے اندر اصل شے مغز ہے جس کی حفاظت چھلکا کرتا ہے۔ اس لیے اگر بظاہر سختی محسوس ہو تو دل شکستہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ اصل چیز یہ نہیں، مغز ہے جو نرم ہے ؎

اس کے صبر اور استقلال کی نصیحت ہے کہ ؎

مداں مقام کہ سیل حوادث از چپ و راست — چناں رسد کہ اماں از میاں گیرد

چہ غم بود کہ بہمہ حال کوہ ثابت را کہ موجہائے چناں قلزمے جہاں گیرد
اگرچہ خصم تو گستاخ میرود حالے تو شاد باش کہ گستاخیش عناں گیرد

غالباً سلطان شاہ کی غداری بھی عین معرکہ جنگ میں پیش آئی جو شاہ اسحاق کو مبازرالدین کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اور دونوں واقعات ایک دفعہ ہی رونما ہوئے ہوں کہ لڑائی کے وقت سلطان شاہ مبازرالدین سے مل گیا۔ اور شاہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

شاہ کے قتل کا قطعہ تاریخ خواجہ حافظ نے لکھا۔

بلبل و سرو و سمن یاسمن و لالہ گل ہست تاریخ وفات شہ سنبل کاکل
خسرو روئے زمیں شاہ زمن بواسحاق کہ بہ طلعت او ناز دو خندد بر گل
جمعہ بیست و یک از ماہ جمادی الاول در پسیں بود کہ پیوستہ شد از خرد بجل

بلبل، سرو، سمن، یاسمن، لالہ گل کے عدد ۷۵۷ ہوتے ہیں مگر شاہ اسحق کا قتل ۷۵۸ھ میں واقع ہوا ایک عدد کم ہے۔ معلوم نہیں کہ غلطی کتابت کی ہے یا "لالہ گل" لالہ و گل کی جگہ ہے۔

دوسرا قطعہ تاریخ یہ ہے

بروز کاف و الف از جمادی الاول بسال ذال و دگر حا و نون علی الاطلاق
خدایگان سلاطین مشرق و مغرب خدیو کشور عفو و کرم با سحاق
سپہر حلم و حیا آفتاب جاہ و جلال جمال دینی و دیں شاہ شیخ ابو اسحق
میاں عرصہ میدان خود بہ تیغ عدو نہاد بر دل احباب خویش داغ فراق

کاف کے عدد بیس اور الف کا ایک یعنی بتاریخ ۲۱ جمادی الاول، ذال کے چھ سو اور "حا" کے آٹھ اور "نون" کے پچاس ہیں اور یہ ۷۵۸ھ ہے۔

امیر مبارزالدین محمد

امیر مبارزالدین امیر شرف الدین مظفر کا بیٹا ہے۔ اور شرف الدین بن منصور بن غیاث الدین حاجی خراسانی ہے جس کا مذکور ہو چکا ہے۔ امیر شرف الدین سلطان اولجائیتو کی طرف سے منصب امارت ولایات میں کرمان شاہ ولرستان تا ہرات اور مرو اور ابرقو پر متصرف تھا۔ اس کی تعدی سے لوگ نالاں تھے، جب امیر شرف الدین فوت ہوا مبازرالدین کی عمر کوئی سترہ سال تھی، امیر بدرالدین ابو بکر برادر زادہ اور داماد امیر شرف الدین مظفر مبازرالدین اور اس کی بڑی بہن زوجہ بدرالدین مذکور کو ساتھ لے کر سلطان اولجائیتو کے پاس حاضر ہوا راستہ میں چند ڈاکوؤں سے لڑنا پڑا۔ ڈاکو کچھ تو مارے گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بدرالدین ان کے سر کاٹ کر سلطان کے حضور لایا، ایلخان اولجائیتو بہت خوش ہوا اور ان راستوں کی حفاظت پر مبازرالدین کو مامور کیا جو رہزنوں کی وجہ سے مسدود ہو رہے تھے، مبازرالدین اولجائیتو کی آخر عمر تک اس کے لشکر میں رہا، جب ابو سعید اس کا بیٹا سلطان اولجائیتو کی جگہ تخت پر بیٹھا مبازرالدین کو منصب پر بحال رکھا۔ ۷۱۸ھ میں شاہ ابو سعید نے مبازرالدین کو میبد کی طرف بھیجا۔ اس وقت اتابک یزد حاجی شاہ تھا۔ سید عضدالدین محمد یزدی سحنہ فارس کی طرف سے شاہ ابو سعید بدظن تھا۔ اس کی گرفتاری پر مبازر اور اتابک کو مامور کیا ۷۱۸ھ میں امیر غیاث الدین کیخزو برادر شیخ ابو اسحاق اینجو شبانکارہ سے یزد میں وارد ہوا۔ اور اتابک حاجی شاہ بن یوسف شاہ سے یارانہ گانٹھا اس کے بعد میبد میں آیا، اور یہاں مبازرالدین سے بھی دوستی ہو گئی۔ لیکن امیر غیاث الدین کیخزو کے نائب اور اتابک حاجی شاہ میں کسی وجہ

سے نزاع پیدا ہو گیا۔ اتابک نے نائب کو مار ڈالا، کیخسرو اور مبارز نے سلطان ابو سعید کے پاس استغاثہ کیا۔ اور سلطان کی اجازت سے اتابک پر حملہ کر دیا۔ اس طرح ۷۱۸ھ میں سلسلہ اتابکان یزد ختم ہو گیا اور سلطان ابو سعید کی طرف سے مبارز الدین کو یزد کی ولایت تفویض ہوئی۔ مبارز الدین نے رہزنوں کا قلع قمع خاطر خواہ کیا اور ملک میں امن قائم کر دیا۔ ۷۲۹ھ مبارز الدین نے قتلغ مخدوم شاہ دختر قطب الدین شاہ جہاں بادشاہ قراختائی کرمان سے عقد نکاح کیا۔ اس کے بطن سے تین بیٹے شاہ شجاع اور شاہ محمود اور سلطان احمد پیدا ہوئے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شاہ ابو سعید کی وفات کے بعد ملک کے طول و عرض میں بدامنی اور بدنظمی کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر ایک والئ ولایت خود مختار تھا۔ اور اپنی ولایت کو وسعت دینے کے لیے ہمسایہ والیاں سے دست و گریباں ہو رہا تھا۔ فارس اس وقت شاہ شیخ ابو اسحاق اور اس کے بھائیوں کے تصرف میں تھا۔ ۷۴۳ھ میں شیخ اپنے بھائی جلال الدین مسعود شاہ کے امر کے تحت یزد کی طرف بڑھا مگر اس وقت امیر مبارز الدین احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اس لیے شیخ نے کرماں کی طرف رخ کیا۔ لیکن واپسی کے وقت پھر یزد پر آدھمکا۔ لیکن یہاں منہ کی کھائی تو غالباً قاضی عضد کے ذریعہ پیمان صلح باندھا اور شیراز کی طرف لوٹ گیا۔ ۷۴۰ھ میں امیر پیر حسین چوپانی یزد میں امیر مبارز الدین کے پاس کمک کی درخواست لے کر آیا۔ اسے شیخ ابو اسحاق نے کرمان سے بے دخل کر دیا۔ امیر اور اس نے شیراز پر چڑھائی کی جلال الدین مسعود شاہ ۔ گاذرون کی طرف بھاگ گیا۔ امیر پیر حسین نے کرمان مبارز الدین کے سپرد کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد امیر پیر حسین سے نزاع۔

امیر حسین نے شیخ ابو اسحاق سے رشتہ دوستی گانٹھا مگر شیخ کے بھائی کو امیر پیر حسین قتل کر چکا تھا اس لیے شیخ دراصل انتقام کی فکر میں تھا۔ بظاہر دوستی کا دم بھرتا رہا علاوہ ازیں حکومت فارس جس پر اب پیر حسین چھایا ہوا تھا اپنے خاندان کا حق سمجھتا تھا۔ جس وقت ملک اشرف برادر شیخ حسن کوچک چوپانی تسخیر عراق کے ارادہ سے ادھر آیا تو شیخ نے باوجود مخالفت امیر پیر حسین اس کی رفاقت اختیار کی۔ امیر حسین ملک اشرف کے چچا کا بیٹا تھا۔ پیر حسین نے شیراز سے ان کے مقابلہ کے لیے حرکت کی تو شکست کھائی۔ بھاگ کر سلطانیہ میں آیا اور یہاں اسے زہر دیا گیا

اب ملک اشرف اور شیخ اسحاق دونوں شیراز کی طرف بڑھے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ شیخ ابو اسحاق نے یہاں اپنا سکہ جمایا اور ۷۴۲ھ میں شیراز اُس کے قبضہ تصرف میں آگیا۔ ۷۴۳ھ میں ملک اشرف یزد میں مبارز الدین کے پاس بغرض کمک آیا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، مبارز نے مدد تو دی مگر کام نہ بنا۔ اور فارس بدستور شیخ اسحاق کے قبضہ تصرف میں رہا باقی حالات ہم بالاختصار شیخ ابو اسحاق کے حالات کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ امیر مبارز نہایت تند خو اور دہشت گر تھا، بات بات پر لوگوں کے قتل کا حکم دیتا، اپنے بیٹوں سے ہی نہ بنی، کبھی کبھی غضب میں آکر کہتا کہ میں تمہاری آنکھیں نکلوا دوں گا۔ شجاع و محمود دونوں ڈرتے تھے اور باپ سے دور دور رہتے اور آخر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد شاہ سلطان سے سفارش کی۔ وہ بھی باپ سے رنجیدہ تھا ۱۰ ماہ رمضان ۷۵۹ھ میں مبارز کو گرفتار کر کے پہلے قلعہ طبرک اصفہان میں قید کیا چار روز بعد آنکھوں میں سلائی پھیر دی، اسی نابینائی کی حالت میں

ماہ ربیع الاول ۷۶۵ھ میں مرگیا۔ یہ واقعہ ایسا عبرت انگیز تھا کہ کئی شعرا نے اپنے قطعات کا موضوع بنایا۔ مولانا صدرالدین عراقی فرماتے ہیں۔

یک چند شکوہ ہمتش پیل کشید — یک چند سپہ زقیصر تا نیل کشید
پیمانہ دولتش چو شد مالامال — ہم روشنی چشم خودش میل کشید

روشنی چشم یا نور دیدہ بیٹے کو کہتے ہیں۔ یعنی بیٹے ہی نے آنکھیں نکلوا دیں۔

آنکہ از کبر یکو جیب می دید — از سر خویش تا بافسر ہور
آنکہ می گفت شیر شرزہ منم — روز هیجا و دیگراں ہمہ گور
قرۃ الظہر پشت او بشکست — قرۃ العین کرد چشمش کور
تا بدانی کہ با سعادت و بخت — بر نیاید کسے بمردی و زور

اس واقعہ کا اثر خواجہ حافظ کے دل و دماغ پر جو کچھ بھی ہوا ایک قطعہ میں واضح کیا ہے۔ ؎

دل منہ بر دنیا و اسباب او — زانکہ از وے کس وفاداری ندید

دنیا اور اس کے اسباب سے دل نہ لگا، کیونکہ اس نے کسی سے وفا نہیں کی۔ ؎

کس عسل بے نیش ازیں دکان نخورد — کس رطب بے خار ازیں بستاں نچید

یہ دنیا اور اسباب یا عیش دنیوی ایسا شہد ہے کہ بغیر زہریلے ڈنک کے کوئی ذائقہ شناس نہیں ہو سکتا، یہ ایسا سبز باغ ہے کہ اس تازہ میوہ کو جب تک کانٹا نہ چبھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ؎

ہر کہ ایامے چراغ بر فروخت — چوں تمام افروخت بادش در دمید

جس کسی نے محفل نشاط روشن کرنے کے لیے دیا جلایا جب جلا چکا ہوا نے بجھا دیا۔

بے تکلف ہر کہ دل بر وے نہاد   چوں بدیدم خصم خود می پرورید

جس نے بھی اس سے دل لگایا میں نے غور کیا تو یہی معلوم ہوا کہ اپنے ہی دشمن کو پال رہا ہے۔

شاہ غازی خسرو گیتی ستاں   آنکہ از شمشیر او خوں می چکید

وہ غازی بادشاہ (مبارز الدین) جو ایک دنیا کو مسخر کر رہا تھا۔ جس کی تلوار سے لہو ٹپکتا تھا۔

گہ بیک حملہ سپاہے می شکست   گہ بہوئے قلب کوہے می درید

کبھی ایک ہی حملہ سے فوج کو شکست دیتا، کبھی اس کے ایک نعرہ جنگ سے پہاڑ کا دل دہل جاتا۔

سروراں را بے گنہ می کرد حبس   گردناں را بے تحن سری برید

بڑے بڑے سرکش سرداروں کو ناکردہ گناہ قید و بند میں رکھتا، کئی گردنوں سے بلا پرسش سر اتار دیتا ہے۔

از نہیبش پنجہ می افگند شیر   در بیاباں نام او چوں می شنید

اس کے خوف سے شیر بھی اگر بیاباں میں اس کا نام سن پاتا پنجے جھاڑ کر رہ جاتا ہے۔

عاقبت شیراز و تبریز و عراق   چوں مسخر کرد وقتش در رسید

آخر کار جب شیراز اور تبریز اور عراق مسخر کر چکا اس کا آخری وقت بھی آگیا ہے۔

آنکہ روشن بد جہاں بینش بر او   میل در چشم جہاں بینش کشید

خود اس کے بیٹے نے جو اس کا نور دیدہ تھا اور جس سے اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں روشن تھا اس نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا

کر دیا۔

امیر مبارز الدین نے چار سال اسی نابینائی میں بسر کیے۔ اگرچہ شاہ شجاع نے سکہ و خطبہ اسی کے نام پر جاری رکھا مگر برائے نام ہی تھا۔ ۷۶۵ھ میں فوت ہو گیا۔ اور مدرسہ مظفریہ میں جو اسی کا تعمیر کردہ تھا مدفون ہوا۔

امیر جیسا کچھ امور سلطنت میں سخت گیر تھا، امور شرعیہ میں بھی ویسا ہی سخت گیر تھا۔ شیراز کے زندہ دل اسے "محتسب" کہتے، خود اس کے بیٹے شاہ شجاع نے ایک رباعی میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

در مجلس دہر ساز مستی پست است　　نہ چنگ بقانون و نہ دف در دست است
رنداں ہمہ ترک مے پرستی کردند　　جز محتسب شہر کہ بے مے مست است

اس نے تمام لوازمات عیش و مستی کو قفل لگا کر بند کر رکھا ہے۔ نہ گانے بجانے کا سامان اس کے پنجہ میں ہے اور نہ دف ہاتھ میں ہے رندوں کا کیا مذکور ہے جو مے پرستی ترک کر چکے ہیں صرف ایک حضرت محتسب رہ گئے ہیں۔ جو بن پیئے مست ہیں، خواجہ حافظ کے اکثر اشعار میں "محتسب" کا اشارہ امیر مبارز الدین ہی کی طرف ہے۔ ایک غزل کا مطلع ہے کہ

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند　　پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

اس کا ایک شعر ہے

می [illegible] کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب　　چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

مجھے شراب پلائے جا، یہ جو شیخ اور حافظ اور مفتی اور محتسب بنے پھرتے ہیں جب تو اچھی طرح ان کا جائزہ لے گا تو بہت ریاکار ہی نکلیں گے۔ ایک اور غزل کا مطلع ہے

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است   بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است

اگرچہ موسم پینے پلانے کا ہے کہ شراب فرحت بخش موجود ہے اور باد بہار دل و دماغ کو معطر کر رہی ہے مگر شراب سرود کے ساتھ نہ پی حالانکہ رقص و سرود بھی اس کا لازمہ ہے اس لیے محتسب نہیں چوکتا۔

در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن   کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است

شراب کے پیالہ کو آستین کی تہ میں چھپا کر پی اس لیے جس طرح صراحی کی آنکھ سے سرخ رنگین شراب انڈیلی جاتی ہے اسی طرح زمانہ بھی خونریز ہے۔

صراحی و حریفی گرت بچنگ افتد   بعقل کوش کہ ایام فتنہ انگیز است

اگر شراب سے بھری ہوئی صراحی اور کوئی ہمنشیں اتفاق سے ہاتھ آئے تو کچھ عقل سے بھی کام لینا چاہیے۔ اس لیے کہ زمانہ فتنہ انگیز ہے۔ حریف کا ذکر اس لیے کیا کہ عیش تنہائی بے مزہ ہوتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ عیش ہمیشہ مجمع احباب ہی میں ہوتا ہے۔ اور چپکے اور چھپ کے پینے میں بھی کچھ لطف نہیں چنانچہ خواجہ اسی نفسیاتی پہلو کو ملحوظ رکھ کر کہتے ہیں کہ ؎

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد۔ زدیم بر صف رنداں و ہر چہ بادا باد

شاہ شجاع

شاہ شجاع باپ کی زندگی ہی میں تخت و تاج کا مالک ہو گیا تھا۔ مدت سلطنت بعد وفات امیر مبارز ۷۸۶ھ تک رہی، ابوالفوارس جلال الدین شاہ شجاع نے تخت نشینی کے بعد اپنے بھائی شاہ محمود کو ابرقو اور عراق عجم۔ اور کرماں اور دوسرے بھائی عماد الدین کو دے دیا۔ شاہ شجاع کا وزیر خواجہ قوام الدین محمد۔

امیر مبارز الدین کے پانچ بیٹے تھے۔ شاہ شجاع اور شاہ مظفر شاہ محمود

سلطان احمد، دلو یزیدہ شاہ منظفر ۷۶۵ھ میں جبکہ امیر نے شیرازہ کو محاصرہ میں لیا ہوا تھا فوت ہو گیا۔ شاہ منظفر کی دو بیٹیاں اور چار لڑکے شاہ یحییٰ اور شاہ منصور اور شاہ حسین اور شاہ علی تھے۔ ان چاروں میں یحییٰ سب سے بڑا اور امیر مبارزالدین کو بہت پیارا تھا۔ اور اسی کو اپنا جانشین بھی نامزد کرنا چاہتا تھا۔ جب شاہ شجاع اور دوسرے بیٹوں کو یہ حال معلوم ہوا تو ناچار وہی کام کیا جو تاریخ ہند میں غازی اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے شاہجہان سے کیا۔ اورنگ زیب نے تو قلعہ آگرہ کی چار دیواری میں بند رکھا اور ہر ممکن آرام و آسائش کے سامان مہیا کر دیئے مگر شاہ شجاع نے باپ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس کے سوا ہم اور کیا کہیں کہ ؂

رموز سلطنت خویش خسرواں دانند　　گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

ایسے واقعات سے ہر ایک قوم اور ملت تاریخ بھری پڑی ہے۔

شاہ شجاع تخت نشین ہوا تو یحییٰ کو گرفتار کر کے شیراز کے "قلعہ قہندز" میں قید کیا۔ یحییٰ نے قلعدار کو گانٹھا اور قلعہ کی فوج کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اب چچا اور بھتیجہ میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ شاہ شجاع نے قلعہ کو محاصرہ میں لیا مگر مسخر نہ کر سکا۔ آخر دونوں میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ یحییٰ قلعہ شاہ شجاع کے حوالہ کر دے۔ اور "یزد" میں چلا جائے اور وہاں عم بزرگوار شاہ شجاع کی طرف سے اور شاہ کے نام پر والی رہے۔ چنانچہ یحییٰ یزد میں آیا اور اس پر تصرف جما لیا۔ اور یہاں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ شاہ شجاع نے لشکر کشی کی، آپ تو "ابرقوہ" میں ٹھہر گیا اور وزیر خواجہ قوام الدین کو یزد کی تسخیر پر مامور کیا۔ وزیر نے محاصرہ سختی سے ڈالا تو شاہ یحییٰ بھی نرم

پڑ گیا۔ اور عم بزرگوار کی خدمت میں معذرت نامہ ارسال کیا۔ شاہ شجاع نے قصور معاف کر دیا اور وزیر کو واپسی کا حکم دیا۔

۷۶۶ھ میں شاہ محمود نے بھی اعلان خود مختاری کیا۔ شاہ محمود ابرقو اور اصفہان کا والی تھا۔ خود مختاری کے ساتھ ہی یزد لے کر عراق پر فوج کشی کی۔ شاہ شجاع نے اصفہان پر یورش کی۔ اس اثنا میں شاہ محمود کے سپاہیوں نے شاہ سلطان کی سپاہ پر چھاپہ مارا۔ اور شاہ سلطان کو گرفتار کر کے شاہ محمود کے پاس لائے۔ شاہ سلطان ہی تھا جس نے شاہ شجاع کے ایما پر امیر مبارز الدین کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی تھی۔ شاہ محمود نے یہی سلوک اس سے کیا۔ مولانا صدر الدین عراقی نے جو امیر مبارز الدین کا مداح تھا ایک رباعی لکھی :-

گر دست فلک چشم ترا میل کشید   در ذات شریف تو جہاں نقص ندید
آں کس کہ بداں چشم تو آسیب رساند   او نیز بعینہٖ مکافاتش دید

شاہ شجاع اور شاہ محمود میں آخر صلح ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ شاہ محمود بدستور اصفہان وغیرہ کا والی رہے مگر سکہ اور خطبہ شاہ شجاع کے نام کا جاری رہے گا۔ شاہ محمود نے ناچار یہ شرط منظور کر لی مگر سر میں دبی ہوائی خود سری تھی۔ سلطان اویس جلائر شاہ آذربائیجان کو لکھا کہ شاہ شجاع کا ارادہ تبریز کی تسخیر کا ہے اگر میری مدد کریں تو شاہ شجاع کو نیچا دکھاؤں سلطان اویس نے اپنا لشکر اور فوج شاہ محمود کی مدد کے لیے روانہ کر دی۔ اس متحدہ لشکر سے ۷۶۵ھ میں شاہ محمود نے شیراز کو محاصرہ میں لیا۔ آخر بھائیوں میں صلح ہو گئی اور اس شرط پر کہ شیراز شاہ محمود کے قبضہ میں دیا جائے اور شاہ شجاع ابرقو کی طرف چلا جائے۔ اس پر عمل ہوا۔ شاہ شجاع نے تھوڑے

عرصہ میں پھر جمعیت اور قوت فراہم کرلی اور کرمان لے لیا۔ شاہ محمود نے
شاہ یحییٰ کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ لیکن شاہ یحییٰ عم بزرگوار سے مل گیا
اہل شیراز بھی شاہ محمود کے ظلم سے تنگ آچکے تھے۔ ہمارے خواجہ حافظ بھی
دل سے شاہ شجاع کا تسلط چاہتے تھے۔ شاہ مظفر کا بیٹا شاہ منصور
یعنی شاہ یحییٰ کا بھائی شاہ شجاع کی کمک کو پہنچ گیا۔ شاہ محمود نے بھاگ
کر جان بچائی۔ شاہ شجاع پھر سے شیراز پر متصرف ہوگیا۔ اس موقع
پر خواجہ حافظ نے ایک غزل لکھی۔

بشریٰ اذ السلامۃ حلت بذی سلم — للہ حمد معترف غایۃ النعم

مژدہ باد کہ محبوب ذی سلم میں داخل ہوگیا۔ ذی سلم یا سلامتی کا شہر شیراز
ہے، مطلب یہ ہے کہ معشوق بخیر و عافیت و سلامت شہر میں داخل
ہوگیا ہے۔ تمام حمد و ثنا اللہ ہی کے لیے کہ اعتراف کے ساتھ شکر نعمت
کا یہی تقاضہ ہے۔

آن خوشخبر کجاست کزیں فتح مژدہ داد — تا جان فشانمش چو زر و سیم در قدم

بشارت فتح دینے والا کہاں ہے جس نے یہ خوشخبر سنائی تاکہ میں اس
کے قدموں پر زر و سیم کی طرح جان نثار کردوں۔

از بازگشت شاہ بریں خوش طرفہ نقش بست — آہنگ خصم او بسرا پردہ عدم

بادشاہ کی واپسی پر عجیب و غریب نقش پردہ عدم پر کھنچ گیا کہ دشمن اس کی
لوٹ میں آگیا۔

پیمان شکن ہر آئینہ گردد شکستہ دل — ان العہود عند ملوک النہی ذمم

عہد و پیماں کو توڑنے والے دل ہر طرح ٹوٹ کر رہ جاتا اس لیے کہ بادشاہ
کے نزدیک عہد کا پاس کرنا لازم ہے۔

درنیل غم فتادہ سپہرش بطعنہ گفت الآن قد ندمت وما ینفع الندم

اس شعر میں اشارہ قرآن شریف کی ایک آیت کی طرف ہے۔ جس میں فرعون کی غرقابی نیل میں مذکور ہے کہ جب فرعون نے محسوس کیا کہ وہ غرق ہونے کو ہے تو کہا کہ میں بنی اسرائیل اور موسےٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لایا۔ ارشاد الٰہی بجواب ایمان لا ملا اور اس سے پیشتر تو سرکش تھا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یعنی سلطان محمود نیل کے غم میں ڈوبا ہوا تھا کہ سپہر یعنی ذات باری تعالےٰ نے جو علی کل شئ محیط ہے زجرا توبیخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اب اپنے اعمال ناشائستہ پر نادم ہو رہا ہے اس وقت کی ندامت تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

می جست از سحاب امل رحمتے ولے جز دیدہ اش معائنہ بیروں نداد نم

امید کے بادل سے باراں رحمت ٹپک رہا ہے لیکن اس کا مشاہدہ اہل نظر کی آنکھوں سے باہر ممکن نہیں ہے۔

ساقی بیا کہ دور گل است وزمان عیش پیش آر جام و ہیچ مخور غم زبیش وکم

اے ساقی موسم بہار میں گل کا دور تجمل ہے اور عیش و عشرت کا بھی وقت مناسب ہے تو بھی آ اور شراب سے لبریز پیالہ کو ہمارے سامنے دور دے اور فکر بیش وکم کو بھلا دے۔

اے دل تو جام جم بطلب ملک جم مخواہ
کیں بود قول بلبل بستان سرائے جم

ان اشعار کے بعد خواجہ حافظ نصائح کی طرف گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان انقلابی واقعات مشاہدہ کرنے کے بعد تو نے سمجھ لیا ہوگا کہ ۔

کہاں ہے دارا کہاں ہے سکندر کہاں ہے کسریٰ کہاں ہے قیصر
شکستہ ہیں ان در پر زمانہ عبرت نگار ہے (مولف)

اس لیے اے دل ہوسِ ملکِ جمشید نہ کر کہ اس کی جاہ و حشمت چند روزہ ہے البتہ جامِ جمشید کے باغِ حشمت کی بلبل اپنے نغموں میں پہلے ہی دے چکی ہے۔ خواجہ حافظ نے اس شعر کے مضمون اور مفہوم کو مختلف دل کش پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ ایک شعر ہے۔ ؎

کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن جامِ جم بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام است و نے گورش

بہرام کا قصہ مشہور ہے کہ گورخر کا شکار اکثر کیا کرتا۔ مطلب شعر یہ ہے کہ وہ کمند جو بہرام گور کے شکار کے لیے استعمال کرتا تھا پھینک دے اور جامِ جم اٹھا لے۔ یہ مشورہ میں اس لیے دے رہا ہوں کہ میں نے اس صحرائے دُنیا کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھان مارا، نہ تو بہرام کا اور نہ اس کی قبر کا نشان کہیں ملا۔ "لفظ گور" کے دونوں معنی ہیں ایک تو "گورخر" جس کا شکار بہرام کیا کرتا اور دوسری "قبر" یعنی آج بہرام کی قبر کی خاک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ؎

چوں خونِ خصم ہمچو صراحی بریختی
با دوستاں بعیش و طرب گیر جامِ جم

اب جبکہ تو نے دشمن کا لہو صراحی کی رنگین شراب کی طرح بہا دیا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر عیش و نشاط کی محفل گرم کر اور جامِ جم نوش کر۔ ؎

بشنو ز جامِ بادہ کہ ایں زالِ نوعروس
بسیار کشت شوہر چوں کیقباد و جم

صراحی کی قلقل سے جو آواز آرہی ہے اس پر بھی کان دھرنا چاہیے سننا چاہیے کہ کیا کہہ رہی ہے کہ اس نال دُنیا نے جو سجیلی نویلی دلہن کی طرح کرشمہ دکھا رہی ہے اس نے بے شمار شوہروں کو خاک و خون میں ملا دیا ایسے شوہر جو کیقباد اور جم کی شان رکھتے تھے۔ اس مضمون کو بھی خواجہ حافظ نے مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ ایک شعر ہے کہ

مجو درستی عہد از جہان سست نہاد
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

دُنیا کی بنیاد ہی بودی ہے اور گذشتنی اور گذاشتنی ہے اس لیے اس سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ اس کا عہد و پیماں استوار ہوگا یہ بڑھیا تو ہزاروں داماد کی دلہن ہے ایسی ہرجائی ہستی سے وفا کی اُمید خام خیالی ہے۔ ؎

حافظ بکنج میکدہ دارد قرار گاہ
کالطیر فی الحدیقہ و اللیث فی الاجم

حافظ نے میکدہ کے گوشہ میں قیام و قرار لیا پکڑا ہوا ہے۔ جیسے طائر باغ میں چہچہاتا ہے اور شیر جنگل میں آزادانہ بلا خوف و خطر پھرتا ہے۔

محمد معین اپنے تذکرہ " حافظ شیریں سخن " میں لکھتا ہے کہ شیراز میں مراجعت کے بعد شاہ شجاع نے شیراز میں اصول مذہب تسنن کو تقویت دی اور تربیت علماء دین کی اور لوگوں کی بہبودی میں کوشش کی اور باپ کی روش اختیار کی اور خلفاء عباسی جو اس وقت مصر میں مقیم تھے ان کی بیعت کی۔ بالخصوص ۷۷۰ھ میں علماء دین نے القاہر بالعبد محمد بن

ابوبکر کی بیعت کے لیے نامے لکھے اور ان کو مامور کیا کہ خلیفہ کا نام خطبہ میں داخل کریں۔

ان لڑائیوں کا تذکرہ جو شاہ شجاع کو شاہ محمود سے پیش آئیں۔ اس سے زیادہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس زمانہ کے عام حالات سمجھنے کے لیے یہی کافی ہیں۔ شاہ شجاع کی مدت سلطنت چھبیس برس ہے اور اس عرصہ میں اس نے باغیوں کا قلع قمع کیا۔ ممالک مسخر کیے اور اپنے باپ امیر مبارزالدین کی طرح شجاع اور متدین تھا۔ نو سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور شعایر دینی کے قیام و استحکام میں نہایت سعی کی۔ بادشاہ بھی تھا اور فاضل اور شاعر اور شعر دوست و ادب پرور تھا۔ قاضی عضدالدین ایجی اور دیگر علمار عصر سے تحصیل علم کی۔ حافظہ بھی بلا کا تھا کہ بار سن کر سات آٹھ عربی شعر ذہن میں محفوظ ہو جاتے آپ بھی عربی اور فارسی میں شعر کہتا زمانہ کے دستبرد سے اس کا کلام ضائع ہو گیا۔ چند قطعات اور رباعیات تذکروں میں محفوظ ہیں۔ مدرسہ "دارالشفا شیراز" اسی نے تعمیر کیا اور سید شریف جرجانی کو درس و تدریس کے لیے مامور کیا۔ غالباً آپ بھی مولانا قوام الدین کے حلقہ درس میں شامل ہوتا رہا۔

عماد فقیہ اور خواجہ حافظ شاہ شجاع کے ہمعصر تھے۔ آغاز سلطنت امیر مبارزالدین "محتسب" کی سختی رفع ہوگئی تو خواجہ کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہ رہی ایک غزل میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش
کہ دار شجاع است می دلیر بنوش

صبحدم ہاتف غیب کی طرف سے خوشخبری میرے کانوں میں پڑی کہ اب

تو شاہ شجاع کا دور حکومت ہے۔ کوئی بندش نہیں رہی اس لیے بے خوف و خطر دلیرانہ شراب پیو۔

شد آنکہ اہل نظر برکنارہ می رفتند ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش

وہ دن گئے جب اہل نظر بچتے ہوئے کنارے کنارے چلتے تھے۔ منہ میں شکوہ وشکایت کی باتیں تو ہزاروں تھیں مگر لب بند تھے۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے زمانہ میں سینٹ ایکٹ کا عمل و اثر ہے۔

بیانگ چنگ بگوئیم آں حکایتہا کہ از نہفتن آں دیگ سینہ می زد جوش

اب چنگ کی زبان سے علانیہ وہ وہ شکایتیں بر سبیل حکایت بیان کریں گے کہ جن کے اظہار کے لیے ہمارا سینہ دیگ کی طرح جوش مارتا تھا اور دل کی دل ہی میں تھیں۔

شراب خانگی ترس محتسب خوردہ بروئے یار بنوشیم و بانگ نوشانوش

محتسب کا ڈر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ شراب گھر میں دبکی بیٹھی تھی اب تو دوست کے روبرو بیٹھیں گے اور دل کھول کر پییں گے۔

زکوئی میکدہ دوشش بدوش می بردند امام شہر کہ سجادہ می کشید بدوش

حضرت امام شہر جو کل تک سجادہ کندھے پر اٹھائے پھرتے تھے آج جناب کو دیکھا یار دوست اُن کو جلوس کی صورت میں کندھوں پر اٹھائے ہوئے میخانہ کی طرف لیے جا رہے تھے کہ یہاں امامت رنداں کیجئے۔

ولا دلالت خیرت کنم براہ نجات مکن بفسق مباہات وزہد ہم مفروش

اے دل میں تجھے نیک راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہوں جو نجات کا راستہ ہے کہ فسق کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس پر فخر نہ کر اور اگر زہد و تقویٰ تیرا شعار ہے اور تو ریاکاری سے اجر ضائع نہ کر۔

محل نور تجلی است رائے انور شاہ　　چو قرب او طلبی درصفائی نیت کوش

حدیث شریف ہے کہ مومن کے نور فراست سے ڈرو۔ اس نور کی روشنی میں تمہارے دل کے ارادے اس پر منکشف ہو جائیں گے اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے رائے کے معنی میں مشاہدہ خواہ نظری ہو یا عقلی، چونکہ بادشاہ کا دل نور تجلی کا مقام ہے اس لیے تمہاری نیت کا حال اس پر روشن ہو جائے گا۔ اس لیے اگر اس کا قرب مطلوب ہے تو نیت صاف رکھو یعنی نیک نیتی ہونی چاہیے۔ ؎

بجز ثنائے جلالش مساز ورد ضمیر　　کہ ہست گوش دلش محرم پیام سروش

جو بات تیرے دل میں آئے وہ بادشاہ کے جلال کی مدح ہی ہو اس لیے کہ بادشاہ کا دل فرشتہ کے پیام سے واقف ہے۔ یعنی بادشاہ حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے اس لیے تو اگر اس کے جلال کی مدح کرے گا تو وہ فوراً معلوم کرے گا آیا یہ بات تو نے صدق دل سے کہی ہے یا یونہی بات بنا رہا ہے جلال الدین شاہ شجاع کا نام ہے۔ ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند　　گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

یہ سچی بات اور سچا واقعہ کہ خواجہ حافظ کے ممدوح شاہ شجاع نے اپنے باپ مبارزالدین سے کیا سلوک کیا خواجہ حافظ کے دل میں ضرور کھٹک رہی ہے اور یہ مدح کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کی نسبت اتنا ہی کہا کہ بادشاہ اپنی مملکت کے رموز سے خوب واقف ہوتے جو کرتے ہیں اس کے جواز کی دلیل بھی ان کے پاس ہوتی ہے اس لیے مجھ جیسا ایک گدائے گوشہ نشین مملکت کے رموز سے نہ واقف ہوگا اور نہ اسے واویلا کرنا چاہیے۔

بقول خواجہ حافظ شاہ شجاع کا وجود حکمت و شرع ہے۔

ببیں ہلال محرم بخواہ ساغر راح   کہ ماہ امن وامان است وسال صلح وصلاح

اہل مکہ نے چار ماہ ایسے مقرر کر رکھے تھے جن میں امن شکن جنگ و جدل ممنوع قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک محرم ہے اور محرم کی حرمت اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ چار ماہ سفر حج کے لیے مقررہ تھے۔ غرض یہ تھی کہ لوگ دور و نزدیک سے جب حج البیت کے لیے آئیں تو امن سے آئیں اور تین دن ایام حج گذار کر بلا خوف و خطر ان چار ماہ میں گھروں کو لوٹ جائیں۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ محرم کا چاند دیکھ کر شراب کا ساغر طلب کر کیونکہ یہ امن کا مہینہ ہے۔ اور صلح و صلاح کا کہ سال کا مہینہ شروع ہے۔ اسلامی سال ماہ محرم سے شروع ہوتا ہے۔

خواجہ کے مذہب پر ہر ایک تذکرہ نویس نے بحث کی ہے۔ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ شیعہ تھا اور سنی کہتے ہیں کہ سنی تھا حقیقت یہ ہے کہ خواجہ تفرقہ اور فرقہ بندی سے بالاتر خالص مسلم تھا مناسب مقام پر ہم اس موضوع پر بحث کریں گے۔

زمان شاہ شجاع ست و دور حکمت و شرع مراحت دل و جان کوش در صباح و رواح شاہ شجاع کا عہد ہے اور شرع و حکمت کا دور ہے اس لیے اطمینان دل و جان سے صباح اور رواح کے حصول کے لیے کوشش کر۔ صباح اور رواح سے مراد صبح کی شراب ہے۔

ایک قصیدہ خواجہ حافظ نے شاہ شجاع کی مدح میں کہا پینتیس[۳۵] اشعار ہیں مطلع ہے:

شد عرصۂ زمیں چو بساط ارم جواں   از پرتو سعادت شاہ جہانیاں

چند اشعار یہ ہیں۔

اعظم جلال دولت و دین آنکه رفعتش — دارد ہمیشہ توسن ایام زیر ران

جلال الدنیا والدین یعنی شاہ شجاع کی عظمت کی بلندی کا اندازہ اسی سے کرو۔
لیل و نہار کو ایک ابلق گھوڑا تصور کرو جو اس کی رانوں کے نیچے رہتا ہے ظاہر
کو لیل و نہار یا ایام کا ظہور سورج اور چاند اور زمین کے تعلقات اور گردش
سے ہوتا ہے، یہ ایام ایک گھوڑا ہے جس پر شاہ شجاع سوار ہے اور
وہ گردش کر رہا ہے یعنی گردش ایام اس کی مراد کے موافق ہو رہی ہے ۔

دارائی و ہر شاہ شجاع آفتاب ملک — خاقان کامگار و شہنشاہ نوجواں

دادہ فلک عنان ارادت بدست تو — یعنی کہ مرکب مراد خودت بران

یہ شعر پہلے شعر اعظم جلال الخ کی تشریح ہے کہ فلک خود ایک مرکب ہے اور
اس کی لگام شاہ شجاع کے ہاتھ میں آسمان نے خود دے رکھی ہے کہ اپنی مراد
کے موافق جس طرح چاہے اسے چلائے ۔

شاہ شجاع کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھا

رحمان لایموت چو این بادشاہ را
دید آنچناں کزو عمل خیر لایفوت
جانش قرین رحمت خود کرد تا بود
تاریخ این معاملہ "رحمان لایموت"

۷۸۶ھ

سلطان زین العابدین

شاہ شجاع کی وفات کے بعد اس کا
بیٹا سلطان مجاہد الدین زین العابدین جانشین،
اس کا مختصر دور حکومت شاہ یحییٰ اور سلطان احمد اور سلطان ابو اسحاق

سے جنگ و جدل میں گذرا۔ تو ابو حافظ اس کو اس تعلق کے لحاظ سے
جو اس کے باپ کے ساتھ تھا۔ جنگ و جدل سے منع کرتے ہیں۔
اور اس وقت یہ نصیحت کی جب وہ شاہ منصور پر غالب آچکا تھا ایک
غزل کا مطلع ہے :-

خوش کرد یاوری فلکت روزِ داوری ۔۔۔ تا شکر چوں کنی و چہ شکرانہ آوری

لڑائی کے دن ملک نے تیری مدد اچھی طرح کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تو شکر
کس طرح ادا کرتا ہے اور کیا شکرانہ پیش کرتا ہے :-

آں کس کہ اوفتاد خدایش گرفت دست ۔۔۔ گو بر تو باد تا غم افتادگاں خوری

اس شعر کا اشارہ شاہ یحیٰ اور ابو یزید کی طرف ہے کہ سلطان زین العابدین
ان پر غلبہ حاصل نہ کر سکا۔ یعنی خدا نے ان کی دستگیری کی اس لیے کہ وہ
اللہ کے حضور عجز و نیاز کرتے رہے تجھے بھی مناسب ہے کہ جسے تو
نے نیچا دکھایا ہے یعنی سلطان منصور اس کی دستگیری کرے۔ مطلب
شعر یہ ہے کہ جو اللہ کے حضور جھکتا ہے اور اس کی دستگیری کرنا
ہے تجھے بھی چاہیئے کہ اللہ کے اخلاق سے رنگین ہو اور زیردست
عاجزوں پر رحم و کرم کرے :-

در کوی عشق شوکت شاہی نمی خرند ۔۔۔ اقرار بندگی کن و اظہار چاکری

عشق کے بازار میں شوکت شاہی کا کوئی خریدار نہیں چاہیئے کہ بندگی کا
اقرار اور چاکری کا اظہار کرے۔ ایک شعر ہے کہ :-

ای سکندر بنشین و غم بیہودہ مخور ۔۔۔ کہ نہ بخشند ترا آب حیات از شاہی

ای سکندر آرام سے بیٹھ اور بے فائدہ کوشش نہ کر یہ نہیں ہو سکتا کہ
تجھے آب حیات شاہی کے بل بوتے پر ملے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں　　　این خیال است و محال است و جنون

(عارف رومی)

در شاہراہ جاہ و بزرگی خطرہاے است　　　آں بہ کہ کزیں گریوہ سبکبار بگذری

جاہ و بزرگی کے راستہ پر بے شمار خطرے ہیں بہتر یہی ہے کہ اس سے گذرتے وقت تیرے سر پر بوجھ نہ ہو تو پھلے اور گرے۔

یک حرف صوفیانہ بگویم اجازت است۔ ای نور دیدہ صلح بہ از جنگ داوری
میں تمہیں ایک نصیحت صاف صاف لفظوں میں کہتا ہوں اگر اجازت دے، ای نور دیدہ صلح بہر حال جنگ۔ داوری سے بہتر ہے "د صلح خیر)"
لیکن شاہ زین العابدین نے یہ حرف صوفیانہ اور نصیحت بزرگانہ نہ سنی، آخر شاہ منصور ہی غالب آیا۔ زین العابدین خراساں کی طرف بھاگا جب رے" میں آیا۔ یہاں کے والی نے اسے گرفتار کر کے منصور کے پاس بھیج دیا، منصور نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کے باپ شاہ شجاع نے اپنے باپ مبارزدین سے کیا تھا۔ یعنی اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی اور پھر قلعہ " سلاسل "۔ میں قید کیا۔ قلعہ سلاسل موجودہ قلعہ شوشتر ہے، خواجہ حافظ کا اشارہ شاہ یحیٰ کی مدح کے ضمن میں اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف ہے ؎

می لرزش جہانگیر کہ زلف کمندت　　　شد گردن بدخواہ گرفتار سلاسل

شاہ یحیٰ اور شاہ منصور زید العابدین کے مقابلہ میں متحد تھے۔ خواجہ حافظ زین العابدین کے غرور اور ظلم سے سخت متنفر تھے نصائح سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر بے سود، آخر اس نے اپنا انجام دیکھ لیا ؎

نصیحتے کنمت گوش کن، بیا دگیر　　　کہ ہر چہ ناصح مشفق بگویدت بپذیر

شیخ سعدی نے سچ کہا کہ

محل قابل ۔ وانگہ نصیحت قابل — چو گوش بندش نباشد چہ سود حسن مقال

نصیحت خواہ کتنی ہی فصیح و بلیغ لفظوں میں کی جائے جب تک قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو بے فائدہ ہے۔

شاہ یحییٰ

شاہ نصرت الدین یحییٰ کے حالات، ہم کچھ بیان کر چکے ہیں۔ امیر تیمور نے شیراز کی فرمانداری شاہ یحییٰ اور ابو اسحاق کو بن اویس "میرجان" کی حکومت اور کرماں کی ولایت سلطان عماد الدین احمد کو ۷۹۵ھ میں تفویض کی تھی، سلطان ابو یزید کو یہ تقسیم نہ بھائی- اس لیے لڑائی کی ٹھان لی- تیمور نے اسے کچھ نہ دیا اب یہ بزور لینا چاہتا تھا- اس کا پہلا مقابلہ سلطان عماد الدین احمد سے ہوا مگر اسیر ہوا- احمد نے قصور معاف کر دیا اور ہرمز کی طرف بھیج دیا- ابو یزید نے کچھ مال و دولت بسر اوقات کے لیے سمیٹ اور کرمان میں رہائش اختیار کی اور اپنے بھائی سلطان عماد الدین احمد کی خدمت میں مدت العمر ۷۹۵ھ تک رہا-

ہم لکھ چکے ہیں کہ شاہ منصور نے زین العابدین کو قلعہ سلاسل موجودہ شوشتر میں قید کر دیا تھا تیمور جب واپس لوٹ گیا تو شاہ منصور نے شیراز کی طرف رخ کیا- اور بڑے بھائی شاہ یحییٰ نے جب دیکھا کہ چھوٹے بھائی کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا تو شیراز چھوڑ کر "یزد" کی طرف چلا گیا- شاہ منصور نے بسہولت شیراز پر قبضہ جما لیا-

شاہ یحییٰ نے سلطان ابو اسحاق والیٔ "میرجان" اور حاکم ابرقو کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیا- اور سلطان احمد کو کرماں سے بے دخل کرنا چاہا اس متحدہ فوج کا مقابلہ صحرائے "بافت" میں ۔ جمادی الاول ۷۹۲ھ میں

سلطان احمد سے ہوا۔ متحدہ لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔ شاہ یحییٰ اور سلطان ابواسحاق نے بھاگ کر جان بچائی۔ آخرکار تیمور نے ۷۹۵ھ میں نہ صرف ان عاقبت نا اندیش بھائیوں کی خانہ جنگی کا خاتمہ کر دیا بلکہ ان کو اور دیگر افراد آل مظفر کو تلوار کی گھاٹ اتار دیا۔

شاہ یحییٰ جب یزد میں فرمانروا تھا تو خواجہ حافظ نے اس کی مدح میں اشعار کہے مگر یہ سخت کنجوس واقع ہوا تھا مگر صلہ کچھ نہ ملا۔

جب شاہ یحییٰ شیراز کا والی مقرر ہوا تو چار غزلیں اس کی مدح میں کہیں، ایک غزل کا مطلع ہے کہ ؎

دارائے جہاں نصرت دیں خسرو کامل ۔۔۔ یحییٰ بن مظفر ملک عالم عادل

دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

دانی کہ چیست دولت؟ دیدار یار دیدن ۔۔۔ در کوئے او گدائی بر خسروی گزیدن

مقطع ہے ؎

گوئے برفت حافظ از بادشاہ یحییٰ ۔۔۔ یارب بیادِ کس آمد درویش پروریدن

تیسری غزل کا مطلع ہے ؎

در ازل بست دلم با سر زلفت پیوند ۔۔۔ تشنہ پیر وصلائی بر شیخ و شاب زدہ

اس غزل میں خواجہ تشبیب میں یہ فرما رہے ہیں کہ میخانہ کو صاف اور ستھرا بنایا ہوا تھا اور چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ پیر مغاں براجمان تھے اور جوانوں اور بوڑھوں کو دعوت دے رہے تھے کہ آؤ اور پیو، فرشتہ رحمت کے ہاتھ میں ساغر عشرت تھا اور حور و پری کے چہرہ پر گلاب کی طرح چھڑک رہا تھا۔ میں نے پیری فروش کے حضور جھک کر سلام کیا تو ہنستے ہوئے کہا کہ ای مفلس شراب زدہ تو نے بے ہمتی اور ضعف

رائے سے وہ کام کیا جو کوئی کرتا پسند نہیں کرے گا۔ تو ایسی جگہ سے جہاں گنج تھا نقل مکانی کر کے خرابیں میں آگیا مجھے ڈر ہے کہ دولت بیدار جس کے وصل کا تو خواہاں ہے تیری ہاتھ نہیں آئے گی تو اپنے بخت خواب زدہ کے آغوش میں سویا ہوا ہے۔ ؎

فلک جنیبہ کش شاہ نصرت الدین است　　　بیا ببیں ملکش در رکاب زدہ

آسمان شاہ نصرت الدین یحیٰ کے آستانہ پر ماتھا رگڑ رہا ہے تو بھی آکر دیکھ لے کہ ملک اس کی رکاب سے وابستہ ہے۔ ؎

خرد کہ ملہم غیب است بہر کسب شرف　　　ز بام صدق صدش بوسہ بر جناب زدہ

خرد جو کہ ملہم غیب ہے شرف حاصل کرنے کے لیے سچے دل سے وفعہ اس کے حضور آستان پر بوسہ دیتا ہے۔

بیا بمیکدہ حافظ کہ بر تو عرضہ کنم　　　ہزار صف ز دعا ہای مستجاب زدہ

اے حافظ تو میخانہ میں آ تا کہ تجھے بتاؤں کہ دعائے مستجاب نے کس طرح ہزار صفیں توڑ دیں؟

چوتھی غزل کا مطلع ہے ؎

آنکہ بر ماہ از خط مشکیں نقاب انداختی　　　لطف کردی سایۂ بر آفتاب انداختی

تو نے اپنے چاند جیسے مکھڑے پر سیاہ زلفوں کا نقاب ڈالا ہوا ہے کیا بات ہے کہ آفتاب کو زیر سایہ لے لیا۔ ؎

از فریب نرگس مخمور و لعل می پرست　　　حافظ خلوت نشین را در شراب انداختی

تیری متوالی انکھڑیوں اور شرابی سرخ ہونٹوں نے وہ فریب دیا کہ حافظ گوشہ نشین کو شراب میں ڈال دیا۔ یعنی وہ بھی ان کا متوالا ہو گیا۔ ؎

از برای صید دل در گردنم زنجیر زلف　　　چوں کمند خسرو مالک رقاب انداختی

دل کا شکار کرنے کے لیے میرے گردن زنجیر گیسو میں ایسی جکڑی جیسے بادشاہ اسیروں کی گردنیں کمند میں باندھ رکھتا ہے

داعدار شکوہ ای آنکہ تاج آفتاب از سر تعظیم بر خاک جناب انداختی

وہ دارا کی شان و شکوہ والا داور جس کے قدموں کی خاک پر آفتاب بپاس تعظیم اپنا تاج ڈال رہا ہے۔

نصرت الدین شاہ یحییٰ آنکہ خصم ملک را از دم شمشیر چوں آتس دو آب انداختی

تلوار میں آب ہے اور آگ پانی میں بجھ جاتی ہے۔ شمشیر کی دھار دونوں کام کرتی ہے۔ جو بھی نصرت الدین یحییٰ کے ملک کا دشمن ہے اسے موت کی گھاٹ اتار کر وہ کام کرتی ہے جو پانی آگ سے کرتا ہے دشمن ملک مثل آگ ہے۔ اور آب شمشیر اس کو بجھانے والی شے ہے

شاہ منصور

شاہ منصور کی مدت حکومت ۷۹۰ھ سے ۷۹۵ھ تک ہے۔ یہ شخص شجاعت مجسم تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آل مظفر میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا کرتا ہے ان کو بھی بھگتنا پڑا۔ شاہ منصور نے غلبہ کے بعد سلطان احمد اور شاہ یحییٰ کو پیام دیا کہ مناسب ہے کہ ہم سب تیمور کے خلاف متحد ہو جائیں اور سب اپنا اپنا لشکر میرے حوالہ کر دو میں خراسان پر یورش کرنا چاہتا ہوں اور اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سلطان احمد تیمور سے سخت خائف تھا اس لیے شاہ منصور کی درخواست مسترد کر دی۔ اس پر شاہ منصور نے دونوں کی ولایت کرمان اور یزد کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

تیمور کو بھی شاہ منصور کی دیدہ دلیریوں کی اطلاع ہوئی تو دوسرا

۷۹۵ھ میں قلعہ سفید مسخر کیا۔ یہاں سلطان زین العابدین نابینا مقید تھا اسے نجات دی اور وعدہ کیا کہ تمہارا انتقام شاہ منصور وغیرہ سے لوں گا شاہ منصور نے قریباً پانچ سوار پیادہ جمع اور شیراز سے تین کوس کے فاصلہ پر تیمور کا مقابلہ کیا۔ تیمور کے ہمرکاب اس وقت تیس ہزار کی جمعیت تھی۔ مگر شاہ منصور نے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ اس زور کا حملہ کیا تیموری لشکر کی صفیں قلب تک توڑ کر رکھ دیں۔ مردانہ وار تیمور کی طرف بڑھا۔ تیمور اس وقت تنہا رہ گیا تھا۔ اس کا علمدار بھی بھاگ چکا تھا۔ شاہ منصور نے پے در پے تلوار کی ضربات پورے زور سے لگائیں لیکن اس صاحب اقبال پر کچھ اثر نہ ہوا۔ تیمور لوہے میں غرق تھا اتنے میں پراگندہ سرداران فوج پھر جمع ہوئے اور شاہ منصور کو نرغہ میں لے لیا۔ شاہ زخموں سے چور ہو رہا تھا لیکن برابر شمشیر براں بلکہ اپنے زور بازو کے جوہر دکھا رہا تھا۔ گھوڑا بھی سخت زخمی تھا وہ گرا تو شاہ بھی زخموں سے نڈھال گرا اور پھر نہ ابھرا۔ تیموری لشکر نے اس کا سر "الوحش" (تیمور) کے گھوڑے کے قدموں میں ڈال دیا۔ ایک شاعر نے اس کی شہادت کی تاریخ لکھی۔

شہریارے مصر منصور آنکہ او — روز ہیں ملک تخم داد کشت
ملک ہشت از در دنیا چوں بہشت — لاجرم تاریخ او شد ملک ہشت

۷۹۵ھ

منصور کے ساتھ آل مظفر کا خاتمہ ہو گیا۔ ستر ہزار ہوانان ایران کا قتل عام اور ان کے سروں کا ایک مینار چنا گیا۔ عرب مورخین تیمور کو "الوحش" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس نے چنگیز خاں کا اپنا نمونہ

مقرر کیا تھا۔ وہ تو نا مسلمان تھا اور اسے دعویٰ مسلمانی تھا، خواجہ حافظ نے شاید اسی کے حق میں کہا تھا۔ ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر از پس امروز بود فردائے

شاہ منصور خواجہ حافظ کا ممدوح ہے، خواجہ منصور کی شہادت سے پیشتر وفات پا چکے تھے، اور یہ حادثہ فاجعہ نہ دیکھا جب پہلی دفعہ شاہ منصور زین العابدین کو شکست دے کر شیراز میں داخل ہوا تو خواجہ نے خیر مقدم کیا۔ ؎

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید
نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید

آؤ اور دیکھو کہ شاہ منصور کا جھنڈا لہراتا ہوا شیراز کی طرف آرہا ہے فتح کی خوشخبری اور مژدہ مہر و ماہ تک پہنچ گیا۔ ؎

جمال بخت ز روئے ظفر نقاب انداخت
کمال عدل بفریاد داد خواہ رسید

فتح کے چہرہ سے حسن بخت نے نقاب الٹ دیا۔ یعنی ظفر کی وجہ سے حسن بخت شاہ منصور بے حجابانہ جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ اور عدل کے کمال کا تقاضہ ہی یہی ہے کہ ہر ایک دادخواہ کی فریاد سنکر اسکی مصیبت دور کرے

سپہر دور خوش اکنوں کند کہ ماہ آمد
جہاں بکام دل اکنوں رسد کہ شاہ آمد

آسمان اب خوش خوش گردش اس لیے کر رہا ہے کہ چاند طلوع ہوا اور جہاں کی مرادیں اب بھر آئیں کیونکہ بادشاہ تشریف لے آیا۔ ؎

ز قاطعان طریق ایں زماں شوند ایمن
قوافل دل و دانش کہ مردہ را رسید

اس عہد میں اہل دل اور اہل دانش کے قافلے ڈاکوؤں سے امن میں ہیں کیونکہ مردِ راہ پہنچ گیا۔ ؎

عزیز مصر برغم برادراں غیور
ز قعر چاہ بر آمد باوج ماہ رسید

یوسفؑ اور آپ کے بھائیوں کا قصہ مشہور ہے۔ شاہ منصور تو یوسف مصری ہے اور بھائیوں نے اسے کنوئیں میں ڈال رکھا تھا یوسف عزیز مصر ہوا اور یہ بھائیوں پر غالب آکر آخر ماہ کنعان کی طرح چاند کی بلندی تک پہنچ گیا ہے۔

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل　　بگو بسوز کہ مہدی دیں پناہ رسید

صوفی دجال چشم (کانا) اور ملحد اس مصرع میں تیمور ہے۔ اور اس کا پھو شاہ یحییٰ جس کو شیراز کی حکومت سے حملہ کے بعد تفویض کی تھی۔ تیمور کے عقاید مذہبی میں الحاد کی آمیزش کی۔ وہ صوفیوں کا بہت گرویدہ تھا چنانچہ جب سلطان روم بایزید یلدرم کو شکست دے کر ہزاروں ترک سپاہی اسیر کر کے لایا تو شاہ صفی الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر زو جواہر نذرانہ پیش کیے۔ شاہ نے کہا کہ اگر کچھ دینا چاہتے ہو تو سب اسیران جنگ میرے حوالہ کر دو۔ تیمور نے شاہ صاحب کے حوالہ کر دیئے۔ یہ آپ کی خانقاہ کے درویش بنے۔ تیمور ہی ان کے آذوقہ کا کفیل تھا۔ یہی بعد میں قزلباش کہلائے اور شاہ صاحب کے خلف الرشید اسمٰعیل سے خاندان صفوی کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اور یہی قزلباش اس حکومت کو تقویت دیتے رہے!

تیمور کا عقیدہ مذہبی فرقہ باطنیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، فرقہ باطنیہ کو اہل سنت والجماعت "ملحد" کہتے، اور وہ ان کو اہل قال اور اہل ظاہر طنزاً کہتے۔

خواجہ حافظ شاہ منصور کے حق میں دعا فرماتے ہیں۔ غزل کا مطلع ہے کہ۔

سحر چوں خسرو خاور علم بر کوہساراں زد　　بدست مرحمت یارم در امیدواراں زد

جب صبح کے وقت شاہ مشرق یعنی آفتاب نے اپنا جھنڈا پہاڑوں پر گاڑ دیا میرے دوست کا دست کرم امیدواراں رحمت کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

شہنشاہ مظفر شجاع ملک و دین منصور۔ کہ جود بے دریغش خندہ برابر بہاران زد

شاہ منصور جو شہنشاہ مظفر فر اور ملکی اور دینی سلطنت کو بزور بازو شجاعت سے لے چکا ہے اسکی سبے دریغ بخشش ابر بہار کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔

دوام عمر و ملک او بخواہ از لطف حق حافظ۔ کہ چرخ ایں سکہ دولت بنام شہریاراں زد

ای حافظ تو دعا کر کہ اللہ تعالےٰ اس کی عمر دراز کرے اور اس کا ملک ہمیشہ رہے کیونکہ آسمان نے یہ سکہ دولت شہریاروں کے نام پر ڈھالا ہے۔

خواجہ اپنی شہرت کا موجب بھی شاہ منصور کو سمجھتے ہیں حالانکہ خواجہ حافظ کی وجہ سے منصور کا نام زندہ ہے۔

الا ای طوطی گویائے اسرار مبادا خالیت شکر ز منقار

طوطی شیریں سخن تو خود خواجہ حافظ ہیں جو اسرار کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اپنے ہی حق میں دعا کرتے ہیں کہ تیری منقار کبھی شکر سے خالی نہ رہے۔

بہ یمن دولت منصور شاہی علم شد حافظ اندر نظم اشعار

شاہ منصور کی حکومت ہی کی برکت سے حافظ کی شاعری کا مرتبہ بلند ہو رہا ہے۔

خواجہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شاہ منصور جو مظفر و منصور ہو رہا ہے تو میری توجہ اور التفات باطنی کے ساتھ۔

گرچہ با بندگاں پادشاہیم   بادشاہاں ملک صبح گہیم

اگرچہ ہم بادشاہ کے غلام ہیں مگر صبح کے وقت ہماری شاہی کا ہے یہ وقت اجابت دعا کا ہے۔ یعنی بادشاہ کی بندگی کا تقاضا ہے کہ ہم بوقت صبح اس کے حق میں دعاء خیر کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے

گو غنیمت شمار ہمت ما   کہ تو در خواب و ما بدیدہ گہیم

بادشاہ سے کہو کہ ہماری صبح خیزی اور دعاء دولت جو دلی توجہ سے کرتے ہیں غنیمت سمجھ کہ تو تو اطمینان سے اس وقت خواب راحت میں ہوتا ہے اور ہم نگہبانی کرتے ہیں۔

شاہ منصور واقفست کہ ما   روئے ہمت بہر کجا آریم

دشمناں را ز خون کفن سازیم   دوستاں را قبائی فتح دہیم

شاہ منصور اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ ہم جس طرف "ہمت" سے توجہ کریں دشمنوں کو خونی کفن پہناتے ہیں اور دوستوں کو فتح کی قبا،

وام حافظ بگو کہ باز دہند   کردہ اعتراف و ما گوہیم

حافظ کا قرض کہو کہ ادا کرے تو نے مان لیا ہے اور ہم گواہ ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ داتا دان کرے بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔ خزانچی پرلے درجہ کے خسیس ہوتے ہیں بادشاہ کسی پر نوازش فرما کر انعام و اکرام کا حکم دیتا ہے تو یہ پیٹ پکڑ کر رہ جاتے ہیں، شاہ منصور کے وزیر خزانہ نے بزرگان شہر شیراز کے مقررہ وظیفہ ستر تومان کو ایک چوتھائی کم کر دیا۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو سخت خفا ہوا اور کہا کہ اب اصل پر تیس اور زیادہ کرو یعنی سو تومان۔ خواجہ حافظ نے بادشاہ کی سخاوت کی داد

اس قطعہ میں دی ۔

بادشاہا لشکر توفیق ہمراہ تواند خیز اگر عزم تسخیر جہاں رہ میکنی

اے بادشاہ اللہ نے تجھے توفیق کی فوج عنایت کی ہے جو تیرے ہمراہ ہے اگر تو جہاں کے دل کو مسخر کرنا چاہتا ہے تو اٹھ اور اپنا کام کر۔

آنکہ دو ما ہفت آورد لیبی سود مے نکرد فرصت بادہ کہ ہفت دینم زادہ میکنی

اس شعر کے دو معنی ہیں ایک یہ ہے کہ اصل وظیفہ سو تومان تھا۔ جس کو وزیر نے پچھتر تومان کم کرکے بنا دیا۔ شاہ کے حکم سے دوبارہ سو برقرار رہا اور اگر اصل پچھتر تومان تھا جس کی چوتھائی کم کر دی گئی تو بحکم شاہ نہ صرف یہ کمی پوری کی گئی بلکہ سو تومان تک اضافہ ہو گیا۔

خواجہ نے ایک قصیدہ غزل نما پچیس اشعار کا کہا مطلع ہے

بجاز سہر نہاد حمایل بر ابرم یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

اس قصیدہ کا شعر ہے کہ ۔

منصور بن مظفر غازیست حرز من وز این خجستہ نام بر اعدا مظفرم

یہ قطعہ بھی دعائیہ ہے ۔

روح القدس آں سروش فرخ بر قبہ طارم زبرجد

می گفت سحر گہے کہ یارب در دولت و حشمت مخلد

بر مسند خسروی بماناد منصور مظفر محمد

غیاث الدین سلطان بنگال

سلطان غیاث پسر شاہ سکندر پسر حاجی الیاس الملقب بہ شاہ شمس الدین بھنگرہ خواجہ حافظ کا ہمعصر ہے ۔ اپنا وقت عیش و عشرت میں گذارتا رہا سات سال اور چند ماہ سلطنت کے بعد ۷۷۵ھ میں فوت

ہوا۔ اس کے دربار میں علما و فضلاء کے علاوہ شعرا بھی تھے۔ سلطان اکثر نشہ شراب میں مست رہتا اور جو کچھ مستی کے لوازمات ہیں بہ تقاضائے جوانی دیوانی بھی جیا تھے اور ان سے لطف اندوز ہوتا۔ ایسی بے اعتدالی کا لازمی نتیجہ بیماری بھی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ بیمار ہوا۔ علاج معالجہ سے اچھا ہو گیا۔ محل میں تین کنیزیں سرو و گل و لالہ نامی تھیں اور ان کے سپرد خدمت غسل تھی۔ غسل صحت کرتے وقت کنیزیں ایک دوسرے سے نوک جھونک مزاحیہ باتیں بھی کرتی تھیں۔ سلطان کے ذہن میں یہ مصرع آیا۔ ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود۔ دوسرا مصرع موزوں نہ ہو سکا۔ شعرا دربار سے فرمائش کی۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کہا مگر سلطان کو پسند نہ آیا۔ ایک درباری نے کہا کہ کاش اس وقت خواجہ حافظ ہوتے تو مصرع موزوں کرتے۔ جب سلطان کو خواجہ کے حالات اور شاعران عصر میں آپ کے ممتاز مرتبہ کی اطلاع ہوئی تو کہا کہ اچھا یہ مصرع خواجہ کی خدمت میں ارسال کیا جائے کہ اس پر طبع آزمائی کریں اور ہندوستان کے تحفے بھی بطور نذرانہ ارسال کیے۔ خواجہ نے ملاحظہ کے وقت اس پر ایک غزل کہی اور سلطان کے قاصدوں کے ذریعہ بھیج دی۔ ؎

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود — ویں بحث با ثلاثہ غسالہ می رود

واقعہ کے لحاظ سے تو شعر کا مطلب واضح ہے کہ سرو و گل و لالہ تین غسالہ ہیں انہی کی یہ باتیں ہیں۔ لیکن مطلب اور بھی ہے حکماء یونان نے شراب نوشی کے اوقات اور معمول اس طرح مقرر کیا ہے کہ صبح کے وقت تین پیالہ شراب پیتے ہیں غرض یہ ہے کہ معدہ کا غسل اور صفائی ہو جائے۔ اسے "ثلاثہ غسالہ" کہتے ہیں۔ اور طعام کے بعد پانچ پیالے

پیتے ہیں غرض یہ ہے کہ طعام ہضم ہو جائے اسے "خمسہ یا خمرہ" کہتے ہیں، پھر سوتے وقت سات پیالے پیتے ہیں کہ نیند گہری ہو

شعر کا مطلب تو اتنا ہی ہے کہ موسم بہار کا آغاز ہے اور سرو گل و لالہ کی خوش کن گفتگو صبح کے ثلاثہ غسالہ کے ساتھ ہو رہی ہے مے وہ کہ نو عروس چمن حد حسن یافت - کار ایں زماں ز صنعت دلالہ می رود دلہن کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے مشاطہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں شعر کا مطلب یہ ہے کہ سلطانہ کو بھی کسی دلالہ نے جا لگائی کہ بوقت غسل لونڈیاں کیا مخل کر رہی تھیں۔ عروس چمن ملکہ حرم ہے یعنی حدیث سرو و گل و لالہ دلالہ نے ملکہ کے گوش گذار کی اور ملکہ نے سلطان سے اس کا ذکر بہ سبیل حکایت یا شکایت کیا۔

یہاں تک وہ باتیں تھیں جس کا علم سلطان ہی کو تھا۔ اور خواجہ نے سب پتہ کی باتیں کہہ دیں۔ شعرائے دربار لے جا رہے کیا کہتے اس لیے خواجہ ان پر بھی چوٹ کر گئے۔ ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیاں ہند ز یں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

سب ہے طوطیاں ہند یعنی شاعران ہندوستان کو شکر شکن بنا دے گی اور ساتھ ہی اپنی کرامت کی طرف بھی لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا کہ

طے مکاں ببیں زمان در طریق شعر کایں طفل یک شبہ رہ یک سالہ می رود

میرے اشعار کا اعجاز دیکھو کہ غزل میں نے ایک رات میں کہی گویا یہ ایک رات کا بچہ ہے جو میرے دماغ کی پیدائش ہے مگر ایک رات کا بچہ تو چل پھر نہیں سکتا، اور تعجب طفل یک شبہ ہے کہ ایک

سال کی مسافت طے کرکے شیراز سے بنگالہ میں پہنچ گیا ۔ ؎

آں چشم جادوانہ عابد فریب بیں　　کش کاروان سحر زدنبالہ می رود

وہ جادو نظر دیکھو جو عابد کو بھی اپنا گرویدہ بنا کر فریب دیتی ہے اس کی پیچھے پیچھے کارواں سحر رواں ہے۔ آنکھ میں سرمہ دنبالہ دار کاروان سحر ہے جس نے اس زاہد فریب آنکھ کو دیکھا مسحور ہو کر رہ گیا ۔ ؎

خوی کردہ می خرامد بر عارض سمن　　از شرم روی او عرق از ژالہ می رود

ہماری اردو میں ژالہ کے معنی " اولے " ہیں مگر فارسی میں اس کے معنی شبنم کے قطرے ہیں۔ یا مطلق پانی کے قطرے ہیں نشاط کہتا ہے کہ " بر لالہ ژالہ می چکد از ابر مشک فام " یعنی لالہ پر بارش کے بوندیں پڑ رہی ہیں۔ مطلب شعر یہ ہے کہ ایک تو تابش حسن سے اور دوسرے شرم کی وجہ سے اس کے رخسار پر پسینہ کے قطرے وہ غضب ڈھا رہے ہیں کہ سمن دیکھ دیکھ کر پانی ہو رہا ہے، اس کے بعد خواجہ حافظ ناصحانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ ؎

ایمن مشو ز عشوہ دنیا کہ ایں عجوز　　مکارہ می نشیند و محتالہ می رود

اس دنیا اور اس کی زینت پر نہ جا کہ یہ بڑھیا مکر و فریب کی پڑیا اس گھات میں لگی رہتی ہے کہ چکمہ دیا اور اپنا راستہ لیا یعنی سخت بے وفا ہے۔

چوں سامری مباش کہ زر دید از خری　　موسیٰ بہشت وانسے گو سالہ می رود

سامری کو بھی ساحر کہا گیا ہے اور بنگالہ کا جادو بھی مشہور ہے علاوہ ازیں ہندو سب گو سالہ پرست ہیں، خواجہ نصیحت کرتے ہیں کہ تو سامری نہ بن کہ اس نے بنی اسرائیل سے سونا لیکر ایک بچھڑا ڈھال دیا اور اسرائیلیوں کو کہا یہ تمہارا خدا ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا، اس

کی پوجا کرو، سامری نے حضرت موسےٰ کی روش اور ملت توحید کو چھوڑ دی اور گوسالہ پرستی کی، یہ گدھا پن ہے اور تو بھی احمق نہ بن کہ اس چند روزہ زندگی کو عیش و عشرت میں تباہ کر رہا ہے مناسب یہ ہے کہ اللہ سے لو لگائے۔ اب پھر نصیحت کے بعد گریز کرتے ہیں کہ ؎

باد بہاری وزد از گلستان شاہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وز ژالہ بادہ در قدح لالہ می رود

بادشاہ کے باغ میں باد بہار چل رہی ہے اور ابر بہار سے مینہ شراب کی طرح لالہ کے پیالہ میں انڈیلا جا رہا ہے۔ ؎

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

ای حافظ سلطان غیاث الدین کے دربار میں باریابی کا شوق ہے تو چپکا نہ بیٹھ تو اگر وہاں نہیں پہنچ سکتا تیرا نالہ رسا وہاں جا سکتا ہے اور تیرے اشتیاق کا حال سلطان پر واضح ہو جائے گا۔

سلطان قطب الدین تہمتن بن توران شاہ ہرمز

ہم بیان کر آئے ہیں کہ سلطان محمود شاہ بہمنی دکنی کی دعوت پر خواجہ حافظ نے ہرمز تک سفر کیا مگر یہاں سے لوٹ آئے۔ ہرمز میں سلطان قطب الدین بن تہمتن بن توران شاہ حکمران تھا اسے اطلاع ہوئی کہ خواجہ حافظ تشریف لائے تھے مگر واپس چلے گئے فوراً۔ اپنے آدمی بھیجے کہ خواجہ کی خدمت میں التماس کریں کہ واپس تشریف لائیں کہ میں مہمانداری کا فرض تو ادا کر دوں۔ خواجہ بہت دور نکل چکے تھے مگر آدمی جا ملے اور سلطان کا پیغام دیا خواجہ بہت متاثر ہوئے مگر عذر خواہی کی اور اسی وقت ایک غزل لکھ کر حوالے کی کہ سلطان کی خدمت میں میری طرف سے پیش کر دینا۔

من کہ باشم کہ بر آں خاطر عاطر گذرم — لطف ہا می کنی ای خاک درت تاج سرم

میں تو ایک گدائے گوشہ نشین ہوں میری کیا ہستی ہے کہ سلطان مجھے یاد فرمائے مگر سلطان کے عنایات و الطاف کا شکریہ اس بندہ نوازی کا تقاضہ ہے کہ میں تیرے دروازہ کی خاک کو اپنے سر کا تاج بنادوں، یعنی میرا سر ہو اور تیرا آستانہ ہے

دلبرا بندہ نوازیت کہ آموخت بگو — کہ من ایں ظن برقیباں تو ہرگز نبرم

تیرے لطف و کرم نے میرا دل موہ لیا ہے تو بتا کہ یہ بندہ نوازی تونے کس سے سیکھی ہے۔ کیونکہ میں تیرے رقیبوں سے خوب واقف ہوں ان کی نسبت تو یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کوئی کلمہ خیر میرے حق میں کہا ہوگا اور مجھے بندہ نوازی پر آمادہ کیا، یعنی لطف و کرم کرنا تیری سرشت میں ہے۔ تو طبعاً خیر اور بندہ نواز ہے ۔ ہے

ہمتم بدرقہ راہ کن ای طائر قدس — کہ دراز است رہ مقصد و من نو سفرم

اے طائر قدس اپنی ہمت سے میری رہنمائی کر کہ منزل دور دراز ہے اور میں پہلی دفعہ سفر پر نکلا ہوں، ایسا نہ ہو کہ سفر کی تکلیف برداشت نہ کر سکوں اور ہمت ہار کر بیٹھ رہوں ۔ ہے

اے نسیم سحری بندگی من برساں — کہ فراموش مکن وقت دعا سحرم

اے باد صبا میرا نیاز پہنچا دے اور یہ کہہ کہ مجھے دعائے سحر وقت بھولنا

راہ خلوتگہ خاصم بنما تا پس ازیں — مے خورم با تو دیگر غم دنیا نخورم

مجھے وہ خلوت گاہ خاص الخاص کی راہ بتا کہ اکیلے تیرے ساتھ بیٹھ کر شراب پیئوں اور پھر غم دنیا نہ کھاؤں ۔ ہے

خرم آں روز کزیں مرحلہ بربندم بار — وز سر کوئی تو پرسند رفیقاں خبرم

کیسا اچھا وہ دن ہو گا کہ اس مرحلہ سے بوریا بستر باندھ کر چل دوں اور تیرے کوچہ میں جا کر ایسا گم ہو جاؤں کہ رفیق میری خبر تیرے کوچہ سے دریافت کریں یا رفیق مجھ سے تیرے کوچہ کے حالات دریافت کریں

پایہ نظم بلند است جہانگیر بگو
تا کند پادشہ بحر دہاں پر گہرم

میری نظم کا مرتبہ بلند ہے اور عالمگیر ہے "سلطان بحر" کو سنا دو تاکہ میرا منہ موتیوں سے بھر دے۔ سلطان ہرمز کو "سلطان بحر" بھی کہتے تھے۔

حافظا شاید از طلب گہر وصل
دیدہ دریا کنم از اشک و درو غوطہ زنم

اے حافظ ممکن ہے بلکہ زیبا ہے کہ تو گوہر وصل کی تلاش میں آنکھ کے آنسوؤں کے پانی سے دریا بہائے اور اس میں غوطہ لگائے۔

مشہور و معروف سیاح ابن بطوطہ بھی خواجہ حافظ کا ہمعصر ہے جب ہرمز میں وارد ہوا تو شاہ ہرمز سے بھی ملاقات اس کے وزیر شمس الدین محمد علی کی معرفت کی، ابن بطوطہ شاہ کے حالات اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ نہایت سادہ وضع کا آدمی ہے۔ لباس بھی سادہ، میں تو پہلے اس کو پہچان نہ سکا۔ اپنے مصاحبوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا مجھ سے میرے سفر کے حالات دریافت کیے اور ان سلاطین کی نسبت بھی پوچھتا رہا جن سے میں ملاقات کر چکا تھا۔

امیر تیمور گورگانی ۷۷۱ - ۸۰۷ھ

امیر تیمور خواجہ کا ہمعصر تھا۔ اگرچہ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے "تذکرہ الشعراء" میں ذکر کیا ہے کہ خواجہ کی ملاقات امیر تیمور سے ہوئی اور اسی کے حوالے سے دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس واقعہ کو دہرایا

ہے کہ جب امیر خواجہ سے ملا تو کہا کہ تمہارے بدن پر تو پھٹڑے بھی نہیں اور بخشش کا یہ حال ہے کہ میرا وطن مالوف سمرقند بخارا ایک خال ہندو پر نثار کر دیا۔ خواجہ نے کہا کہ اسی داد و دہش کا نتیجہ ہے کہ مجھ قلاش کو اس حال میں دیکھ رہے ہو۔ دولت شاہ عموماً ایسے لطایف اختراع کرتا ہے اس کے تذکرہ میں ایسے واقعات تاریخی حیثیت سے ساقط ہیں لیکن اس میں کچھ نہیں کہ یہ شعر کہ ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

ایک پیش گوئی ضرور ہے جو اپنے وقت پر پوری ہوئی۔ امیر تیمور کی اولاد کو سمرقند و بخارا سے دست بردار ہونا پڑا اور ہندوستان میں ہی سلطنت مغلیہ قائم کی۔

خواجہ حافظ امیر تیمور سے سخت متنفر تھے۔ اس نے جو کچھ اسلام اور اہل اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ تیمور کے سامنے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کا نمونہ تھا۔ وہ بالکل انہی کے نقش قدم پر چلا۔ اس نے جس طرح ایران میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا ایسا واقعہ نہ تھا کہ خواجہ اس کو نظر انداز کرتے، ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

ہشیار زیرک وازبادہ کہن دو منے　　فراغتے وکتابے و گوشۂ چمنے

اس پر آشوب زمانہ میں جس کا آغاز چنگیز خاں کی ترکتازی سے ہوا اور خواجہ حافظ کی زندگی کے بعد بھی تیمور پر ختم ہوا۔ اس عہد میں جبکہ ہر ایک شخص کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، اس مفقود اور بدنظمی کا عہد بدورہ تھا۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ اگر دو دوست دانا

اور پرانی شراب دو آتشہ اور ذرا فراغت میسر ہو تو کتاب کا مطالعہ چمن کے کسی گوشہ میں ہو تو اس سے بڑھ کر لطف زندگی نہیں۔

من ایں مقام بدنیا و آخرت ندہم　　اگرچہ در پےِ افتند خلق انجمنی

ایسا مقام فراغت و قناعت جس کا مذکور ہوا دنیا اور آخرت کی نعمتیں بھی مجھے اس کے عوض ملیں تو ہاتھ سے نہ دوں خواہ دنیا جہاں کے لوگ اصرار کریں اور مجھے اس کے چھوڑنے پر مجبور کریں۔

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود　　بزہد ہمچو توئی یا بفسق ہمچو منی

حقیقت یہ ہے کہ اس کارخانہ دنیا کی رونق کبھی کم نہیں ہوسکتی، نہ تو تیرا زہد و تقویٰ اسے کچھ بڑھا سکتا ہے اور نہ میرے فسق و فجور سے اس میں کچھ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یعنی زہد و تقویٰ اور فسق و فجور کا اثر نظام کائنات پر کچھ نہیں ہوتا۔ جذبات انداز بیان بھی ہے کہ خواجہ یہ نہیں فرماتے کہ میرا زہد و تقویٰ معاشرتی زندگی کی رونق بڑھا رہا ہے، اور اکثریت کا فسق و فجور کم کر رہا ہے۔ بلکہ فسق کو اپنے طرف منسوب کرتے ہیں اور اکثریت کو متقی ہی کہتے ہیں حالانکہ امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زہد و فسق کا اثر انفرادی زندگی پر پڑتا ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ اکثریت اعلیٰ درجہ کی پرہیزگار اور راستباز ہے تو کارخانہ دنیا پر اس کا اثر نہیں پڑتا اور اگر اس کے خلاف فسق و فجور میں مبتلا ہے تو کچھ اپنا ہی بگاڑ رہی ہے مگر دنیا جیسی تھی ویسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ چنگیز خاں اور ہلاکو اور تیمور سے بہت بڑھ کر غارت گر ہوئے اور ہوں گے مگر دنیا کا کیا بگاڑا۔ اس کی رونق جیسی پہلے تھی اب بھی ہے بلکہ کچھ

کچھ زیادہ سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔

ہر آنکہ کنج قناعت بہ گنج دنیا داد　　فروخت یوسف مصری بکمترین ثمنی

یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو چند ٹکوں کے عوض فروخت کر دیا۔ اور بھائی کو اغیار کا غلام بنا دیا۔ یوسف کو تو اللہ نے وہ عزت دی کہ عزیز مصر ہو گیا۔ اور بھائیوں کو اس کے حضور جھکنا پڑا۔ اسی طرح جو شخص کنج قناعت چھوڑ کر گنج دنیا کا طالب ہے اس کی مثل بھی یوسف اور برادران یوسف کی سی ہے کہ اعلیٰ شے ادنیٰ کے عوض فروخت کر رہا ہے۔ "دنیا" کے معنی وہ شے جو نزدیک تر ہے۔ ادنے شے وہ ہے جو بسہولت ہاتھ آئے اور وہ نزدیک تر ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم حقیر شے ہے، جو شے دور تر ہو وہ زیادہ کوشش سے ہاتھ آتی ہے اس کو اصطلاح میں "آخرت" سے تعبیر کرتے ہیں، لہٰذا یہ پائیدار اور گراں قدر بھی ہوتی ہے۔ جو ادنیٰ زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہے وہ اعلیٰ زندگی کے فوائد سے محروم رہتا ہے۔ ادنیٰ زندگی فانی اور اس کے فوائد محدود ہیں اور یہی خورد و نوش و پوشش کے سامان ہیں اور یہ محض بہائم کی زندگی ہے۔ یہ ادنے زندگی بہائم اور انسان میں یکساں ہے کہ دونوں پیدا ہوتے، پرورش پاتے، سوتے جاگتے۔ اور آخر مر کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ مگر انسان کی امتیازی خوبی کچھ اور ہے اور اس کا تقاضہ بھی اور ہے یہ کہ آخرت کی زندگی کے لیے سعی بلیغ کرے۔

یہ ہیں دو آئینہ جام نقشبندی غیب　　کہ کس بیاد ندارد چنیں عجب ثمنی

آئینہ جام" سے مراد "دل" ہے مگر ذرا اپنے دلوں کو ٹٹولو اور اس

صورت حالات کا جائزہ لو جو رونما ہو رہی ہے تو تم پر منکشف ہو جائے گا کہ ایسا پر آشوب زمانہ پہلے کبھی نہیں گذرا ہے

ز تندباد حوادث نمی تواں دیدن — دریں چمن کہ گلے بودہ است یا سمنی

یہ طوفان بدتمیزی جو آج برپا ہے یہ حادثہ کی صرصر جو آج چل رہی ہے اس نے اس چمن عالم انسانی کو ایک ویرانہ بنا دیا۔ اور درختوں پر ایک پتہ بھی نہ چھوڑا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کبھی لہلہاتا باغ تھا اور وہ باغباں کہاں ہے کہ رو رو کر یہ بتائے کہ یہاں سبزہ یہاں گل تھا۔

ازیں سموم کہ بر طرف بوستاں بگذشت — عجب کہ بوئے گلے ہست رنگ نسترنی

یہ زہریلی ہوا جو بوستان پر گذری اس کے بعد یہ بات نہایت تعجب انگیز ہوگی کہ اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں پھولوں کی خوشبو اور نسترن کی رنگینی بھی کبھی تھی۔ یعنی ان کی یاد تک دلوں سے محو ہو چکی ہے۔ چمن اور چمن کی خوشبو اور رنگینی کا کیا مذکور ہے۔

نگار خویش بدست کساں ہمی بینم — چنیں شناخت فلک حق خدمت چو منی

نگار سے مراد یہاں ایران بالخصوص شیراز ہے، جو اب اغیار کے ہاتھ میں چلا گیا۔ خواجہ حافظ کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ ایران کے تمدن اور تہذیب کو مجھ جیسے لوگوں نے ترقی دی، اور خدمت ملک و ملت میں عمر صرف کر دیں وہ آج ان ظالموں کے ہاتھ پڑا کر اس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

بصبر کوش تو اے دل کہ حق رہا نکند — چنیں عزیز نگینے بدست اہرمنی

قصہ سلیمان مشہور ہے کہ آپ کے پاس ایک انگشتری تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ یہ انگشتری کسی طرح ایک دیو کے قبضہ میں آگئی۔ دیو تو سلطنت

پر اسی اسم اعظم کی برکت سے قابض ہو گیا۔ اور حضرت سلیمان اس سے محروم ہو گئے۔ ایرانی جمشید کو حضرت سلیمان سمجھتے ہیں، "ملک سلیمان" یعنی شیراز وغیرہ تصور کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو مصائب تیمور کی وجہ سے ملک پر نازل ہوئے اس پر صبر کرنا چاہیے۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت اور حکمت سے یہ بعید ہے کہ ذولعین کے قبضہ میں خاتم سلیمانی رہے "اہرمن" اور "یزدان" اہل ایران کے مذہب میں دو متضاد ہستیاں ہیں، "اہرمن" سے مراد شیطان اور "یزدان" سے مراد خدا تعالےٰ خواجہ حافظ تیمور کو "اہرمن" کہتے ہیں جو تاریکی اور ہر ایک گناہ کا دیوتا ہے، یہ پیش گوئی بھی اپنے وقت پر پوری ہوئی۔

خواجہ حافظ اور ہمعصر وزرا

اس حد تک ہم نے ان سلاطین کا ذکر کیا ہے جو خواجہ کے ہمعصر تھے۔ اور ان میں سے اکثر کا تعلق ایران اور بالخصوص شیراز سے کم و بیش رہا ہے۔ اور ان میں سے خواجہ کے ممدوح بھی تھے۔ لیکن انہی سلاطین کے وزرا بھی خواجہ کے ممدوح تھے۔ اور ان سے مراسم دوستانہ بھی تھے، ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

وزراء شاہ شیخ ابو اسحاق۔ ۱۔ شمس الدین محمود ۷۴۳ھ میں وزیر تھا

۲۔ عماد الدین محمود

۳۔ حاجی قوام الدین حسن ۷۵۴ھ میں وزیر تھا

وزرائے مبارز الدین۔ ۱۔ تاج الدین عراقی ۷۵۴ھ میں وزیر تھا۔

۲۔ برہان الدین خواجہ کمال الدین محمد ابو المعالی

۳- بہاء الدین محمود بن عزیز الدین یوسف
خواجہ نظام الدین کا پوتا تھا۔

وزرائے شاہ شجاع۔

۱- قوام الدین محمد ۷۶۰ھ میں وزیر تھا۔
۲- کمال الدین رشیدی ۷۶۱ھ میں وزیر تھا
۳- خواجہ قطب الدین سلیمان شاہ بن خواجہ محمد
کمال ۷۶۵ھ میں وزیر تھا۔
۴- سید رکن الدین حسن نیروکی
۵- خواجہ جلال الدین توران شاہ

ان وزرا میں سے خواجہ حافظ کے ممدوح پانچ شخص ہیں۔

خواجہ عماد الدین محمود

مولف تذکرہ "ہفت اقلیم" لکھتا ہے کہ خواجہ عماد الدین مرد دانشمند تھا اور علم طب کامل دستگاہ تھی۔ خواص افیون پر اس نے ایک رسالہ بھی لکھا۔ خواجہ حافظ کی غزل میں اس کو سراہا گیا ہے جس کا مطلع ہے

کنون کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

اس غزل کا ایک شعر ہے

بخواہ جام صبوحی بیاد آصف عہد وزیر ملک سلیمان عماد دین محمود

ہم لکھ چکے ہیں کہ اہل ایران شیراز وغیرہ مقامات ایران کو ملک سلیمان کہتے ہیں۔ حضرت سلیمان کا وزیر آصف بن برخیاہ تھا۔ اس لیے ہر ایک وزیر کو آصف کہتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "آصف عہد" یعنی وزیر ملک سلیمان یا ایران عماد الدین محمود کی یاد میں صبح کی شراب پی یعنی دعائے خیر بوقت صبح کر۔

حاجی خواجہ قوام الدین حسن

خاندان صفویہ کے دور میں ملّا صدرا شیرازی مشہور فیلسوف گذرا ہے۔ کے اجداد سے خواجہ قوام الدین حسن ہے جو شاہ ابواسحاق کا وزیر تھا یہ حافظ کا ممدوح ہے اور سچ تو یہ ہے کہ خواجہ نے اس کے بذل وسخاوت اور علم وفضل کی جو کچھ تعریف کی ہے یہ اس کا مستحق بھی تھا۔ خواجہ نے تین غزلوں اور تین قطعات میں اس کا ذکر خیر کیا ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما | مطرب بگوکہ کار جہاں شد بکام ما

اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

دریائے اخضر فلک وکشتی ہلال | ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

یہ نیلے رنگ کا آسمان ایک بحر ہے اور بحر کا پانی نیلا ہوتا ہے اور اس میں ہلال کی کشتی سب میرے حاجی قوام کی نعمت میں غرق ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک رات خواجہ حافظ حاجی قوام کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھا رہے تھے۔ شوربہ میں آسمان اور چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ خواجہ نے شعر موزوں کیا کہ دونوں حاجی کی نعمت میں غرق ہیں۔

دوسری غزل کا مطلع ہے

عشق بازی وجوانی وشراب لعل فام | محفل انس وحریف ہمدم وشرب مدام

نکتہ دانے بذلہ گوچوں حافظ شیریں سخن | بخشش آموزی جہاں افروز چوں حاجی قوام

ہرکہ ایں صحبت نخواہد خوشدلی بروے تباہ | وآنکہ ایں مجلس نجوید زندگی بروے حرام

جوانی اور جوانی میں عشق بازی اور سرخ رنگ کی شراب، محفل میں سرشار اور دور شراب دائمی علاوہ ازیں ایک نکتہ داں اور

بذلہ گو حافظ شیریں سخن سا بھی ہونا چاہیے اور دنیا جہاں کو اپنی بخشش اور داد دہش سے مالا مال کرنے والا حاجی قوام بھی ہو۔ جس کو یہ صحبت بھی میسر نہیں اسکو کبھی خوشی نصیب نہیں ہو سکتی اور جو ایسی مجلس کا طالب نہیں اس کی زندگی حرام ہے۔

تیسری غزل کا مطلع ہے ؎

مرا شہر طیبت با جانان کہ تاجاں دربدن دارم ہواداراں کو لیش راچو جان خویشتن دارم

اگرچہ حافظ کا شہرہ رندی میں تمام جان پہچان والوں میں ہو چکا ہے مگر مجھے اس کی پروا نہیں کہ لوگ میری نسبت کیا کہتے ہیں جب تک دنیا میں قوام الدین حسن میرا غمخوار ہے مجھے کسی کا غم نہیں۔

دنیا میں اکثر لوگ اہل جاہ کے حاسد ہوتے ہیں، خواجہ قوام الدین کے بارہ میں بھی بعض حاسدوں نے شاہ ابو اسحاق کو بدظن کرنے کی کوشش کی۔ خواجہ فرماتے ہیں ؎

حسود خواجہ مارا بگو کہ بد مپسند وگرنہ دور زماں خیر بدت خبر اندمد

میرے خواجہ قوام الدین پر جو حسد کرتا ہے اسے یہ کہو کہ دیکھو برائی پسند نہ کر کیونکہ زمانہ میں برائی کا بدلہ برائی ہی ملتی ہے ؎

مکن بنیز کہ ہرگز بعقل و فکر فضول نگنہ نام تصرف بدست ماندمد

ای حاسد تو یہ چاہتا ہے کہ شاہ کو بدظن کر کے خود مسند وزارت سنبھال لے۔ اور اس لیے اس نامعقول جدوجہد میں لگا ہوا ہے کہ خواجہ شاہ کی نظروں سے گر جائے اور تجھے توقع ہے کہ تمام اختیار و حکومت تیرے ہاتھ میں آجائے گی یہ توقع بمقتضائے عقل و فکر فضول ہے۔ "فضول" کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں ایک بہ معنی "فضیلت" اور دوسرے زاید بے فائدہ

نعوذ باللہ اگر تیر از آسمان بارد   کہ بار در حرم کبریائی ما مد حد
بحق نعمت حاجی قوام ما کہ فلا   ز بحر مصلحت خود بدیں رضا مد حد

ایک قطعہ ہم شروع میں درج کر چکے ہیں خواجہ حسن پانچ اشخاص کو یاد فرماتے ہیں وہ فارس کی رونق کا باعث تھے ان میں سے ایک حاجی قوام الدین حسن ہے۔ ایک اور قطعہ جس میں تاریخ وفات حاجی مرحوم ہے حسب ذیل ہے۔

سرور اہل عالم، شمع بزم انجمن   صاحب صاحب قِراں حاجی قوام الدین حسن

وہ حضرات جنکی زندگی غنیمت زمانہ میں سے ہے اور جن سے بزم جہاں کی رونق ہے ان میں سے سربر آوردہ شمع علم و فضل و سخاوت صاحب قراں یعنی شاہ ابو اسحاق کا مصاحب حاجی قوام الدین حسن تھا۔

سادس ماہ ربیع الاول اندر نیم روز   روز آدینہ بحکم کردگار ذوالمنن
ہفت صد پنجاہ و چار از ہجرت خیر البشر   مہر را جوزا مکان و ماہ را خوشہ وطن

ماہ ربیع الاول کا دن، دوپہر کا وقت، جمعہ کا روز اور ہجرت رسول کریمؐ ۷۵۴ھ کا سال تھا۔

آفتاب برج جوزا میں اور ماہتاب سنبلہ میں تھا کہ بحکم خدائے قادر مطلق۔

مرغ روحش کاں ہمائی آشیاں قدس بود۔ شد سوی باغ بہشت از دام این ؟

اس ہما کا مرغ روح جو آشیانہ قدس میں بسیرا لیتا رہا اس رنج و غم کی دنیا کے جال سے اڑ کر باغ جنت کو سدھارا۔

جن ایام میں امیر مبارز الدین نے شیراز کو محاصرہ میں لیا ہوا تھا۔ شاہ ابو اسحاق محصور سخت پریشان تھا محاصرہ طول پکڑ رہا تھا۔ چھ ماہ

اس ہنگامہ میں گنڈرے شاہ نے ایک روز خواجہ قوام الدین سے پوچھا
کہ اس لڑائی کا انجام کیا ہوگا، خواجہ نے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں
تیری حکومت میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسی دوران میں
خواجہ کا انتقال ہو گیا۔ بعد مبارزالدین کا قبضہ شیراز پر ہو گیا۔

ابونصر خواجہ فتح اللہ برہان الدین ابوالمعالی

برہان امیر مبارزالدین کا وزیر تھا، یہ بھی
خواجہ حافظ کا ممدوح ہے۔
ایک غزل کا مطلع ہے۔

دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم   از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

برہان ملک بدیں کہ ز دست وزارتش   ایام کان یمین شد و دریا یسار ہم

برہان الدین وزیر کے داہنے ہاتھ کا جواہرات کی کانوں اور بائیں
ہاتھ کا دریا یسر تصرف ہو گیا۔ ؎

بر یاد رائے انور او آسمان بصبح   جان می کند فدا و کواکب نثار ہم

دوسری غزل کا مطلع ہے

یا مبسما یحاکی درجا من اللالی   یا رب چہ درخور آمد گردش خط ہلالی

اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

حالی است جام خاطر در دور آصف عہد   قم فاسقنی رحیقا اصفی من الزلال
الملک قد تباہی من جدہ و جدہ   یارب کہ جاوداں باد ایں قدرت و معالی
مسند فروز دولت، کان شکوہ و شوکت   برہان ملک و ملت بونصر بوالمعالی
چوں بشنود نقش دوراں در ہیچ حال ثابت   حافظ مکن شکایت تا مے خوریم حالی

برہان کا انتقال ۷۴۸ھ میں ہوا۔ خواجہ حافظ نے قطعہ تاریخ لکھا کہ

بروز شنبہ سادس ز ماہ ذی الحج بسال ہفتصد و ہشتاد و چہل تا گہ
ز شاہراہ سعادت بباغ رضواں رفت فرید کامل ابو نصر خواجہ فتح اللہ

قوام الدین محمد خواجہ قوام الدین محمد بن علی صاحب عیار وزیر شاہ شجاع ۷۵۲ھ میں مقرر ہوا۔ ۷۵۵ھ میں نائب السلطنت اور ۷۵۶ھ میں کرمان میں قائم مقام شاہ شجاع۔ ۷۶۴ھ میں شاہ شجاع نے اسے قتل کیا اور ایک ایک عضو ہر ایک شہر میں بغرض تشہیر بھیجا خواجہ حافظ نے اس کی شان میں ایک قصیدہ اور دو غزل اور دو قطعہ کہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے

ز دلبری نتواں لاف زد بآسانی ہزار نکتہ دریں کار ہست تا دانی

گریز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

مگیر چشم عنایت ز حال حافظ باز وگرنہ حال بگویم بہ آصف ثانی
وزیر شاہ نشاں خواجہ زمین و زماں کہ خرم است باد حال انسی و جانی
قوام دولت و دنیا محمد بن علی کہ میدرخشدش از چہرہ نور یزدانی

مدح کے بعد کہتے ہیں کہ ؎

شنیدہ ام کہ ز من یاد می کنی گہ گاہ ولے بہ مجلس خاص خودم نمی خوانی
طلب نمی کنی ز من سخن، جفا این ست وگرنہ با تو چہ بحث است در سخندانی
ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد لطائف حکمی با نکات قرآنی

میں نے سنا ہے کہ تو مجھے کبھی کبھی یاد کرتا ہے لیکن مجھے اپنی مجلس میں کیوں نہیں بلاتا۔
ظلم تو یہ ہے کہ تو مجھ سے میرا کلام طلب کیوں نہیں کرتا۔ میرا

مقصد یہ نہیں کہ سخندانی میں تجھ سے بحث چھیڑی جائے۔ دنیا جہاں میں حافظان قرآن اور بھی ہیں لیکن میرا دعویٰ ہے میری طرح کسی نے نکات قرآنی اور حکمت کی لطیف باتوں کو جمع نہیں کیا۔

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے

آنکہ رخسار ترا رنگ گل و نسریں داد صبر و آرام تواند بمن مسکین داد

جس نے تیرے رخسار کو گل و نسریں کی رنگین اور نزاکت دی ہے ہو سکتا ہے کہ مجھ مسکین کو صبر و آرام عطا فرمائے۔

گنج زرگر نبود کنج قناعت باقی است آنکہ آں داد بشاہاں بگدایاں ایں داد

اگر گنج زر میسر نہ ہو کنج قناعت تو باقی ہے جس نے بادشاہوں گنج زر دیا فقیروں کو کنج قناعت دیا۔ ؎

در کف غصہ دوراں دل حافظ خوں شد از فراق رخت ای خواجہ قوام الدین داد

غضبناک زمانہ کے ہاتھ میں حافظ دل کا خون ہوا۔ اے خواجہ قوام الدین تیرے دیدار سے مہجوری کے ہاتھ سے داد خواہ ہوں۔

تیسری غزل کا مطلع ہے

بحسن و خلق و وفا کس بیار ما نرسد ترا دریں سخن انکار کار ما نرسد

اس کا ایک شعر ہے ؎

ہزار نقد ببازار کائنات آرند یکے بسکہ صاحب عیار ما نرسد

صاحب عیار وزیر قوام الدین کا لقب ہے "عیار" کے معنی سونا بھی ہے۔ معیار کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر کھرا کھوٹا سونا پرکھا جاتا ہے مطلب شعر یہ ہے کہ بازار کائنات میں ہزاروں اشیا ہیں مگر صاحب عیار کا سکہ خالص سونے کا ہے جس میں کھوٹ نہیں اور دیگر اشیا

میں کم و بیش یہ نقص موجود ہے۔

وزیر کے قتل کا مادہ تاریخ اس قطعہ میں ہے ؎

اعظم قوام دولت و دیں آنکہ بر درش — از بہر خاکبوس نمودے فلک سجود
واں جلال واں چو وزیر خاک شد — در نصف ماہ ذوالقعدہ از عرصہ وجود
تاکس امید جود ندارد دگر ز کس — آمد حروف سال وفاتش امید جود۔

جود میں دال منقوطہ یعنی "ذ" ہے اس لیے سال وفات ۷۶۴ھ ہے فارسی میں "د" اور "ذ" ایک ہی ہے۔ چونکہ صاحب "عیار" کو نہایت بے رحمی اور ذلت کے ساتھ قتل کیا گیا خواجہ حافظ اس زمانہ کے "سیفٹی ایکٹ" کی زد سے بھی بچنا چاہتے تھے مگر ممدوح کا احترام بھی ملحوظ ہوگا اس لیے فرماتے ہیں کہ ؎

گدا اگر گہر پاک داشتے در اصل — بر آب نقطۂ شرمش مدار بایستے
ولا آفتاب نکردے فسول جام زرش — چرا تہی نمے خوشگوار بایستے
وگر سرائے جہاں را سر خرابی نیست — اساس او بہ ازیں استوار بایستے
نہاد گرہ سر قلب داشتے کارش — بدست آصف صاحب عیار بایستے
چو روزگار جز ایں یک عزیز نداشت — بعمر مہلتش از روزگار بایستے

بعض تذکرہ نویسوں کو قوام الدین حسن اور قوام الدین محمد کے نام کی مشابہت سے مغالطہ ہوا ہے کہ خواجہ حافظ لعل الذکر کی وفات کا افسوس کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ کچھ شک نہیں کہ خواجہ قوام الدین حسن بھی خواجہ حافظ کا ممدوح ہے مگر خواجہ قوام الدین محمد کا احترام بھی آپ کے دل میں محکم تھا۔ اس لیے کہ آخر الذکر نے مدرسہ شیراز میں آپ کو تدریس قرآن پر مامور کیا ہوا تھا۔ اور خود قوام الدین محمد اپنے زمانہ میں فاضل اجل

تھا۔ خواجہ حافظ خواجہ قوام الدین حسن کے دور وزارت میں پچیس سال جوان تھے اور قوام الدین محمد کے زمانہ میں اس لائق تھے کہ خدمت دینی پر مامور ہوتے

خواجہ جلال الدین توران شاہ

توران شاہ شاہ شجاع کا وزیر تھا اور شاہ شجاع کے بعد کچھ عرصہ اس کے بیٹے زین العابدین کے ابتدائی دور میں وزیر رہا۔ زین العابدین اس کی قدر و منزلت سے واقف نہ تھا اس لیے اسے برطرف کر کے اصفہان شاہ کو قلمدان وزارت دیا۔ خواجہ حافظ کو توران شاہ سے خاص دلی لگاؤ تھا۔ جب خواجہ حافظ یزد سے مایوس ہو کر شیراز واپس آنا چاہتا تھا انہی ایام میں خواجہ جلال الدین توران شاہ بھی شیراز کی طرف آرہا تھا خواجہ نے ایک قصیدہ پیش کیا اور اپنی پریشانی کے اظہار کے بعد ہمراہی کا تقاضہ کیا۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

ہزار ولیست پریشاں بدست غم پامال — چنانکہ ہیچ کسم نیست واقف احوال

خواجہ جلال الدین نے وعدہ کیا کہ جب شیراز کی طرف روانگی ہوگی ہمراہ لے جاؤں گا۔ خواجہ نے اسی امید پر غزل بھی کہی۔ مطلع ہے

گر ازیں منزل ویراں بسوئے خانہ روم — دگر آنجا کہ روم عاقل و فرزانہ روم

مقطع ہے

خرم آں روز کہ چو حافظ بنوائے وزیر — سرخوش از میکدہ با دوست بکاشانہ روم

ایک اور غزل میں اسی مضمون کو دہرایا ہے۔ مطلع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جان طلبم و ز پے جاناں بروم

مقطع ہے

در چو حافظ نرم رہ ز بیاباں بیروں — ہمرہ کوکبہ آصف دوراں بروم

توران شاہ خاندانی امیر تھا ایک دفعہ شاہ شجاع کو بعض حاسدوں نے بدظن کر دیا کہ وزیر آپ کے دشمنوں سے ساز باز کر رہا ہے اُس نے قید کر دیا مگر تحقیقات پر الزام بے بنیاد ثابت ہوا اس لیے پھر وزارت پر بحال کر دیا۔ خواجہ حافظ نے ایک قصیدہ تہنیت لکھا۔

مطلع ہے ؂

خیر مقدم مرحبا ای طائر فرخندہ دم شادماں کردی مرا نازم ترا سر تا قدم

چند اشعار حسب ذیل ہیں ؂

آں گذشت ای دل کہ خواری دیدی از دست رقیب

یار باز آمد بحمد اللہ عزیز و محترم

خواجہ توراں شاہ عادل دل جلال ملک و دیں

بدر آفاق علا عون الوری غوث الامم

قلب بدخواہاں شکست احوال پا بر جای تو

ہر کرا دل لشکند فیروز گردد لاجرم

ایک غزل کا مطلع ہے کہ ؂

سحر ز ہاتف میخانہ بدولت خواہی گفت باز آی کہ دیرینہ این درگاہی

ایک شعر ہے کہ ؂

زہ فقر تدانی نعرہ از دست مدہ مسند خواجگی و منصب توراں شاہی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توران شاہ شاہ شجاع کی بدسلوکی سے افسردہ خاطر ہو چکا تھا کہ ایک حاسد کے کہنے پر ذلیل کیا۔ اس لیے دینوی جاہ و حشمت سے دل سرد ہو گیا۔ لہٰذا دین کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ رہا۔ فقرا سے محبت اور ان کی صحبت کا طالب رہا۔ خواجہ حافظ نے

اپنے کلام میں اس کی طرف اکثر اشارہ کیا ہے، اور یہ بھی جتا دیا ہے کہ یہ مصیبت اس لیے نازل ہوئی تھی کہ تیری صحبت میں بعض بد طینت آدمی بھی تھے ایک غزل کا مطلع ہے کہ ؎

تو مگر بر لب جوئے بہ ہوس بنشینی　　ورنہ ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

عجب از لطف تو ای گل کہ نشینی با خار　　ظاہرا مصلحت وقت درآں می بینی

سخن بے غرض از بندہ مخلص بشنو　　ای کہ منظور بزرگان حقیقت بینی

نازنینے تو پاکیزہ رخ و پاک نہاد　　بہتر آن است کہ با مردم بد ننشینی

تو بدیں دلکشی و نازکی ای مایہ حسن　　لائق بزم گہ خواجہ جلال الدینی

خواجہ حافظ نے اس شعر میں کہ "تو در فلانی زدن از دست مدہ" بہم خواجگی و منصب توراں شاہی" اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا ہے کہ منصب وزارت سے مشکل تر فقر و فاقہ ہے، اور یہ کہ "عبادت بجز خدمت خلق نیست" اس وزارت میں بھی آپ بہت کچھ نیکی کر سکتے ہیں مگر توران شاہ پر اب شان فقر واضح ہو چکی تھی۔ اس لیے خواجہ حافظ کی ایک غزل میں جس کا مطلع ہے

"رو منہ خلد بریں خلوت درویشانست" ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

من غلام نظر آصف عہدم کو را　　صورت خواجگی و سیرت درویشانست

تاریخ وفات کا ایک قطعہ لکھا ؎

آصف دور زماں، جان جہاں توراں شاہ　　کہ دریں مزرعہ جز دانۂ خیرات نکشت

کاف ہفتہ بد از ماہ رجب کاف و الف　　کہ بہ گلشن شد و گلخن پر دود بہشت

چونکہ میلش سوئے حق بینی و حقگوئی بود　　سال تاریخ وفاتش بجواز "میل بہشت"

۷۸۷ھ

اس زمانہ کا وزیر، جہاں کی روح رواں، توران شاہ جس نے اس مزرعہ دنیا میں نیکی کا بیج ہی بویا تاکہ آخرت میں اس کی جزائے خیر ملے۔ ماہ رجب کی اکیس تاریخ تھی کہ باغ جنت کی طرف اس آتش کدہ دنیا کے دھوئیں کو چھوڑ کر سدھارا۔ چونکہ اس کی طبیعت ہمیشہ حق بینی اور حق گوئی کی طرف مائل رہی اس لیے اس کی وفات کی تاریخ بھی "میل بہشت" سے طلب کر

خواجہ حافظ نے سلاطین اور وزراء کی مدح میں قصائد کہے جو طویل نہیں اور ان کی تعداد جو موجود ہے چھ سات ہی ہے۔ لیکن عموماً غزل میں ایک دو شعر کسی کے حق میں مدحیہ کہتے رہے اور یہ بھی اپنے خاص انداز وطرز میں۔ قصیدہ گوئی کے مناسب آپ کی طبیعت نہ تھی لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جس کسی نے آپ سے اچھا سلوک کیا آپ نے اس کا احسان فراموش نہ کیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے حق میں کلمہ خیر ہی کہا۔ قصیدہ اور غزل کے ضمن میں آپ نے شیخ سعدی کی روش پر ناصحانہ مشورہ بھی دیا۔ لیکن لطیف پیرایہ اختیار کیا کہ اگر ممدوح میں کوئی عیب کی بات نظر آئی تو اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے ہی دل کو ملامت کی اور متنبہ کیا کہ یہ بات اچھی نہیں۔ مثلاً جب دیکھا کہ توران شاہ فقر اختیار کرنا چاہتا ہے تو اتنی بات تو برملا کہی کہ "تو در فقر ندانی زدن از دست مدہ مسند خواجگی و منصب توران شاہی"، مگر ساتھ ہی مقطع میں کہا کہ ؎

حافظ خام طمع شرمے ازیں قصہ بدار ۔۔۔ عملت چیست کہ فردوس بریں می خواہی

اس شعر میں ممدوح کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں لیکن روئے سخن ممدوح کی طرف ہے۔ دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ ؎

سخن بے غرض از بندہ مخلص بشنو　　　　ای کہ منظورِ نظرِ بندگانِ حقیقت بینی

تو کہ حقیقت و حق آگاہ بزرگوں کا منظورِ نظر ہے اس لیے توقع یہ ہے کہ یہ بات تجھے ناگوار خاطر نہ ہوگی۔ میں جو بات کہتا ہے بے غرض کہتا ہوں اور یہ بھی مسلم ہے کہ میں تیرا بندہ مخلص بھی ہوں جو کچھ کہوں گا خلوصِ دل سے کہوں گا۔ اتنی طویل تمہید کی اس لیے ضرورت تھی کہ اسی غزل کے مطلع میں یہ کہہ دیا کہ ؎

تو گر بر لبِ جوئی بہوس بنشینی　　　　ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

قمان شاہ کو قید و بند کی مصیبت اور ذلت جھیلنی پڑی تو دراصل قصور اس کا اپنا تھا۔ اگرچہ بظاہر ایک حاسد اس کا موجب ہوا۔ کہ اس کی مجلس میں بدکردار مصاحب بھی تھے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ ؎

بخدائی کہ توی بندہ بگزیدہ او　　　　کہ برین چاکر دیرینہ کسے نگزینی

قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تو اللہ تعالےٰ کا انتخاب شدہ بندہ ہے۔ اس لیے تیری صحبت کے لائق میرے جیسے پرانے مخلص وفادار نوکر ہی مناسب ہیں۔

غرض خواجہ حافظ کسی مستحق مدح کی مدح تو کرتے ہیں مگر محض خوشامد نہیں ہوتی کچھ پتہ کی بات بھی بتاتے ہیں۔ شیخ سعدی تو جو کچھ فرماتے ہیں بے لومۃ لائم برملا منہ پر کہتے ہیں مگر خواجہ نے لطیف پیرایہ میں نصیحت اختیار کی ہے۔ شیخ سعدی نصیحت بغرض فضیحت نہیں کرتے۔ اور نہ کسی کے عیوب بیان کرتے ہیں، آپ عدل و داد اور سخاوت اور تقویٰ کی تلقین کرتے ہیں اور بس، خواجہ حافظ کی نظر ممدوح کے عیوب پر ہے وہ عیب اپنی طرف منسوب کرکے اس کی

مذمت بیان کرتے ہیں۔

قصیدہ گوئی میں متقدمین عنصری و فرخی و انوری وغیرہ اور خواجہ کے معاصرین خواجہ اور سلیمان وغیرہ کو جو شہرت حاصل ہے اس لیے انہوں نے اپنا زور طبع اسی پر صرف کر دیا۔ بلاشبہ تشبیب میں وہ مناظر قدرت اور بعض حکمت کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں مگر زیادہ تر یہ خوشامدی شاعر تھے اور ان کا روز گار یہی تھا۔ علم ادب کی خدمت بلاشبہ انہوں نے نادانستگی۔ لیکن خواجہ حافظ ان باتوں سے کوسوں دور تھے۔ حکمت کے بیش قیمت جواہرات جو وہ پیش کرتے ہیں بالخصوص نکات تصوف و معرفت جس حسن و خوبی اور پیرایہ میں واضح کرتے ہیں بقول مولانا "جامی" وہ کسی اور نے بیان نہیں کیے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فطرت اپنے حسن و خوبی کا اظہار چاہتا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اس کا اظہار ہو رہا ہے یہ حسن صورت در اصل اسی فطرت کا حسن ہے جو صورتوں میں جلوہ نما ہو رہا ہے، اسی طرح شاعر اپنے افکار کو الفاظ کی موزوں بندش میں واضح کرتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حسن کا دیکھنے والا کوئی ہونا چاہیئے۔ حسن کا تقاضہ ہی یہی ہے۔ شاعر اپنے تخیلات اور افکار کو کسی صاحب نظر کے سامنے رکھ کر پھر اس کی توجہ کو جذب کو جذب کرنے کے لیے اس کی مدح بھی کرتا ہے۔ تاکہ وہ خوش ہو کر متوجہ ہو۔ مگر مدح گو شاعر میں یہ باتیں تحت الشعور ہوتی ہیں، بظاہر وہ دست سوال دراز کرتا ہے۔ ایک گدا دعائیں دیتا ہے، جا بھلا کر تیرا بھلا ہوگا۔ اور یہ خوشامد کرتا ہے۔ خواجہ حافظ اس تماشں

کے آدمی نہ تھے، کچھ شک نہیں کہ پیٹ کا دھندا اور اہل و عیال کا تعلق مجبور کرتا تھا کہ روزی کا سامان بھی ہونا چاہیئے اس لیے آپ نے مدحیہ قصائد اور غزلیں بھی لکھیں اور صلہ بھی ملتا رہا مگر یہ آپ کا پیشہ نہ تھا اور آپ نے اپنی وضع کو کبھی نہیں چھوڑا۔ قصیدہ گو شاعر تو مالدار بھی تھے مگر آپ کو ہمیشہ مفلسی کی شکایت رہی، کبھی اپنے دل کو تسلی دیتے کہ ؎

حافظ از مشرب قسمت گلہ بے انصافیست طبع چوں آب و غزلہائے روان مارا بس

ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ ؎

حافظ از سیم و زرت نیست برو شاکر باش چہ بر از دولت لطف سخن و طبع سلیم

حافظ از فقر مکن نالہ گر شعر این است ہیچ خوشدل نہ پسندد کہ تو محزوں باشی

وضعداری اور شان فقر کا یہ حال ہے کہ کہتے ہیں

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم باپادشہ بگوئے کہ روزی مقدر است

ہمعصر شعراء خواجہ حافظ کا کلام جتنا مقبول ہے یہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مرنجاں و مرنج فطرت تھی مگر آپ کی زندگی ہی میں حاسد بھی پیدا ہو گئے تھے اور آپ کا کلام قبولیت عام حاصل کر چکا تھا چنانچہ کہتے ہیں کہ ؎

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی شاعر ہی تھا جو آپ کی کلام کی قبولیت پر جل بھن کر کوئلہ ہو رہا تھا خواجہ حافظ نے بالکل سچی بات کہی ہے کہ

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است۔ ہمارے زمانہ میں بھی ایک شاعر نے خواجہ کے کلام پر تنقید کی۔ ایک دوست نے بطور فال دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا ۔ ؎

کسے گیرد خطا بر نظم حافظ کہ | ہیچش لطف در گوہر نباشد

اس حقیقت پر کل محققین کا اتفاق ہے کہ دونوں باتیں قبول خاطر اور لطف سخن خدا داد ہیں ۔

خواجہ کے کلام میں چند متقدمین اور ہمعصر شعرا کا نام آتا ہے۔ ان میں سے ایک حکیم سنائی غزنوی ہے حکیم سنائی کی مدح انوری اور خاقانی اور مولانا رومی بھی کرتے ہیں۔ عارف رومی تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ ؎

نیم جوشی کردہ ام من نیم خام | از حکیم غزنوی بشنو تمام

خواجہ حافظ کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

نماند از کس نشان آشنائی | پدید آورد رسوم بیوفائی

اس غزل کے دو شعر ہیں ؎

اگر شاعر بخواند شعر چوں آب | کہ دل را تو فزاید روشنائی

نہ بخشندش جوی از بخل و امساک | اگر خود فی المثل باشد سنائی

یعنی زمانہ اتنا بے وفا خود غرض ہے کہ کسی میں وہ مروت نہیں جو دوستوں میں واجب ہے اور لوگوں کے بخل کا یہ حال ہے کہ اگر شاعر خواہ وہ سنائی ہی کیوں نہ ہو کوئی شعر روانی کے ساتھ موزوں کرے کہ جس سے دیدہ کا نور زیادہ ہو تو اسے ایک جو بھی نہ دینگے چونکہ سنائی مشاہیر اسلام میں داخل ہے اور اس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کر رہے ہیں اس لیے اس مقام پر زیادہ لکھنے کی ضرورت

نہیں دوسرا نام شیخ سعدی کا ہے آپ کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے، تین شعرا کو "پیغمبر سخن" مانا گیا ہے۔ سے

کس بر سخن پیمبر اند   ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

سعدی

آنحضرت خاتم النبین کی ایک صحیح حدیث ہے کہ "لا نبی بعدی" یعنی "میرے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ قطعہ میں اسی حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ آنحضرت کے بعد کوئی پیمبر نہ ہوگا۔ لیکن پیمبران سخن تین ہیں، ابیات میں فردوسی اور قصیدہ میں انوری اور غزل میں سعدی، خواجہ حافظ بھی کہتے ہیں۔ سے

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما   دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

اس میں کچھ کلام نہیں غزل کا استاد سعدی ہی ہے اور ہم سب یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں مگر حافظ کا طرز کلام خواجو جیسا ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک اس کے سامنے کوئی "نمونہ" نہ ہو۔ اسی عملی نمونہ کی طرف اشارہ قرآن میں بھی ہے کہ "تمہارے لیے اسوہ حسنہ رسول اللہ کی زندگی میں ہے"۔ اسی طرح ہر ایک شاعر خواہ متقدمین کا کلام ازبر کرلے۔ مگر طبعاً اس کو کسی ایک استاد کے کلام کو نمونہ بنانا پڑتا ہے۔ خواجہ حافظ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ سعدی مسلم الثبوت استاد غزل ہے مگر آپ کو خواجو کا کلام پسند آیا اور اسی کو "نمونہ" بنایا۔

خواجو کرمانی

کرمان نے کمال الدین ابوالعطا محمود بن علی متخلص بہ خواجو سا باکمال شاعر پیدا نہیں کیا۔ اس کے کمال کی سند خوا

حافظ کا شعر متذکرہ بالا ہے۔ ۶۷۹ھ میں کرمان میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں
آل مظفر کا مداح رہا۔ پھر کرمان سے دوران سفر میں عارف وقت
علاء الدولہ سمنانی (۶۵۹-۷۳۶ھ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مدت تک
بغداد میں رہائش رکھی سلطان ابو سعید بہادر اور خواجہ غیاث الدین
محمد رشیدی کی شان میں مدحیہ قصائد کہے، آخر شیراز میں آیا اور
شاہ شیخ ابو اسحاق کے دربار میں خواجہ حافظ سے بھی شناسائی ہوئی
۷۵۳ھ میں فوت ہوا اور شیراز ہی میں مدفون ہوا۔ خود خواجو غزل
میں شیخ سعدی کا اتباع کرتا ہے اور شیخ کے کلام سے اتنی
سبقت اور مشق بہت پیدا کرلی کہ اس کو "دزد سعدی" کہتے تھے
مولانا نظامی کا خمسہ مشہور ہے۔ یہ پانچ مثنویاں ہیں۔ اکثر شعرا
نے طبع آزمائی کی اور خمسے لکھے چنانچہ مولانا جامی اور امیر خسرو دہلوی
کے خمسے مشہور ہیں۔ خواجو نے بھی خمسہ لکھا۔ اس کے علاوہ قصائد و
غزلیات و مقطعات بھی اس کی کلیات میں موجود ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ کمال فن یہی ہے کہ جو نمونہ سامنے ہو بعینہ
وہی بنا کر دکھا دے اس لیے اگر معاصرین خواجو کو "دزد سعدی" کہتے
ہیں تو یہ اس کی انتہائی تعریف ہے کہ اس کے کلام پر ایک پیغمبر
سخن کا اشتباہ ہوتا ہے، کچھ شک نہیں اور خواجہ حافظ خود معترف
ہے کہ آپ کا طرز کلام خواجو کا سا ہے مگر خواجہ حافظ خواجو سے
بہت آگے بڑھ گئے گو طرز قائم رہی، چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلماں است — کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

خواجو اور سلمان ساوجی کے سخن کا کیا مذکور ہے حافظ شیراز کا کلام

ظہیر کے شعر سے بھی بہتر ہے ۔

اس شعر میں خواجہ حافظ ظہیر کا مرتبہ خواجو اور سلمان سے بلند تر بتاتے ہیں اور اپنا مرتبہ ظہیر سے بھی اعلیٰ و ارفع بتاتے ہیں۔ ظہیر فاریابی اکابر شعرائے عجم میں شمار ہوتا ہے، مگر خواجہ حافظ کا دعویٰ سچا ہے کہ ظہیر بھی آپ کی بلندی تخیل اور افکار عالیہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ شیخ سعدی سے خواجہ حافظ کے کلام کا موازنہ بے ادبی ہے اور خود خواجہ حافظ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا کہ سلطنت غزل سعدی ہی کی ہے، مگر خواجہ حافظ نے سعدی کی زمین میں بھی غزلیں کہیں ہیں۔ مولانا نظامی گنجوی کے بارہ میں خواجہ حافظ کی یہ رائے ہے کہ ؎

ز نظم نظامی کہ چرخ کہن   ندارد چو او ہیچ زیبا سخن

مولانا نظامی کو "خدائے سخن" کہتے ہیں۔ آپ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے مگر حافظ دبی زبان سے اتنا کہہ گئے کہ ؎

چہ ملک در خوشاب ست شعر نظم تو حافظ   کہ گاہ لطف سبق می برد نظم نظامی

یعنی کبھی میرا شعر وہ لطف پیدا کرتا ہے کہ نظامی کے اشعار سے بھی لطیف تر ہوتا ہے، موازنہ و مقابلہ مقصود نہیں مگر تاہم یہاں مولانا نظامی اور خواجہ حافظ کی ایک ایک غزل درج کرتے ہیں۔

مولانا نظامی فرماتے ہیں ؎

دوش رفتم بخرابات مرا را نبود   کل میں خرابات کی طرف جا نکلا مگر

میزدم نالہ و فریاد کس از من نشنود   کسی نے اندر داخل نہ ہونے دیا میں نالہ و

فریاد کرتا رہا مگر کسی نے نہ سنی ۔

یا نبود ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار
یا ز من ہیچ کسم ہیچ کسم در نکشود

یا بادہ فروشوں میں سے کوئی جاگتا ہی نہ تھا یا میں کوئی شے نہ تھا کہ کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

پاسے از شب بگذشت بیشترک یا کمتر
رندی از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

ایک پہر رات گذر چکی تھی یا اس سے کچھ زیادہ یا کم ایک رند نے دریچہ سے سر نکالا اور اس کا چہرہ دکھائی دیا۔

گفت خیر است دریں وقت گرامی بخابی
بے محل آمدت بر در ما بہر چہ بود

بولا خیر تو ہے، اس وقت تو کسے بلا رہا ہے بے وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا کس غرض کے لیے ہے

گفتمت در بکشا. گفت برو ہرزہ مگو
کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود

میں نے کہا کہ دروازہ تو کھول جواب دیا جا جا بکواس مت کر ایسے وقت میں بھلا کسی نے کسی کے لیے دروازہ کھولا ہے۔

ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند
کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش آئی زود

یہ بھی تو نے مسجد سمجھ رکھی ہے کہ جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے جہاں خواہ تو دیر سے آئے فوراً جگہ مل جائے۔

آں خرابات مغاں است و درو رنداں اند
شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

ذرا دیکھ تو سہی یہ خرابات مغاں ہے اور یہاں رندوں کا مقام ہے شاہد اور شمع و شراب۔ شکر اور راگ رنگ ہے

ہر چہ در جملۂ آفاق در آنجا حاضر
مومن وارمنی و گبر و نصاریٰ و یہود

جو کچھ دنیا جہاں میں ہے یہاں موجود ہے، یہاں ہر ایک رنگ اور تماش کے آدمی ہیں مسلمان بھی ہیں جرمن بھی ہیں، گبر بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں یہودی بھی ہیں۔

گر تو خواہی کہ دل از صحبت ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

اگر تو چاہتا ہے کہ ان کی صحبت میں دل لگائے اور فیض حاصل کرے تو پہلے ان سب کے نقش قدم پر چل پھر تیرا مقصد حاصل ہوگا۔

کسی واقعہ یا منظر کا چند لفظوں میں نقشہ کھینچ دینا مولانا نظامی ہی کا حصہ ہے۔ مولانا شاعر بھی ہیں مصور بھی وہ خیالات اور خدمات جو کسی مصور کا قلم ظاہر نہیں کر سکتا مولانا کا کلک بے تکلف اس کے ہر ایک پہلو اور گوشہ کو نمایاں کرتا ہے۔ خواجہ حافظ بھی نادر الکلام ہیں اور آپ کی طبع کی روانی تکلفات سے معرا ہے۔ مولانا اور خواجہ دو دریا ہیں متانت اور غرور وقار سے بعید رہے ہیں۔ ایک کرتا ہوا اعتدال سے اس کی لہریں مسکراتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ دوسرا کبھی کبھی طغیانی پر آتا ہے، دونوں کا دامن موتیوں سے بھرا ہوا ہے جن کی آب و تاب بے مثل ہے۔ خواجہ نے رندانہ و قلندرانہ وضع اختیار کر رکھی ہے اور مولانا کی ثقاہت کی صورت اس سے بہت مختلف ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں

درسرائے مغاں رفتہ بود آب زدہ
نشستہ پیر و صلائے بہ شیخ و شاب زدہ

مے فروشی کی سرائے صاف ستھری
خاک و خس و خاشاک سے پاک تھی
پیر مغاں بیٹھا ہوا تھا اور بڑے
بوڑھوں اور جوانوں کو مے نوشی کی
دعوت دے رہا تھا۔

سبو کشاں ہمہ در بندگیش بستہ کمر
ولے ز طرف کلہ خیمہ بر سحاب زدہ

تمام شراب نوش اس کی خدمت
میں کمر باندھ کھڑے تھے لیکن
دماغ آسمان پر تھا۔

فروغ جام و قدح نور ماہ پوشیدہ
عذا   راہ آفتاب زدہ

جام و ساغر کی چمک دمک کے سامنے
چاند کی چاندنی ماند پڑ رہی تھی شراب
پلانے والے مغ بچے آفتاب کی
بات مار رہے تھے۔

گرفتہ ساغر عشرت فرشتۂ رحمت
ز جرعہ بر رخ حور و پری گلاب زدہ

رحمت کا فرشتہ ساغر ہاتھ میں
لیے حور و پری کے منہ پر گلاب
کی طرح چھڑک رہا تھا۔

ز شور و عربدہ شاہداں شیریں کار
شکر شکستہ سمن ریختہ، رباب زدہ

معشوقوں کی باہمی نوک جھونک اور
شور و غل نے شکر میٹھے توڑی -
سمن گرایا، رباب توڑا۔

سلام کردم و بامن بروئے خنداں گفت
کہ اے خمار کش مفلس شراب زدہ

میں نے سلام عرض کیا تو مجھ سے ہنستے
ہوئے کہا کہ اے خمار کے غم زدہ،
مفلس شراب کے مارے ہوئے

کہ کردانیکہ تو کردی بہ ضعف ہمت ورائے
ز گنج خانہ شدہ خیمہ بر خراب زدہ

جو کچھ تو نے کم ہمتی اور حماقت سے کیا ہے کیا کسی اور نے بھی ایسا کیا ہے کہ گھر میں خزانہ موجود تو نے اسے چھوڑ کر ویرانہ میں ڈیرہ جما دیا

وصال دولت بیدار ترسمت ندہند
کہ خفتہ تو در آغوش بخت خواب زدہ

مجھے ڈر ہے کہ دولت بیدار تیرے ہاتھ نہیں آئے گی اس لیے کہ تو بخت خفتہ کی گود میں سویا ہوا ہے

شیخ سعدی ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

بربود دلم در چمنے سرو روانے
زریں کمرے سیم برے موی میانے

ایک باغ میں بلند و بالا قامت والا سرو کی مثل میرا دل چھین کر لے گیا لیکن سرو تو چل پھر نہیں سکتا یہ سرو رواں ہے کمر میں طلائی پیٹی باندھے ہوئے تھا۔ اور پتلی کمر والا جیسے باریک بال ؎

خورشید وشے، ماہ رخے زہرہ جبینے
یاقوت لبے سنگ دلے تنگ دہانے

سورج کی چمک دمک والا چاند سا مکھڑا، ماتھا زہرہ ستارہ جیسی، یاقوت کی طرح سرخ لب، پتھر کا دل، تنگ دہن ؎

عیسیٰ نفسے خضر رہے یوسف عہدے
جم مرتبہ تاج ورے شاہ نشانے

عیسیٰ کی طرح اپنے دم سے مردوں کو زندہ کرنے والا، خضر کی طرح راہ سے واقف، اور اپنے وقت کا یوسف سا حسین جمشید کی طرح بلند مرتبہ والا، صاحب تاج، شاہی علم کا مالک ؎

شنگی شکر ینے چو شکر در دل خلق
شوخے نمکینے چو نمک شور جہانے

ایسا چالاک کہ میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کے دل کو موہ لیتا ہے۔ ایسا

شوخ کہ اس کا حسن ملیح نمک کی طرح جہان کو پر شور بنا رہا ہے ۔

جادو فگنے عشوہ گرے فتنہ پرستے — آسیب دلے رنج تنے آفت جانے

جادو کر رہا ہے، عشوہ گر ہے۔ فتنہ کو پرورش کرتا ہے، دل کے لیے آسیب، جسم کے لیے بیماری، جان کے لیے آفت ہے ۔

بیداد گرے کج کلہے عربدہ جوئے — لشکر شکنے تیر قدے سخت کمانے

بیداد گر، ترچھی ٹوپی سر پر، لڑائی پر آمادہ، لشکر شکن، تیر کی طرح قد سیدھا کمان کی طرح سخت ۔

در چشم امل معجزہ آب حیاتے — در باب سخن نادرہ سحر بیانے

امیدوار توقع کی آنکھ میں تو آب حیات کا معجزہ ہے یعنی زندگی میں تمام امیدیں اس سے وابستہ ہیں، کلام کے باب میں بے نظیر جادو بیان ہے

بے زلف و رخ و لعل و لب او رخ سعدی — آہے و سرشکے و غبارے و دخانے

سعدی کا حال اس زلف اور رخ اور یاقوتی لبوں کے بغیر یہ ہو گیا کہ آہ اور آنسو اور خاک اور دھواں بن کر رہ گیا ۔

خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ ۔

دامن کشاں ہمی شد در شرب زرکشیدہ — صد ماہرو ز رشکش جیب قصب دریدہ

مجھ سے دامن بچاتا ہوا چلا گیا جو زریں تاروں والا تھا۔ سینکڑوں چاند سے مکھڑے والوں نے اپنے کتان کی جیبیں پھاڑ دیں یعنی شرمندہ ہوئے ۔

از تاب آتش مے بر گرد عارضش خوے — چوں قطرہ ہائے شبنم بر برگ گل چکیدہ

شراب کی حرارت اور تیزی سے اس رخسار پر پسینہ ہے اس طرح جس طرح گلاب کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے ۔

یاقوت جانفزائش از آب لطف زادہ　　شمشاد خوش خرامش از ناز پروریدہ

اس کے سرخ یاقوت جیسے جان بخش لبوں کی پرورش آب لطف سے ہوئی ہے، اس کا سرو جیسا قد خوش رفتار ناز سے پلا بڑھا ہے

لفظ فصیح شیریں قد بلند چابک　　روئے لطیف نازک چشم خوش کشیدہ

کلام فصیح اور میٹھا، قد بلند اور چھریرہ، چہرہ لطیف نازک۔ آنکھ خوبصورت کھینچی ہوئی ہے۔

آں لعل دلکشش بیں واں خندہ پر آشوب　　واں رفتن خوشش بیں واں گام آرمیدہ

وہ سرخ لب دل کو کھینچنے والے دیکھ اور وہ اس کا ہنسنا جو لوگوں کو رلاتا ہے اور وہ اس کی خوب صورت چال اور وہ اٹھلا کر چلنا دیکھ۔

آں آہوئے سیہ چشم از دام ما بروں شد　　یاراں چہ چارہ سازم با ایں دل رمیدہ

وہ سیاہ آنکھوں والا آہو میرے پھندے سے نکل گیا۔ دوستو اب اس دل کا کیا علاج کروں جو بدک کر بھاگ رہا ہے۔

گر خاطر شریفت رنجیدہ شد ز حافظ　　باز آ کہ توبہ کردیم از گفتہ و شنیدہ

اگر تیری خاطر شریف حافظ سے رنجیدہ ہوئی تو لوٹ آ میں نے جو کچھ کیا مناسب سے توبہ کی۔

اگرچہ خواجہ حافظ ابتدا میں خواجو کی طرز پر شعر کہتے رہے مگر یہ انداز دراصل شیخ سعدی کا ہے جس کا اتباع خود خواجو کرتا رہا شیخ اور خواجہ کی ایک ایک غزل بالمقابل درج کی جاتی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

شیخ سعدیؒ	خواجہ حافظ رح
بپایاں آمد ایں دفتر حکایت ہمچناں باقی	سلیمیٰ منذ حلت بالعراق
بصد دفتر نشاید گفت حسب الحال مشتاقی	الاقی فی ہوا ما الاقی

کتاب بالغ منی حبیباً معرضاً عنی | الا ای ساربان محمل دوست

ان افعل ما تری انی علی عہدی ومیثاقی | الی رکبانکم طال اشتیاقی

نکویم نسبتے دارم بنزدیکاں ہدگا ہست | بلسانای مطرب خوشخواں و خوشگوے

کہ خود را بر تو می بندم بیا طوسی نفاقی | شعر پارسی صوت عراقی

اخلائی و احبائی وزو امن صیہ مائی | بیا ساقی بدہ اطل گرانم

مریض النفس لا اہوی ولا یلوی الراقی | سقاک اللہ من کاس دہاقی

نشان عاشق آں باشد کہ شب ہا روز پیوند | جوانی بازمی آرد بیا دم

ترا گر خواب می گیرد نہ صاحب درد عشاقی | صدائے چنگ و نوشانوش ساقی

قم املاء واسقنی کاسا ودع ما فیہ مسمعا | مے باقی بدہ تا برفشانم

اما انت الذی تسقی فیض السم تریاقی | بیاراں مست و خوشدل عمر باقی

قدح چوں دور ما باشد بہ ہشیاراں مجلس دہ | درو غم خوں شد از نادیدن دوست

مرا بگذار تا حیراں بماند چشم در ساقی | الا تعسا لایام انفرادی

سعی فی ہجر الثانی ولما بدہ ما شانی | دمے با نیک خواہاں متفق باش

انا المجنون لا اعیا و باحراق و اغراق | غنیمت داں امور اتفاقی

مگر شمش ملک باشد بدیں فرخندہ دیدار | مسیحائے مجرد را برازد

مگر نفس ملک باشد پاکیزہ اخلاقی | کہ با خورشید اند ہم وثاقی

تقیست الاسد فی الغابات لا تقوی علی میکا | عروسی بس خوشی اے دختر از

وعنا الطیبی فی شیراز نسیتی باصداق | ولے کہ گہ سر دار طلاقی

نہ صنعت آخرے دارد نہ سعدی را سخن پایاں | ربیع العمر فی مرعی حماکم

ہمیر و تشنہ مستقی درد یا بحناں باقی | حماک اللہ یا عہد التلاقی

بخواز رند رود انداز دلے نوش
بگبانگ جوانان عراقی
نہانی الشیب من کل الغدارى
سوی تقبیل خدو اعتنائی
وصال دوستاں چوں ماست
مگیر واعظ سخن ہائے فراقی
مفت فرض الوصال ماشعر نا
بگو حافظ غزلہائے فراقی

ذیل میں ہم ایک ایک غزل ظہیر فاریابی اور خواجہ کی درج کرتے ہیں مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ خواجہ کا رتبہ ظہیر سے بہت بلند ہے اور اگر خواجہ کی رائے صحیح ہے کہ ظہیر کا مرتبہ خواجو اور سلمان سے اونچا ہے تو قیاس ہو سکتا ہے کہ خواجہ کا درجہ سب سے ارفع ہے۔

ظہیر فاریابی	خواجہ حافظ
چو غنچہ مردہ دل تا بکے نظارہ کنم	بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
نسیم وصل تو کو تا کر جاہ پارہ کنم	بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم
بیاد عشوۂ آں چشم و پیچش زلفش	سخن درست بگویم نمی توانم دید
سخن ہمیشہ ز ابہام و استعارہ کنم	کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم
بوصل او چو طپیدن شود فراموشم	بدور لالہ دماغ مرا علاج کنید
نظر بروئے دیدہ ستارہ کنم	گر از میانہ بزم طرب کنارہ کنم
چو ترک خواب کنم شب تیغ بیداری	اگر شے بر نظم حدیث تو بر دو
تمنئے ست کزاں زندگی دوبارہ کنم	زبیلے طبانی آں دلبے غرارہ کنم

مرا کہ نیست رہ و رسم لقمہ پرہیزی
ہماں بہ است کہ میخانہ را اجارہ کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم
اگر ز لعل لب یار بوسہ می طلبم
جواں شوم ز سر و زندگی دوبارہ کنم
نہ فقیہم نہ مدرس نہ محتسب نہ فقیہ
مرا چہ سود کہ منع شرابخوارہ کنم
زبادہ خوردن پنہاں ملول شد حافظ
ببانگ بربط و نے رازش آشکارہ کنم

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ نے ظہیر کے بارہ میں اپنی رائے بدل لی تھی۔ اگرچہ صاف لفظوں میں اس کا نام نہیں لیا مگر ایک شعر میں اشارہ اسی کی طرف ہے یا کسی اور کی طرف جس کی استادی کے لوگ قائل تھے۔ ہے

آں را کہ خوانی استاد گر بنگری بہ تحقیق — صنعت گریست اما طبع رواں ندارد

ظہیر کے کلام میں تصنع زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ شاعری ایک فن ہے صنعت کم و بیش واجب ہے مگر تصنع اتنا نہ ہونا چاہیے کہ فطری سادگی پر غالب آجائے۔ فطری حسن و خوبی کو زیور اور نمایاں کرتا ہے مگر غرض فطری حسن کی نمائش ہے نہ کہ زیور کی۔

خواجو کرمانی اور خواجہ حافظ کے اکثر اشعار میں بظاہر "توارد" پایا

جاتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہمعصر شعرا تھے
خواجہ حافظ نے خواجو کے اکثر اشعار پر تضمین کی لو بہتر خیال پیدا کیا
چند اشعار بطور نمونہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ	خواجو کرمانی
دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما	خرقہ رہن خانۂ خمار دارد پیر ما
چیست یاراں طریقت بعد ازیں تدبیر ما	ای ہمہ یاراں مرید پیر ساغر گیر ما
در خرابات مغاں ما نیز ہمدستاں شویم	گر شدم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست
کایں چنیں رفتہ است از روز ازل تقدیر ما	ہم چنیں رفتہ است از روز ازل تقدیر ما
عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است	ما دل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم
عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما	ای بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما
تیر آہ ما ز گردوں بگذرد حافظ خموش	از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما	کز کمان نرم زخمش سخت باشد تیر ما

خواجہ حافظ	خواجو کرمانی
خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم	خرم آں روز کہ از خطۂ کرماں بردم
راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم	دل و جاں دادہ ز دست از پے جاناں بردم
چوں صبا با دل بیمار و تن بے طاقت	تا نگویند کہ چوں سوسن اند آزادم
بہواداری آں سرو خراماں بروم	ہمچو باد از پے آں سرو خراماں بردم
دلم از وحشت زنداں سکندر بگرفت	گرچہ از ظلمت ہجراں بزم جاں بکنار
رخت بر بندم و تا ملک سلیماں بروم	چوں سکندر ز پے چشمۂ حیواں بدوم
	ہمچو خواجو گرم از گنج نصیبے ندہند
	رخت بر بندم ازیں منزل ویراں بردم

صبا خبری کن مرا زان که تو دانی
ان زمیں گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی
مرغ در طیراں آئی و چوں باوج رسیدی
ز دل ساز داراں آشیاں چناں کہ تو دانی
بجاں مرد کہ غبارے بدو رسد ز گذارت
بداں طرف چو رسیدی جہاں براں کہ تو دانی

نسیم صبح سعادت براں نشاں کہ تو دانی
گذر بکوے فلاں کن بداں زماں کہ تو دانی
تو پیک خلوت رازی و دیدہ بر سر راہت
بمردمی نہ بفرماں، چناں براں کہ تو دانی
بگو کہ جان عزیزم ز دست رفت خدا را
ز لعل روح فزایش ببخش آں کہ تو دانی
من ایں حروف نوشتم چنانکہ غیر ندانست
تو ہم ز روی کرامت چناں بخواں کہ تو دانی

—— • ——

ل دریں پیر زن عشوہ گر دہر مبند
یں عروسیست کہ در عقد بسے داماد است
مجو درستی عہد از جہاں سست بنیاد
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

—— • ——

منزل از یار قریں است چہ دوزخ چہ بہشت
بہمہ گرچہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت
ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

—— • ——

طلع الصبح من هدا و حجابہ
عجلوا بالرحیل یا اصحاب
می دمد صبح و کلہ بست سحاب
الصبوح الصبوح یا اصحاب

—— • ——

مائیم عشق و کنج خرابات و روئے یار
ساقی ز جام لعل لبت بادہ بیار
عید است و موسم گل و یاراں در انتظار
ساقی بروئے یار ببیں ماہ و می بیار

—— • ——

چوں کوتہ است دستم ازاں گیسوی دراز
زیں پس من وخیالش وشبہای دیر باز

ای سرو ناز حسن کہ خوش می روی بناز
عشاق را بنیاز تو ہر لحظہ صد نیاز

ہرگز از چرخ بداختر نشدم روزے شاد
مادر دہر مرا خود بچہ طالع زاد است

کوکب بخت مرا ہیچ منجم نشناخت
یارب از مادر گیتی بچہ طالع زادم

بادہ می نوشم واز آتش دل می جوشم
مگر آں آب بچہ آتش بنشاند جوشم

گرچہ از آتش دل چوں خم می در جوشم
مہر بر لب زدہ خون میخورم وخاموشم

ان اشعار کے موازنہ سے اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون دونوں ہمعصر شعرا کے اشعار میں ہے لیکن خواجہ حافظ کی بندش بہت سہل ہے اور تخیل میں زیادہ بلندی ہے اور لطیف تر ہے۔

سلمان ساوجی

خواجہ جمال الدین سلمان بن خواجہ علاؤ الدین محمد کی پیدائش "ساوہ" میں واقع ہوئی۔ خاندان آسودہ حال تھا سلمان کے ایام جوانی خواجہ غیاث الدین محمد وزیر کی مدح میں گذرے جب دور جوانی اور ممدوح کا زمانہ وزارت سلطنت ایل خانی اور مرگ ابوسعید کے ساتھ ختم ہوا تو امرا جلایر پیر شیخ حسن بزرگ اور اس کی زوجہ دلشاد خاتون کی مدح میں عمر بسر کی اور بغداد ہی میں اقامت اختیار کی۔

۷۳۹ھ سے آخر عمر تک اس نے قصاید شیخ حسن بزرگ اور ان کے بیٹے سلطان اویس اور سلطان حسین کی مدح میں لکھے۔ اور اویس کے عہد میں اکثر ایام تبریز میں گذرے جب شاہ شجاع کا تسلط ۷۷۶ھ میں تبریز پر ہوا تو سلمان وہیں تھا۔ اور شاہ شجاع کی شان میں مدحیہ قصیدہ

سلمان نے قصائد میں بعض تواریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔
ایک سال بعد ۱۲ ماہ صفر سال ۷۷۸ھ میں "سادہ" میں وفات ہوئی۔
خواجہ حافظ سلمان کے علم و فضل اور بزرگی کے معترف ہیں۔ چنانچہ اس کی تعریف میں لکھتے ہیں:

سرآمد فضلائی زمانہ دانی کیست ز روئ صدق و یقین نے ز راہ کذب و گمان
شہنشہ فضلا بادشاہ ملک سخن جمال ملت و دیں خواجہ جہاں سلمان

سلمان نے غزلیات و قصائد و مقطعات و مثنویات میں داد سخن دی ہے۔ اس کی بعض غزلیں اور خواجہ حافظ کی بلفظ ایک ہی ہیں۔ معلوم نہیں کہ خواجہ حافظ کے دیوان میں کب اور کس نے داخل کیں۔
سلمان اور خواجہ حافظ کی زبان ایک دوسرے سے قریب تر ہے یہاں تک الفاظ کی ترکیب اور اصطلاحات دونوں ہی ملتی جلتی ہیں اور سلمان کے اشعار اور خواجہ حافظ کے اکثر اشعار میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذیل میں دونوں کے اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

خواجہ حافظ	سلمان
بسا کہ گفتہ ام از شوق با دو دیدہ خویش	زمان زمان بدل و جان خویش می گفتم
ایا منازل سلمیٰ و این سلما کی	ایا منازل سلمیٰ و این سلما کی

—— • ——

خواجہ حافظ	سلمان
آن شب قدرے کہ گویند اہل معنی امشب است	عاشقان را از جمالت روز بازار است امشب
یارب این تاثیر دولت از کدامی کوکب است	لیلۃ القدرے کہ می گویند پندار است امشب

—— • ——

خواہی کہ روشنت شود احوال درد من   خواہی کہ روشنت شود احوال سر عشق
درگیر شمع را دز سر تا بپا مپرس   از شمع پرس قصہ ز باد صبا مپرس

———— • ————

از ازل عکس می لعل تو در جام افتاد   عکس روئے تو چو در آئینہ جام افتاد
عاشق سوختہ دل در طمع خام افتاد   عارف از پرتو مے در طمع خام افتاد
جام نام ز لعل لب تو نقطے کرد   غیرت عشق زبان ہمہ خاصاں ببرید
راز سر بستہ غم در دہن عام افتاد   کز کجا سر غمش در دہن عام افتاد
خال مشکیں تو بر عارض گندم گوں دید   در خم زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ
آدم آمد ز پئے دانہ در دام افتاد   آہ کز چاہ بروں آمد و در دام افتاد

چار غزلیں خواجہ حافظ اور سلمان کے دیوان میں بلفظہ موجود ہیں۔ اُن غزلوں کا مطلع یہ ہے۔

۱۔ زلفین سیہ غم نجم اند زدہ باز   وقت من شوریدہ بہم زدہ باز
۲۔ نیر نم ہر نفس از دست فراقت فریاد   آہ اگر نالہ زارم نرساند بتو یاد
۳۔ برو بکار کار خود ای واعظ این چہ فریاد است   مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتاد است
۴۔ نیارغ وصل تو یابد ریاض رضواں آب   ز تاب ہجر تو دارد شرار دوزخ تاب

عماد فقیہ کرمانی

خواجہ حافظ کے معاصر شعرا میں ایک خواجہ عماد الدین کرمانی بھی ہیں۔ بوجہ زہد و علم فقہ امیر مبارز الدین اور شاہ شجاع کے عہد میں مشہور تھے ایک روایت یا حکایت ہے کہ خواجہ عماد نے ایک بلی پال رکھی تھی اور اس کو نماز میں قیام و رکوع و سجدہ سکھایا ہوا تھا، جب خواجہ عماد نماز پڑھتے تو وہ بھی متابعت کرتے شاہ شجاع اس کو خواجہ عماد کی بڑی کرامت تصور کرتا اس لیے اس سے

خاص عقیدت تھی۔ اور بنایت احترام سے پیش آتا۔ خواجہ عماد نے کرمان میں ایک زاویہ تعمیر کیا ہوا تھا وہاں اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھ اُن کو اپنے اشعار سنایا کرتے۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یار دوستوں نے یہ قصہ گھڑا ہے۔ اور خواجہ کے اکثر اشعار کی شان نزول ایک حکایت روایت کرتے ہیں۔ خواجہ کی ایک غزل کا مطلع ہے :-

صوفی نہاد دام و در حقہ باز کرد بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اگرچہ صوفی نے جال بچھا رکھا ہے اور مکر و فریب کا دروازہ کھول رکھا ہے یہاں تک آسمان سے بھی گولیاں کھیل رہا ہے :-

بازی چرخ بشکندش بیضہ در کلاہ زیرہ کہ عرض شعبدہ با اہل راز کرد

آسمان تو خود ایک مداری ہے بھلا ایسے واقف راز مکر و فریب سے بازی کیسے لے جا سکتا ہے، آسمان اس کی ٹوپی میں انڈا توڑ کر رکھ دیگا اور ان کو شکست دے گا :-

ساقی بیا کہ شاہد رعنائی صوفیاں آمد و گر بجلوہ و آغاز ناز کرد

اے ساقی آ کہ صوفیوں کا رنگیلا چھبیلا معشوق جلوہ گر ہو رہا ہے اور ناز و کرشمہ شروع کر رہا ہے :-

ای دل بیا کہ ما بہ پناہ خدا رویم زاں کو آستیں کوتہ و دست دراز کرد

اے دل ان کوتہ آستین صوفیوں کی دست درازی سے خدا کی پناہ ڈھونڈیں

ای کبک خوش خرام کہ خوش میری بناز غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد

اے چکور تو اطمینان اور خوشی خوشی ناز سے چلتا ہے، اس بات پر نہ جا کہ عابد بلی نماز پڑھتی ہے :-

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد

کل جب حقیقت منکشف ہو جائے گی تو وہ سخت نادم ہوگا جس کی نظر مجاز یعنی دنیا اور اس کی زینت پر تھی ؎

حافظ مکن ملامت رنداں کہ در ازل
ما را خدا ز زہد و ریا بے نیاز کرد

اے حافظ تو رندوں کو ملامت ذکر کہ ہمیں خدا نے روز ازل سے زہد اور ریا سے بے نیاز کر رکھا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ اس تمام غزل میں روئے سخن ریاکار صوفیوں کی طرف ہے اور عماد فقیہ اور صوفی بھی اسی زمرہ میں تھا۔

خواجہ عماد صوفی بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ اور خواجہ حافظ سے میدان شاعری میں گوئے سبقت لے جانا چاہتے تھے اس لیے ان میں نوک جھونک بھی رہتی، تذکرہ نویس یہ بھی کہتے ہیں کہ خواجہ عماد خواجہ حافظ کے مضامین سرقہ کیا کرتے اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ خواجہ کے شاعرانہ تخیل اور حکیمانہ تفکر کی بلندی کو تو نہیں پہنچ سکتے تھے مگر شعر اچھے کہتے ہیں اس نے خواجہ حافظ کی زمین میں اکثر غزلیں لکھی ہیں۔ اور خود خواجہ حافظ نے خواجو اور سلمان اور ظہیر و سعدی کی زمین میں زور طبع دکھایا ہے یہ کوئی عیب کی بات نہیں ذیل میں ہم چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ	عماد فقیہ
تا سر زلف تو در دست نسیم افتاد است	دلم از تیغ فراقت بدو نیم افتاد است
دل سودا زدہ از غصہ دو نیم افتاد است	در میان غمت از عرصہ چو سیم افتاد است
بناں بلبل دگر با لست سر یار لیست	امید بلبل بیدل ز گل وفا دار لیست
کہ ما در عاشق نادیم وکار ما زار لیست	ولے وفا نکند شاہدے کہ بازار لیست

تو حاکمی و مرا سر بر آستانۂ تست | مدرق منتظر چشم من آشیانۂ تست
کمن خرابی ملک ملم کہ خانہ خانۂ تست | کرم نماد فرود آکہ خانہ خانۂ تست

تبانہ خوزم بادہ صافی کہ حرام است | گل دربر ومی درکف ومعشوقہ بکام است
واں علیش کہ دوست جلال است کلام است | سلطان جہانم بچنیں روز غلام است

اسی قبل کے اشعار اور بھی ہیں مگر فہم و تفہیم کے لیے یہی کافی ہیں۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ عموماً بلند پایہ شعرا کے کلام میں توارد پایا جاتا ہے، اشعار میں مضمون بھی ملتا جلتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ کس نے بہتر باندھا ہے۔ شاہ شجاع کو اگر عماد کا احترام ملحوظ تھا تو اس کے چند وجوہ اور بھی ہیں اور عماد فقیہ بھی تھا اور والدہ کی طرف سے شاہ شجاع کا تعلق لبقراختائیاں کرمان سے تھا۔ عماد صوفی صاحب خانقاہ تھا اور اس کے بے شمار مرید تھے خاندان مظفر میں کرمان متنازع فیہ تھا۔ شاہ شجاع کی سیاسی غرض تھی کہ ان لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے۔ عماد ۷۷۳ھ میں فوت ہوا۔

کمال خجندی شیخ کمال الدین مسعود بھی خواجہ حافظ کا ہمعصر ہے شیخ خجند میں پیدا ہوا۔ اور عرفا اور شعرائے عصر میں مشہور تھا۔ خجند سے نقل مکانی کرکے تبریز میں رہائش اختیار کی، سلطان حسین جلائری کا درباری تھا اور سلطان نے اس کی آسائش کے اسباب بھی فراہم کر دیے تھے، اور ایک صومعہ بھی تعمیر کر دیا تھا۔ تذکرہ مرات الخیال میں مذکور ہے کہ دونوں ہمعصر شعرا کی ملاقات تو نہ ہوئی مگر کمال نے ایک

غزل خواجہ کے پاس بھیجی تھی، خواجہ نے اس زمین میں غزل تو نہ لکھی مگر ردیف "چشم" پر خواجہ کی بھی ایک غزل ہے۔ ہم دونوں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

کمال خجندی

یار گفت از غیر ما پوشاں نظر گفتم بچشم
وانگہ دزدیدہ در ما می نگر گفتم بچشم

گفت اگر یابی نشان پائے ما بر خاک راہ
بر فشاں آنجا بدامن ہا گہر گفتم بچشم

گفت اگر گردی شبے از دوئی روی ما جدا
تا سحر گاہاں ستارہ می شمر گفتم بچشم

گفت اگر گردیست خشک از دم سرد آہ
باز عیسا رش چو شمع از دیدہ تر گفتم بچشم

گفت اگر سر در بیابان غمم خواہی نہاد
تشنگاں را مژدہ از ما ببر گفتم بچشم

گفت اگر بر آستانم آب خواہی زد ز اشک
ہم بمژگاں خاک روب آنجا گذر گفتم بچشم

گفت اگر خامی خیال خود وصل ما کمال
قطع ایں دریا بہ پیما سر بسر گفتم بچشم

خواجہ حافظ

خیال روئے تو گر بگذرد بہ گلشن چشم
دل از پئے نظر آید بسوئے روزن چشم

بیا کہ لعل و گہر در نثار مقدم تو
ز گنج خانہ دل می کشم بہ مخزن چشم

سزائے تکیہ گہت منظرے نمی بینم
منم ز عالم و ایں گوشہ معین چشم

سحر سرشک روانم سر خرابی داشت
گرم نہ خون جگر می گرفت دامن چشم

نخست روز کہ دیدم رخ تو دل می گفت
اگر رسد خللے خون من بہ گردن چشم

ببوئے مژدہ وصل تو تا سحر ہمہ شب
براہ باد نہادم چراغ روشن چشم

بمردمی کہ دل دردمند حافظ را
مزن بناوک دل دوز مردم افگن چشم

جب یہ غزل خواجہ حافظ کی نظر سے گذری تو فرمایا کہ "مشرب ایں بزرگوار عالی است"۔

ذیل میں ہم خواجہ و کمال کی ایک غزل جو دونوں نے ایک ہی

لی بغرض موازنہ پیش کرتے ہیں۔

کمال	خواجہ
آنچہ تو داری بحسن ماہ ندارد	روشنی طلعت تو ماہ ندارد
جاہ و جلال تو پادشاہ ندارد	پیش تو گل رونق گیاہ ندارد
جانب دلہا نگہدار کہ سلطان	شوخی نرگس نگر کہ پیش تو بشگفت
ملک نگیرد اگر سپاہ ندارد	چشم دریدہ ادب نگاہ ندارد
عاشق اگر مے کشی بجرم محبت	دیدہ ام چشم دل سیہ کہ تو داری
بیشتر از من کس این گناہ ندارد	جانب ہیچ آشنا نگاہ ندارد
رقت قلب آشکار کرد محبت	لے من تنہا کشم تطاول زلفت
جان تنگ راز دل نگاہ ندارد	کیست بدل داغ این سیاہ ندارد
صوفی ما ذوق رقص دارد و حالت	رطل گرانم دہ ای مرید خرابات
آہ کہ سوز درون و آہ ندارد	شادی شیخے کہ خانقاہ ندارد
زحمت مہر چون برد کمال بدین در	حافظ اگر سجدہ تو کرد مکن عیب
زانکہ جز این آستان پناہ ندارد	کافر عشق ای صنم گناہ ندارد

کمال کا یہ شعر کہ " جانب دلہا نگاہدار کہ سلطان ، ملک نگیرد اگر سپاہ ندارد " خواجہ حافظ کے دیوان میں بھی ہے مگر شعر کمال کا ہی ہے، غلطی سے خواجہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ کمال اپنے معاصرین کے حق میں کہتا ہے کہ

مرا ہست اکثر غزل ہفت بیت
چو گفتار سلمان نرفتہ زیاد

میری اکثر غزل کے ابیات سات ہیں۔ جو بسہولت حافظہ میں محفوظ

ہو سکتے ہیں، سلمان کی طرح میں طویل غزلیں یا قصائد نہیں کہتا کہ یاد نہ ہو سکیں ۔ ؎

پو حافظ ہمی خواندش در عراق ٭ بہ بندد رواں ہچو سبع شداد

جب حافظ اسے عراق میں پڑھے گا تو سبع شداد یعنی سات سخت آسمانوں کی بندش کی طرح اس کی روح کو اس سے بلند پرواز کرنے کا راستہ بند ملے گا۔ یعنی میرے فکر کی بلندی کو حافظ کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ؎

بہ بنیاد بر ہفت چوں آسماں ٭ کزیں جنس بیتے ندارد عماد

میرے ہر ایک شعر کی بنیاد سات آسماں کی طرح مضبوط ہے اور اس جنس کا شعر عماد فقیہ کے ہاں نہیں ملے گا۔

کمال کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ غالباً ۷۹۳ھ میں فوت ہوا۔

مولانا شیخ ابو اسحق شیرازی

خواجہ حافظ کا ہمعصر اور دوست مولانا شیخ احمد ابو اسحاق بلقب بہ فخر الدین "اطعمہ" کے نام سے مشہور ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اشعار میں طعام ہی کا ذکر خیر کرتے ہیں اور اکابر شعرا سعدی، حافظ وغیرہ کے اشعار پر تضمین اسی مزاحیہ رنگ میں کیا کرتے۔ خوش طبع تو ضرور تھے مگر عارف عہد شاہ نعمت اللہ ولی کے مرید بھی تھے، خواجہ کو بھی عقیدت تھی۔ مولانا نے اپنی طبیعت کے موافق کتاب "کنز الاشتہا" لکھی، دیباچہ میں کہتے ہیں کہ ؎

خوانے کشیدہ ز سخن تا بقاف ٭ ہم کاسہ کجاست کہ آمد برابرم

اپنے کلام کا ایک وسیع دسترخوان بچھایا، ہم پیالہ کہاں ہے کہ میرے

برابر بیٹھے، یعنی کوئی برابری نہیں کر سکتا۔
شاہ نعمت اللہ کے اشعار ہیں۔

گوہر بحر بیکراں مائیم | گاہ موجیم و گاہ دریائیم
ما بداں آمدیم در عالم | کہ خدا را بخلق بنمائیم

اس پر مولانا نے کہا

رشتۂ لاک معرفت مائیم | گہ خمیریم گاہ بغرائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ | کہ بماہیچہ قلیہ بنمائیم

"لاک" مخفف "ہے" لاحرفناک "کا دین نے تجھے نہیں پہچانا
اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ "لاک" کا رشتہ معرفت خود میرے
ایسے بندے ہیں۔ ذات الٰہی کی معرفت تو ممکن نہیں مگر اس کی نعمت،
کا عرفان ہمیں حاصل ہے، اس دنیا میں ہم اس لیے آئے ہیں کہ
چھلی چھوٹی مچھلیوں کے کباب بنا کر کھائیں شاہ نعمت اللہ نے اپنے
آپ کو دریا اور موج اور گوہر سے تشبیہ دی شیخ نے خمیر اور پلاؤ
اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے "بغرا" چاول اور گوشت کی آمیزش سے
شاہ خوارزم خان نے ایجاد کیا تھا۔ "لاک" عربی میں خوراک چبانا اور
فارسی میں کلنگ کو کہتے ہیں۔

شاہ صاحب نے بھی یہ "پیروڈی" ( ) سنی، شیراز میں وارد
ہوئے تو ایک مجلس میں ابو اسحاق بھی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا
کہ کیا رشتہ لاک معرفت آپ ہیں، جواب دیا کہ اللہ کی نسبت تو میں کچھ
کہہ نہیں سکتا البتہ نعمت اللہ کے بارہ میں بھی کچھ کہا کرتا ہوں، شاہ صاحب
پھڑک اٹھے اور شیخ بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔

شیخ سعدی کی غزل کا مطلع ہے

مشتاق دوست کہ غیر از تو مرا یارے ہست ، یا شب روز بجز فکر توام کارے ہست

شیخ ابو اسحاق نے تضمین کی ،

مشتاق جاں کہ بجز دو نیم مرا یارے ہست ۔ یا بجز مالش چنگال مرا کارے ہست

خواستم پردہ ناں از سر تماج کشم ۔ تا ہماں خلق بدانند کہ زنانی ہست

چہ عجب کنگر اگر ہمنفس بریاں شد ۔ ہمہ دانند کہ در صحبت گل خارے ہست

خواجہ حافظ کے اکثر اشعار پر شیخ نے تضمین کی ہے

خواجہ ۔ شیخ

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند ۔ گیپا بزاں سحر کہ سر کلہ وا کنند

آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند ۔ آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

چوں از درون خربزہ آگہ نشد کسے
ہر کس حکایتے بہ تصور چرا کنند

روشنی طلعت تو ماہ ندارد ۔ طلعت قرص پنیر ماہ ندارد

پیش تو گل رونق گیاہ ندارد ۔ حیات ناں ، چنبر پادشاہ ندارد

—— • ——

دادم از زلف سیاہ گلہ چنداں کہ مپرس ۔ روزہ داری و قناعت ہوسم بود ولے

کہ چناں زو شدہ ام بے سر و ساماں کہ مپرس ۔ چشمکے می زد آں ایرہ بریاں کہ مپرس

—— • ——

ہوا خواہ توام جاناں و میدانم کہ میدانی ۔ لبم از سی چلہ بر من کشف شد ایں راز پنہانی

کہ ہم نا دیدہ میدانی و ہم ننوشتہ میخوانی ۔ کہ بورانی است بادنجان و بادنجان بورانی

—— • ——

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

بہ پیشم چوں خراسانی گر آئی صحن بغدادرا
ببوئی کلیہ اش بخشم سمرقند و بخارا را
بدرنج زرد صابونی اگر داری غنیمت دال
کنار آب رکن آباد و گلگشت مصلی را
چو آرائی بمشک و زعفراں رخسار پالودہ
برنگ دلبری و خال و خط چہ حاجت روئی زیبا را
جمال جو بریاں و حسن و نبر کشا ک
چناں بردند مبرا زدل کہ ترکاں خوان یغما را
بگالحق وصف خوشہ انگور مشغالی
کہ بر نظم تو افشاند فلک نظم ثریا را

شیخ اسحاق کا انتقال ۸۳۰ھ میں خواجہ حافظ کی وفات کے
تیس سال بعد ہوا۔

عبید زاکانی

خواجہ نظام الدین عبید اللہ قزوینی خاندان زاکانیاں کے ممتاز فرد ہیں۔ قبائل عرب سے خاندان کو نسبت ہے۔ اس خاندان کے افراد علم و دولت میں بھی قزوین میں امتیاز رکھتے تھے۔ بعض مرتبہ صدارت پر بھی متمکن تھے۔ اور خواجہ عبید بھی ایک وقت وزارت کے رتبہ پر فائز تھے۔ اپنے زمانہ کے مشہور علما میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ہر ایک تذکرہ نویس نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ حمد اللہ مستوفی صاحب "گزیدہ" آپ کا ہم شہری اور ہمعصر تھا، لکھتا ہے کہ "صاحب معظم خواجہ نظام الدین عبید اللہ خوب اشعار کہتے ہیں اور رسائل بے نظیر لکھے ہیں۔" دولت شاہ سمرقندی تذکرۃ الشعرا میں لکھتا ہے کہ

• اصلح الظرفاء و زبدۃ الفضلا عبید زاکانی مرد خوش طبع و اہل فضل تھا۔ ہر چند اہل علم و فن اس کو ہزل گو کہتے ہیں لیکن علوم و فنون سے خوب واقف تھا۔ شاہ شیخ ابو اسحاق کے عہد میں شیراز میں تحصیل علوم میں مشغول تھا۔ علم معانی میں ایک کتاب تصنیف کی اور شاہ کو پیش کی۔ بعض درباریوں نے کہا کہ مسخرہ آیا ہے اور بادشاہ اس کی طرف متوجہ ہے۔ عبید نے جواب دیا کہ اگر بادشاہ کا قرب مسخرگی سے حاصل ہو اور ہزل مقبول ہو تو علماء و فضلاء کو کون پوچھنے والا ہے۔ کسے پڑی ہے کہ بیہودہ دماغ لطیف کو چراغ مدرسہ کثیف کے دھوئیں سے سیاہ کرے۔ کسی دوست نے کہا کہ افسوس ہے کہ اس علم و فضل کے ہوتے تو ان ہزلیات میں پڑا ہے، عقل سے بعید تر ہے۔ جواب دیا ؎

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم   کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز   تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

بات اصل میں یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں فتنہ و فساد اور بدنظمی کے علاوہ اہل دین و ملت فروش اور صوفی ریاکار اور منافق جامہ پارسانما بہت پیدا ہو گئے تھے اور سادہ لوح لوگوں کی جیبیں خالی کرتے۔ عبید اور خود خواجہ حافظ ان کا پول کھول رہے تھے تاکہ لوگ ان کے دام تزویر میں نہ پھنسیں۔ خواجہ عبید نے جو کچھ لکھا انہی لوگوں اور عیش پرست امرا کی مذمت میں لکھا۔ اور ایسا عریاں ہو کر لکھا کہ زبان زد خلائق ہو گیا اور اس زمانہ کی مشہور شخصیتیں بھی اس سے خوف زدہ تھیں۔ ایک دفعہ خواجہ سلمان ساوجی قزوین میں وارد ہوئے۔ امیرانہ ٹھاٹ کے ساتھ نہر کے کنارے خیمہ میں متمکن تھے۔ عبید زاکانی کو اطلاع

ہوئی تو پیا پا وہاں پہنچے۔ ایک دفعہ خواجہ سلمان نے عبید کی شان میں ایک قطعہ لکھا تھا ۔ ؎

جہنمی و ہجا گو عبید ناکانی　　مقرر است بہ بیدولتی و بدینی

اگرچہ نیست قزوین ودستانا راست　　ولیک می‌شود اندر حدیث قزوینی

عبید ناکانی جہنمی اور ہجو نویس بیدولتی اور بے دینی میں مشہور ہے ۔ اگر شہر قزوین کا رہنے والا نہیں ایک گنوار کا بیٹا ہے لیکن کہتے ہیں کہ قزوینی ہے ۔

بھلا خواجہ عبید اتنی بات سن کر خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ سلمان کی مجلس میں آ دھمکا۔ سلمان نے پوچھا کہ بھائی کہاں سے آنا ہوا۔ کہا قزوین سے پوچھا کہ کچھ سلمان کے شعر بھی یاد ہیں۔ کہا کہ ہاں ایک دو نہیں بہت یاد ہیں ۔ ؎

من خراباتیم و بادہ پرست　　در خرابات مغاں عاشق دست

می کشندم چو سبو دوش بدوش　　می برندم چو قدح دست بدست

یہ اشعار پڑھ کر کہا کہ خواجہ سلمان تو بزرگ فاضل آدمی ہے ۔ میرا گمان ہے کہ یہ شعر سلمان نے نہیں کہے۔ اس کی بیوی نے کہے ہوں گے کیونکہ ایسے اشعار کو اسی سے نسبت دی جائے تو مناسب ہے سلمان بھڑک اٹھا مگر فوراً سمجھ گیا کہ یہ عبید ناکانی ہے ، قسم دے کر پوچھا کہ سچ کہو تم عبید ناکانی ہو ، کہا ہاں ، تو عجیب ہجو نویس ہے کہ نادیدہ میرے حق میں ناشائستہ کلمات کہے ، میرا ارادہ تو یہ تھا کہ بغداد میں جا کر تیری مزاج پرسی کرتا اور وہ جھگڑ سناتا کہ تو لوگوں میں ذلیل خوار ہوتا . تو اپنی خوش قسمتی سمجھ یہاں ملاقات ہو گئی ، اور میری زبان سے

کوئی حرف ایسا نہ نکلا تو تجھے اپنے کہے پر ندامت ہوتی۔ سلمان نے معذرت کی اور نقد و لباس پیش کیا۔ دونوں میں مصالحت کے بعد دوستی بھی ہو گئی۔ عبید کی ہجو اور ہزلیات سے ہر ایک شخص ہراساں تھا۔ اور ہر ایک کچھ نہ کچھ خدمت کرتا۔

خواجہ عبید کی یہ غزل مشہور ہے ؎

مردم بعیش خوشدل و من مبتلائے قرض　　ہر کس بعیش شغلے و من مبتلائے قرض

قرض خدا و قرض خلائق بگردنم　　آیا ادائے فرض کنم یا ادائے قرض

فرض اور قرض میں تجنیس ہے۔ میری گردن پر خدا کا فرض اور لوگوں کا قرض ہے۔ اب فرض ادا کروں یا قرض۔ ؎

در کوچہ قرض دارم واندر محلہ قرض　　در شہر قرض دارم و اندر سرائے قرض

ہر طرف سے قرض میں گھرا ہوا ہوں کوچہ اور محلہ اور شہر اور سرائے میں مجھے قرض خواہ ہی نظر آتے ہیں۔ ؎

عرضم چو آبروئے گدایاں بباد رفت　　از بسکہ خواستم زدر ہر گدائے قرض

جس طرح فقیروں کی آبرو سوال سے برباد ہوتی ہے اس طرح میری عرض کا حال ہوا کہ میں نے ان سے سوال کیا جو خود مقروض ہیں۔ میں نے بھیک منگتوں سے بھیک مانگی۔ ؎

گر خواجہ تربیت نہ کند مر عبید را　　مسکین چگونہ باز رہد از بلائے قرض

اگر خواجہ عبید کی ربوبیت نہ کرے تو بے چارہ قرض کی مصیبت سے کیسے مخلصی پا سکتا ہے۔

عبید زاکانی کی وفات ۷۷۱ھ میں واقع ہوئی۔

ہمعصر اولیاء اللہ

مولانا جامی "نفحات الانس" میں اولیاء اللہ کے تذکرہ کے ضمن میں خواجہ حافظ کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ لسان الغیب اور ترجمان الاسرار ہیں، اکثر اسرار غیبی اور معانی حقیقت کو لباس الفاظ میں جلوہ دیا، اور صورت مجاز میں روشناس کیا۔ اگرچہ یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ کا مرشد کون تھا مگر آپ کا کلام صوفیاء کرام کے مشرب پر اس طرح واقع ہوا ہے کہ اس سے بہتر آج تک کسی نے نہیں کہا۔ ایک نقشبندی بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ دیوان حافظ سے بہتر کوئی دیوان نہیں۔

عبدالقادر بدایونی اولیاء عہد اکبر بادشاہ کے تذکرہ میں شیخ نظام الدین انبیٹی والا کا ذکر کرتا ہے کہ ایک روز بوقت شام آپ صحن مسجد میں تصوف کے حقائق بیان فرماتے تھے اور اسی تقریب میں خواجہ حافظ کے کئی شعر پڑھے، حسین خان کے ایک مصاحب نے پوچھا کہ خواجہ حافظ کس کے مرید تھے۔ فرمایا خواجہ حافظ بہاؤ الدین نقشبند کے مرید تھے۔

ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی میں مذکور ہے کہ ایک روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ حافظ اکثر فواید سلوک شعر میں بیان کرتا ہے عالم اور متقی تھا اور جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے شراب نہیں پیتا تھا۔ اور شاہ پیر رنگ ناہی کا مرید تھا۔ امیر تیمور نے شیراز فتح کیا تو حادثاً تمام اعیان شہر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ان میں خواجہ حافظ بھی تھے، حضرت خواجہ نقشبند اس وقت بقید حیات تھے۔ خواجہ حافظ سے ان کی ملاقات ثابت اور مشہور ہے۔ لیکن استفادہ کی نسبت معلوم نہیں۔

اگر خواجہ حافظ خواجہ نقشبند کے مرید ہوتے تو مولانا جامی جو اسی

سلسلہ کے ایک بزرگ ہیں ضرور اس کا ذکر کرتے لہذ مولانا جامی کا زمانہ بھی اقرب ہے۔ رہا ملاقات کا حال، یہ ممکن تو ہے مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ شیراز پر تیمور کے حملے کے بعد خواجہ حافظ ایک دو سال ہی زندہ رہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ خواجہ حافظ کا مرشد ضرور کوئی صاحب کمال بزرگ تھا۔ مگر حافظ نے اس کا نام اپنے کلام میں نہیں لیا۔ خواجہ حافظ خود کہتے ہیں کہ ؎

قطع این مرحلہ بے ہمرہی خضر مکن
ظلمات است بترس از خطر گمراہی

کہتے ہیں کہ "آب چشمہ آب حیواں درون تاریک ست" (سعدی) اگر مجھے راہ سلوک میں گمراہی سے بچنے کا ایک ہی دیلہ ہے کہ کسی خضر وقت پیر طریقت کی متابعت کرے ؎

بکوئے عشق منہ بے دلیل راہ قدم
کہ من بخویش نمودم صد اہتمام و نشد

عشق کے کوچہ میں بغیر رہنما کے پاؤں نہ رکھ کہ میں نے اس کے بغیر سو جتن کیے مگر کام نہ بنا ؎

یا ہنر برخود کہ مقصد گم کنی
یا منہ پا اندریں رہ بے دلیل

یا تو پہلے ہی سمجھ لے کہ تیرا مقصد حاصل نہ ہو گا یا اس راہ سلوک میں بغیر پیشوا قدم نہ رکھ ؎

شبان وادی ایمن گہے رسد بمراد
کہ چند سال بجان خدمت شعیب کند

وادی ایمن کا چرواہا یعنی حضرت موسےؑ جو اپنے خسر کی بھیڑ بکریاں دس سال وادی ایمن چراتے رہے، آپ کو اس وقت مراد ملی جب اتنے سال دل و جان سے شعیبؑ کی خدمت کی ؎

گرد سرت بحالے وصال است حافظا
یا یکے خاک درگہ اہل ہنر شوی

اگر تیرے سر میں وصال کی خواہش ہے تو اے حافظ مناسب یہی ہے کہ اہل بصر و بصیرت کی درگاہ کی خاک بن

عارف رومی فرماتے ہیں کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

غرض خود حافظ معترف ہے کہ مرشد کے بغیر یہ پر خطر راستہ طے نہیں ہو سکتا اور تائید ایزدی مقدم ہے ؎

"دام سخت است مگر یار شود لطف خدا — ورنہ آدم نبرد صرفہ ز شیطان رجیم"

فریب نفس کی کچھ انتہا ہی نہیں اللہ کا فضل شامل حال ہو اور اسی کا لطف و کرم، یاور ہو تو شیطان راندہ درگاہ سے پناہ مل سکتی ہے اس لیے اس میں کچھ شک نہیں کہ خواجہ کا بھی کوئی مرشد ضرور تھا۔ معاصرین اولیاء اللہ کا ہم مختصر حال لکھتے ہیں۔

شیخ امین الدین محمد

خواجہ حافظ نے ایک قطعہ میں جو ہم نقل کر چکے ہیں پانچ اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کے وجود سے فارس آباد تھا ان میں سے ایک شیخ امین الدین محمد بن علی بن مسعود ہے جس کو حافظ "بقیہ ابدال" کہتے ہیں "کارہائے بستہ" اس کی میمن ہمت" سے کھلتے رہے۔ اگر ہمت سے مراد وہی اصطلاح صوفیہ ہے جس کا مفہوم خواجہ اکثر اشعار میں واضح کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ یہی خواجہ کا مرشد بھی ہو۔ شیخ کا مولد کازرون ہے، اپنے عم بزرگوار شیخ عبداللہ بلیانی سے خرقہ و خلافت پائی، خواجو کرمانی اس کی مدح میں کہتا ہے کہ ؎

امین ملت و دین شیخ اعظم — مدبر حقیقت کہف عالم

الاای پیک مد بجزان مشہور ــــ کہ چوں موسیٰ تہدت طایر طور
گرت بر کازراں افتد گذارے ــــ بکن بہر من وتحنہ کارے
ببیں در ملک وحدت تاجدارے ــــ بمیداں حقیقت شہسوارے
ز برج بو علی وتاق ماہے ــــ دنا قلیم ابو اسحاق شاہے

شیخ کی وفات کازران میں ۷۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ اور خانقاہ میں جو آپ ہی سے منسوب ہے دفن ہوئے۔ آپ کی ایک رباعی مشہور ہے

اے دل بہ زنجیر چو دیوانہ نشیں ــــ در دامن درد خویش مردانہ نشیں
تا مشتری سپیدہ خود را بپے کن ــــ معشوق چو خانگی است در خانہ نشیں

سید کمال الدین ابو الوفا

سید کے حالات مفصل معلوم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ شیراز میں رہائش تھی اور خواجہ حافظ آپ کی خدمت میں اکثر آتے رہے، چنانچہ ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

سحر بلبل حکایت با صبا کرد ــــ کہ عشق روئے گل با ما چہا کرد

صبح بلبل صبا سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھا گل کے عشق نے میرے ساتھ کیا کچھ کیا۔

اس غزل کے اشعار ہیں ؎

گر از سلطاں طمع کردم جفا بود ــــ ور از دلبر وفا جستم جفا کرد۔

اگر سلطان سے کچھ طمع انعام واکرام کی خاطر کی تو جفا تھی اور دلبر سے وفا کی طلب کی تو جفا کی ؎

وفا از خواجگاں شہر با من ــــ کمال دولت و دیں بوالوفا کرد

اگر کسی نے خواجگان شہر میں سے مجھ سے وفا کی تو کمال الدین ابو الوفا نے کی۔

شیخ زین الدین تایبادی آپ کی کنیت ابو بکر ہے، مولانا جامی نفحات میں آپ کا تذکرہ اولیاء اللہ میں کرتے ہیں آپ کی ملاقات خواجہ بزرگ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند سے اس طرح ہوئی کہ خواجہ سفر حج کے دوران میں آپ سے ملے۔ مولانا نے کہا کہ میرے لیے نقش باندھو فرمایا کہ میں تو آپ کی خدمت میں اس لیے آیا کہ نقش لے کر جاؤں، مولانا خواجہ کو اپنے گھر پر لائے اور دو تین روز مہمان رکھا، توزک تیموری میں بھی تیمور نے آپ کا ذکر کیا ہے، آپ کی اور خواجہ حافظ کی وفات ایک ہی سال ۷۹۱ھ میں ہوئی۔

شاہ نعمت اللہ شاہ صاحب کی ولادت ۷۳۰ھ قصبہ کوہ بنان واقع کرمان میں واقع ہوئی۔ آپ نے اصول فقہ قاضی عضد الدین سے سیکھے، قاضی خواجہ حافظ کا ممدوح ہے، اور ان پانچ اشخاص میں سے ایک ہے جس کا تذکرہ ہم قطعہ میں کر چکے ہیں کئی بار حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ خرقہ شیخ عبد اللہ یافعی عارف عصر سے ملا۔ شاہ صاحب خود کہتے ہیں۔

شیخ ما بود در حرم محرم — قطب وقت و یگانہ عالم
نعمۃ اللہ مرید حضرت اوست — شیخ عبد اللہ است اعلم هم

خواجہ حافظ اور شاہ نعمت اللہ کے اشعار میں نوک جھونک پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ شاہ صاحب کے اشعار کی تردید کر رہے ہیں، شاہ صاحب کے اشعار میں پائی جاتی ہے۔

شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ ؎

ما خاک راہ را بنظر کیمیا کنم — صد درد را بگوشہ چشمے دوا کنم

خواجہ از راہ انکسار فرماتے ہیں ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

اور اس کے بعد تعریض کرتے ہیں کہ ؎

دردم نہفتہ بہ ز طبیبان مدعی باشد کہ از خزانۂ غیبش دوا کنند

شاہ صاحب فرماتے ہیں ؎

ما را نفس چو لازم عشق است لاجرم بیگانہ را بیک نفسے آشنا کنم

خواجہ حافظ کا جواب ہے ؎

بے معرفت مباش کہ در من یزید عشق اہل نظر معاملہ با آشنا کنند

شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ ؎

در حبس صورتیم و چنیں شاد و خرم بنگر کہ در سراچۂ معنی چہا کنیم

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

حالے درون پردہ بسے فتنہ می رود تا آں زماں کہ پردہ برافتد چہا کنند

شاہ صاحب کا دعویٰ ہے ؎

رنداں لاابالی و مستاں سر خوشیم ہشیار را بہ مجلس خود کے رہا کنیم

خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

چوں حسن عاقبت نہ برندی و زاہدیست آں بہ کہ کار خود بعنایت رہا کنیم

خواجہ حافظ کے اکثر اشعار میں صوفیوں کے دلق طمع اور ریا کاری کا مذکور ہے، روئے سخن ایسے ہی صوفیوں کی طرف ہے۔ شاہ صاحب نے ایک قطعہ خواجہ حافظ کے طعن میں کہا ہے ؎

گر معنی تنزل بداند حافظ تنزیل بعشق دل بخواند حافظ

او کرد تغزل ما تحقیق کردیم تحقیق کجا چنیں بداند حافظ

شعر و شاعری کے میدان میں شاہ صاحب خواجہ حافظ کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ خواجہ حافظ شاہ صاحب کے بلند آہنگ دعاوی کا جواب وہی کچھ دیتے ہیں جو ایک موحد سے توقع ہے۔ ما را چہ گونہ زیبد ایں دعوی خدائی،

خواجہ حافظ کے ہمعصر اولیاء اللہ بھی تھے مگر خواجہ کی نہ تو ان سے ملاقات ہوئی اور نہ آپ کے کلام میں ان کا کچھ مذکور ہے،

خواجہ حافظ کا علم و فضل

کسی محقق نے یہ کہا کہ انسان اس وقت تک عالم ہے جب تک اس کو اپنے جہل کا شعور ہے، جب یہ سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوں تو جاہل بن جاتا ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ علم علم جہل کا نام ہے۔ جہاں تک ہمیں اپنے جہل کا علم ہوگا اسی حد تک ہم عالم ہیں، حقیقت تو پہلے ہی موجود ہے کچھ ہماری اختراع نہیں جو بات ہم نہیں جانتے اس کا جاننا علم ہے، خواجہ حافظ اس بات سے خوب واقف تھے، آپ نے اس کا اظہار اپنے کلام میں لطیف پیرایہ میں کیا ہے اور اس حد تک کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مذہب "جبریہ" ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

تا فضل و علم بینی بے معرفت نشینی یک نکتہ ات بگویم خود را مبیں کہ رستی

جب تک تجھے اپنے علم و فضل پر فخر و ناز ہے یوں سمجھ لے کہ معرفت حقیقت سے تو بالکل جاہل ہے۔ ایک نکتہ میں تجھے بتاتا ہوں وہ یہ کہ خود بینی ترک کر بس تیری نجات ہو جائے گی۔ ؎

خود بینی و خود رائی در مذہب رنداں نیست کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

رندوں کے مذہب میں خود بینی اور خود رائی نہیں ہے بلکہ ان کے مذہب میں دونوں کفر ہیں، قرآن مجید کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر ایک امر اپنی طرف منسوب فرماتا ہے۔ خیر و خوبی تو سب اس کی طرف سے ہے۔ لیکن شر اور فتنہ و فساد سب ہماری نفسانیت ہے، اس کا امکان بھی اسی کا پیدا کردہ ہے۔ انسان تو صرف کسب کرتا ہے، پر اس کا اختیار ہے کہ خیر و خوبی کسب کرے یا بدی۔ "وہدینہ السبیل اما شاکراً واما کفورا" خواجہ حافظ کہتے ہیں

تو مگر بر لب جوئی ہوس بنشینی ورنہ ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

خواجہ حافظ کو علوم متداولہ پر کامل عبور تھا۔ مراتب علوم و حکمت شمس الدین عبداللہ شیرازی اور علامہ میر سید شریف جرجانی اور قاضی عضد الدین سے سیکھے، خود کہتے ہیں کہ چالیس سال تحصیل علوم میں بسر کیئے رے

علم و فضلے کہ بچل سال دلم جمع آورد ترسم آں نرگس مستانہ بیک جا ببرد

یہ علم و فضل جو میں نے چالیس سال کے عرصہ میں جمع کیے۔ ڈر ہے کہ محبوب حقیقی کی ایک نگاہ سب ایک دفعہ ہی چھین کر لے جائے گی۔ حفظ قرآن باچاردہ روایت کیا رے

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بقرآں کہ اندر سینہ داری

قرآن کی قسم جو تیرے سینہ میں محفوظ ہے تیرے اشعار سے خوشتر شے میں نے کوئی نہیں دیکھی رے

عشقت رسد بفریاد گر خود بساں حافظ قرآن ز بر بخوانی با چاردہ روایت

تیرا عشق ہی تیرا کارساز ہے، خواجہ حافظ کی طرح تو قرآن از بر چاردہ

روایت کے ساتھ تلاوت کرتا رہے۔

چار دہ روایت سے مراد وہ قرآن کے سات قاری ہیں جن کی قرأت مستند مانی گئی ہے، ان کے دو دو راوی تھے اور ان کا مجموعہ چودہ ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

نام قاری	راویان اول	راویان دوم
۱۔ نافع بن عبدالرحمٰن مدنی	قالون	ورش
۲۔ ابن کثیر مکی	بزی	قنبل
۳۔ ابو عمرو بن العلاء مصری	دوری	موسیٰ
۴۔ ابن عامر شامی	ابن ذکوان	ہشام
۵۔ عاصم کوفی	ابوبکر	حفص
۶۔ حمزہ کوفی	خلف بغدادی	خلاد کوفی
۷۔ کسائی کوفی	دوری (نامبردہ)	ابوالحارث بغدادی

خواجہ حافظ کو تفسیر قرآن بالخصوص "کشاف" زمخشری کا بھی علم تھا اور اس پر انہوں نے حاشیہ املائی بھی کی تھی فرماتے ہیں

بخواہ دفتر اشعار و راہ صحرا گیر   چہ وقت مدرسہ و بحث کشف کشاف است

ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد   لطائف حکمی با نکات قرآنی

نکات قرآنی کے ساتھ اپنے تفقہ سے لطائف حکمی جمع کرنا کسی فاضل اجل ہی کا کام ہے، منطق و فلسفہ میں بھی دستگاہ تھی۔ اس علم کی اصطلاحات آپ کے کلام میں عام ہیں ؎

ساقیا مدگردش ساغر تسلسل تا بچند   دورہ چون با عاشقاں افتد تسلسل بایدش

بعد از یتیم نبود شائبہ در جوہر فرد ۔ کہ دہاں تو بدیں نکتہ خوش استدلال است

بیا کہ تو بہ زلعل نگار و خندہ جام ۔ "تصوریست" کہ عقلش نمی کند تصدیق

توئی کہ صورت، جسم ترا ہیولی نیست ۔ چو جوہر ملکی در لباس انسانی

ز اتحاد "ہیولی" و اختلاف "صور" ۔ خرد زہر گل و بر نقش صد نشان گیرد

ز ارکان، نہ بر حد چو تو گوہرہ ۔ گردون نیاورد چو تو اختر بعد قرن

بجمال دختر از نور چشم ما ست مگر ۔ کہ در نقاب "زجاجی" و پردہ عنبی است

"عنب" انگور کو کہتے ہیں اور فارسی میں "رز" اسی کا شیرہ شراب ہے جو ساغر بلور میں اور انگور کے پردہ میں ہوتا ہے۔ حکماء کے نزدیک آنکھ میں تین رطوبتیں اور سات طبقے ہیں۔ رطوبت ایک زجاجیہ اور طبقہ ایک عنبی ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شراب پہلے عنب پھر شیشہ کے پردہ میں آتی ہے پھر کہیں آنکھوں کو نور بصر و بصیرت عطا کرتی، اشارہ "سورہ نور" کی طرف ہے۔

دی گفت طبیب از سر حسرت چو مرا دید ۔ ہیہات کہ حد تو ز قانون شفا رفت

"قانون" اور شفا ابو علی سینا کی مشہور تصانیف علم طب میں ہیں۔

خواجہ حافظ کی زبان فارسی تو مادری تھی۔ لیکن اگر متقدمین اور متاخرین کے کلام سے معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ الفاظ کی ترکیب میں

کس حد تک جدت سے کام لیا ہے اور زبان میں کہاں تک لطافت پیدا کی ہے، عربی پر بھی قدرت تھی۔ اس کو آپ "ہنر" سے موسوم کرتے ہیں۔

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی است زبان خموش ولیکن دہاں پر از عربی است

اشعار میں آپ بلا تکلف عربی کے الفاظ اس خوبی سے باندھتے ہیں کہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔ عربی شعر اور مصرع سعدی وغیرہ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ علم ہیئت اور موسیقی سے بھی واقف تھے، چنانچہ ان علوم کی اصطلاحات آپ اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں۔

نا منتظم نظر سعد در رہ است کہ دوش میان ماہ و رخ یار من مقابلہ بود

با ہمان منظرہ شیر آفتاب ہم بگیر با بروان دو تا قوس "مشتری" بشکن

"آفتاب گرفت" محاورہ میں سورج گرہن کو کہتے ہیں۔ بظاہر معنی یہ ہیں کہ ہرن سے شکار کا شکار کر مگر کسوف و خسوف کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

ایں مطرب از کجاست کہ ساز عراق کرد و آہنگ باز گشت براہ حجاز کرد

"عراق" اور "حجاز" دو راگنیوں کے نام ہیں۔ ساز اور "آہنگ" اور باز گشت (پلٹنا) بھی موسیقی کی اصطلاحات ہیں۔

شطرنج اور نرد بازی کا مذکور بھی آپ کے کلام میں ہے۔

ای بعد نرد بہ حسن و خوبان معذ گار قسمت بسی ہو سہی مرد جو

منصوبہ ہوائے تو حافظ کنول نچہ یافتہ کہ شش در غمت دلش افتاد ہمو مار

لسان الغیب لسان الغیب خواجہ حافظ بلاشک و شبہ ہیں۔ تذکروں میں تفاول کے قصہ تو مشہور و معروف ہیں مجھ سے ثقہ لوگوں نے اپنی واردات بیان کیں۔ خود میں نے بھی تجربہ کیا۔ اور خواجہ کو لسان الغیب پایا۔ ۱۹۱۲ء میں میں نے دیوان حافظ کا ترجمہ اور مختصر شرح لکھی جو ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ ترجمہ اور شرح قلم برداشتہ لکھی تھی اس لیے اس میں خامیاں اور غلطیاں بھی بہت تھیں، ممکن تصحیح دوسری ایڈیشن میں کی گئی۔ خواجہ کے سوانح حیات کا مجھے علم نہ تھا۔ تذکروں میں بھی کوئی مطلب کی بات نہ ملی میں نے خواجہ ہی سے دریافت کیا تو اس مصرع نے مشکل حل کر دی کہ "آں کس کہ گفت قصہ ما ہم ز ما شنید" میں نے آپ کے دیوان ہی سے آپ کے سوانح حیات اخذ کیے۔ سلاطین اور وزرأ وغیرہ کے حالات جن کا نام آپ کے کلام میں ہے تاریخوں میں مذکور ہیں۔ یہ کمی تو ارمغ سے پوری ہو گئی۔

خواجہ کے اشعار اور نصائح شیخ سعدی کی طرح ضرب المثل ہو گئے ہیں چونکہ ہم نے ان کا حوالہ ترجمہ و شرح میں دیا ہے اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کی نسبت یہ عام غلط فہمی ہے کہ پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا۔ ہمعصر مؤرخ بدایونی اور تزک جہانگیری سے اس کی تائید نہیں ہوتی، علم حدیث اس نے شیخ عبدالنبی صدر الصدور سے سیکھا۔ دیوان حافظ سید عبداللطیف قزوینی سے پڑھا۔ یعنی اس کے مطالب اور حقائق کا حل سید سے معلوم کیا۔ چونکہ اس کے دربار میں منتخب روزگار عالی پایہ کے ادیب اور شاعر ابوالفضل اور فیضی وغیرہ تھے اس لیے ان کے سامنے اپنے علم و فضل کا دعوی محض

لاف زنی تھی۔ علاوہ ازیں جو کام منشی متصدی وغیرہ کر سکتے تھے وہ خود کیوں کرتا۔ اس کے عقائد کے بارہ میں علمائے عصر نے بہت کچھ شور مچایا بدایونی بھی مذمت کرتا ہے لیکن ان ملاؤں کو معلوم نہ تھا کہ اکبر نے کیا سیاسی ڈھونگ کھڑا کیا ہوا ہے اور کس حد تک وہ کامیاب ہوا۔ علمائے دین کے دین و ایمان اور بلند آہنگ دعاوی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک مجلس خاص میں امرا و وزرا اور قاضی ممالک ہند موجود تھے۔ اکبر ساغر مئے ناب پیش کر رہا تھا۔ قاضی صاحب کی باری آئی تو بے تکلف پی گئے۔ اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا ؎

در عہد بادشاہ خطا بخش جرم پوش
حافظ قرابہ کش شد و قاضی پیالہ نوش

یہ واقعہ بدایونی نے لکھا ہے۔ کیا برمحل خواجہ حافظ کا شعر چسپاں کیا۔ خود نغز گو شعرا ہر ایک زمانہ میں اپنی مشکلات کا حل خواجہ سے میانت کرتے اور خواجہ ہی کے ناخن فکر سے ان کا عقدہ حل ہوتا۔ احمد لاغر اچھا شاعر گذرا ہے "سیستان" میں شاہ کی محفل سے رنجیدہ خاطر ہو کر نکلا۔ ایک قطعہ شاہ کی خدمت میں ارسال کیا ؎

شہنشاہ بکرم عذر بندہ را بپذیر
ز صحبت تو هم از آنکہ اگر کنارہ کنم
زیادہ منع تو نتوانم و نگویم نیست
کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم

مولانا "لسانی" کا ایک شاگرد "شریف" نامی ہے۔ مولف "تذکرہ آتشکدہ آذری" مراتب شاعری میں شاگرد کا پایہ استاد سے بلند تر لکھا ہے۔ اس نے شاہ نعمت اللہ یزدی کی مدح میں قصیدہ لکھا مگر صلہ خاطر خواہ نہ ملا۔ ایک قطعہ لکھ کر ارسال کیا ؎

نعمت اللہ اخترِ برج سعادت شاہ یزد
آنکہ چرخش سر نمی پیچد ز طعن

محلی بہ تبریز آمد ارباب سخن گشتہ اند ۔۔۔ ہر مراد خویش کاور جز شریف مراد

باوجود آنکہ گفتم مدح او بیش از ہمہ ۔۔۔ از ہمہ کمتر ورا انعام بر رویم گشاد

گرچہ محتاجم ولیکن بیش از آنم ہمت است ۔۔۔ کز عطائے کم گردد دل غمدیدہ شاد

کلکِ ہیچم ندانے تا چو حافظ گفتمے ۔۔۔ شاہ یزدم دید مدحش گفتم و ہیچم نداد

خواجہ کے ایک مصرع کی تاثیر دیکھیے کہ انعام توقع سے زیادہ ملا

خواجہ امیر بیگ شیخ غیاث الدین تبریزی کی نسل سے شعرا تبریز میں ممتاز رتبہ کا شاعر ہے۔ شاہ طہماسپ صفوی کے عہد میں خدمت جلالی پر سرفراز تھا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ کی نظروں سے گر گیا۔ اور خراسان میں مقید ہوا۔ عبداللہ خان روز بک اس کی جگہ مسند خانی پر متمکن ہوا تو یہ شعر خواجہ کے پاس لکھ کر بھیجا۔

ای خواجہ بعد ازیں طمع از زندگی ببر

زاں رو کہ گشتہ مسند خانی بنام ما

خواجہ امیر نے جواب میں لکھا ہے کہ

اے یادگار اہل خراساں گمند کنی ۔۔۔ زنہار عرضہ دہ بر ایشاں سلام ما

وانگہ بگو ز راہ وفا آن گروہ را ۔۔۔ کلکے گشتہ کینہ خواہ شما خاص وعام ما

کلک غزد جبل شما ثبت کردہ بود ۔۔۔ در رقعہ کہ بود دراں رقعہ نام ما

کلکے خواجہ بعد ازیں طمع از زندگی ببر ۔۔۔ زاں رو کہ گشتہ مسند خانی بنام ما

ای مغی مگر نشنیدی کہ می رسد ۔۔۔ شاہ ستارہ خیل وسپہر احتشام ما

باشد جواب دعوی خانی کہ کردہ ۔۔۔ بیتے کہ گفت حافظ شیریں کلام ما

چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں ۔۔۔ کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

ما بندگان حضرت شاہ ملائکیم ۔۔۔ ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

مولانا لسانی کے شاگردوں میں سے جیدی بھی ہے۔ عمر کا اکثر حصہ ایران و ہندوستان کی سیاحت اور امراء و سلاطین کی مدح میں بسر کیا ایک دفعہ شاہ ہند کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ لیکن صلہ خاطر خواہ نہ ملا ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا۔

در مدح پادشاہ سخن سنج ملک ہند ۔ گفتم قصیدہ کہ لپیبہ ہر کہ دید
زاں ساں قصیدہ کہ بیگاہ نوشتمش ۔ آب حیات بعد قاسم از جامعی چکید
ما چو بعد گار مدعگار من نہ بود ۔ تاں شاخ گل میلئے دلم خار غم خلید
نشنیدہ شاہ عقدہ کشا مصرعے زمن ۔ نگشودہ قفل آرزوئے من از آں کلید
بودم زآب دیدہ غرق بحر غماں ۔ کز غیب ایں ترانہ بگوشش دلم رسید

وحافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس

در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

صلہ کے ساتھ خلعت بھی ملا

خواجہ حافظ کے مذہب پر اہل مذاہب

خواجہ حافظ کا مذہب نے طویل اور بے معنی بحث کی ہے گرفتاراں ابو بکر و علی اس کو سنی اور شیعہ کہتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ — قد املاء اتقی سما سا ودع ما فیہ عصر و ما اطلانہ التقی معنی الم تر

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

خواجہ حافظ کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اہل سنت والجماعت میں سے تھے، بھائی کی وفات پر قطعہ لکھا۔

برادر خواجہ طالب طاب ثراہ ۔ امام سنت و بعد از حمایتش
بسوئے روضہ رضواں رواں شد ۔ پس از پنجاہ و نہ سال از حیاتش

خلیل عادلش ہو پیوستہ بر خواں　　دنا بجا نیم کن سال وماہ کش ۷۷۵ھ

خواجہ کے تمام ممدوح سلاطین اور امراء وزراء سنی ہی تھے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ شیعہ حضرات نے جو غلو اپنے مذہب میں پیدا کر رکھا ہے خواجہ حافظ کے زمانہ میں نہ تھا۔ سنی اور شیعہ ان دنوں میں شیر و شکر تھے۔ بنو فاطمہ سے عقیدت دونوں رکھتے تھے۔

لیکن سیاسی جھگڑوں نے جب خلافت کے استحقاق پر بحث کا دروازہ کھول دیا تو صحابہ کیا اور بھی سب رستم کی زد میں آ گئے۔ جب صفوی خاندان ایران پر مسلط ہو گیا اور سنیوں کا قتل عام ہوا اور تبرا اور دیگر امور متعلقہ کا علانیہ رواج ہوا تو کوشش یہ بھی کی گئی کہ تمام اکابر کو کسی نہ کسی طرح شیعہ ثابت کیا جائے۔ خواجہ نے ایک غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے۔

ای دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش　　پیوستہ در حمایت لطف الہ باش

اس غزل کے تین اشعار حسب ذیل ہیں۔

آں را کہ دوستی علی نیست کافر است　　گو زاہد زمانہ و گو شیخ ما باش

امروز زندہ ام بولای تو یا علی　　فردا بروح پاک اماماں گواہ باش

قبر امام ہشتم سلطان دین رضا　　از جاں ببوس و بر در آں بارگاہ باش

میں نے ترجمہ اور شرح کی اول ایڈیشن میں یہ غزل لکھ کر اتنا کہہ دیا کہ یہ غزل خواجہ حافظ کا کلام نہیں۔ اور نہ خواجہ حافظ کی زبان کی روح شناسی اور اسلوب بیان اس میں پایا جاتا ہے۔ سخن فہم تو بسہولت سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے صحیح لکھا ہے۔ لیکن عوام کے لیے سمجھنا مشکل ہے، اس لیے ایک بھرے مجمع میں ایک شاعر خوش بیان سید مرثیہ گو نے میرے

منہ پر کہا کہ آپ نے ہم لوگوں پر بڑا ظلم کیا کہ کہتے ہیں کہ یہ غزل خواجہ کی نہیں ہیں نے کہا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ ہیں فرقہ اور تفرقہ سے بالا ہوں، آپ سخن فہم ہی نہیں سخن گو بھی ہیں اگر آپ جیسے اتنا کہہ دیں کہ یہ غزل خواجہ کی ہے تو ہیں دوسرے ایڈیشن ہیں آپ کا حوالہ دے کر معذرت بھی کروں گا سید صاحب شاعر تھے اتنا سن کر خاموش ہو گئے۔ مشکل یہ تھی جو سخن فہم نہیں اور اعلیٰ و ادنیٰ پایہ کے شعرا کے کلام میں امتیاز نہیں کر سکتے انہیں کس طرح یقین دلایا جائے۔ دوسرے ایڈیشن کے لیے پرانے نسخوں کی تلاش ہوئی اور مجھے چند قلمی نسخے مل گئے۔ ان میں سے شہنشاہ اکبر کے کتب خانہ کا نسخہ تھا۔ اس پر فیضی اور ابو فضل کی مہریں بھی ثبت تھیں۔ اور غالباً یہ وہی نسخہ ہے جو اکبر نے سید عبداللطیف قزوینی کے سامنے پڑھا۔ یہ نسخہ خاندان واہ کے ایک ممتاز رکن اسلم حیات خاں ڈسٹرکٹ جج کے پاس تھا۔ آپ کے والد محمد حیات خاں کو غدر دہلی کے ایام میں غالباً کتب خانہ شاہی سے ملا تھا۔ غرض کسی نسخے میں یہ غزل موجود نہیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں میرے ہاتھ کتاب "حافظ شیریں" آئی۔ یہ محمد معین ایرانی کی تالیف ہے اور ۱۳۱۹ھ میں بنگا بادلگانی پروین۔ تہران نے نشر کی وہ لکھتا ہے کہ

'این غزل در نسخ قدیمہ نیست دعاری از متانت دیگر غزلیات خواجہ است'

ایک اور غزل کا مطلع ہے ؎

یوسف گم شدہ باز آید بکنعان غم مخور کلبہ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اس کا ایک شعر ہے کہ ؎

شمع جمع آفرینش شاہ مردان است لیس گر توی از جہاں غلام شاہ مرداں غم مخور

محمد معین لکھتا کہ "غزل از حافظ است ولے بیت مسطور از مضافات است در ہیچ نسخہ قدیمی ثبت نشدہ"

یہ غزل جس کا مطلع ہے ای دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش الخ خاندان صفویہ کے عہد میں خواجہ کے لوح مزار پر کندہ کی گئی۔ اور غالباً انہی ایام میں خواجہ سے منسوب بھی کی گئی۔

یزید کا شعر ہے

انا المسموم ما عندی بترياق ولا راقی ادر کاسا و ناولها الا یا ایہا الساقی

اس شعر کا دوسرا مصرع خواجہ حافظ کے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا مصرع ہے۔ یعنی دیوان کا آغاز اسی شعر سے ہوتا ہے اسی مضمون کو شیخ سعدی ایک شعر میں اس طرح ادا کرتا ہے

ثم املا واسقنی کاسا ودع ما فیہ مسموما وما انت الذی تسعی مجنبن السم تریاقی

ایک شیعی شاعر نے لکھا ہے کہ

خواجہ حافظ را شبے دیدم بخواب
گفتمش ای عقل و دانش بے مثال

میں نے خواجہ حافظ کو ایک رات خواب میں دیکھا میں نے اسے کہا کہ تو عقل و دانش میں بے مثل ہے

از چہ بر خود لیتی شعر یزید
با وجود ایں ہمہ فضل و کمال

تو نے یزید کے شعر کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا ہے باوجود اس امر کے تو صاحب فضل و کمال ہے

گفت واقف نیستی زیں مسئلہ
مال کافر لیست بر مومن حلال

جواب دیا کہ تو اس مسئلے سے واقف نہیں کہ کافر کا مال مومن پر حلال ہے۔

جواب لاجواب ہے مگر مجھے یہ تحقیق نہیں ہوا کہ مال کافر مومن

پر حلال ہے۔ سعدی فرماتے ہیں ؎

شنیدم کہ مرداں را خدا | دل دشمناں ہم نکردند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام | کہ دو ستانت خلاف است وجنگ

عارف رومی کا ارشاد ہے ؎

کے شود اندر دلت حق منجلی | ای گرفتار ابو بکر و علی

تیرے دل میں نورِ حق کب جلوہ افروز ہو سکتا جبکہ تو ابو بکر و علی کی شخصیت میں الجھا ہوا ہے۔

امام ابو حامد محمد بن محمد بن محمد احمد غزالی

پیش لفظ

مشاہیر عالم کی شہرت کے اسباب کا جب تک علم نہ ہو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اپنے ہمعصر اشخاص بالخصوص علماء و حکما میں ان کو کیا امتیاز حاصل تھا کہ ان کا نام آج بھی زندہ ہے ۔ یہ آخر بشر ہی تھے اور بشر اور دیگر حیوانات میں یہ بات ایک جیسی ہے کہ پیدا ہوتے، پرورش پاتے، سوتے جاگتے، تلاش معاش کے لیے کچھ نہ کچھ کام یا محنت کرتے ہیں اور آخر مر کر خاک میں مل جاتے ہیں، عالم انسانی میں بھی یہ قدر مشترک ہے ۔ کچھ ایسی بات ضرور ہونی چاہیئے کہ مشاہیر اپنے زمانہ کی عام ذہنی سطح سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں ۔

ہم نے سلطان محمود غزنوی کے حالات کے شروع میں لکھا ہے کہ کسی انسان کا ذہنی درجہ خواہ کتنا ہی بلند ہو وہ اس ماحول کے اثر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جس میں اس کی پرورش و تعلیم و تربیت ہوتی ہے ۔ امام محمد غزالی رح کے بارہ میں دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس ماحول میں تھے ۔ اور آپ کے زمانہ کے حالات کا اثر آپ پر اور آپ کا اثر

پر کیا ہوا جب یہ تاریخی امور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گے تو آپ کا مقام مشاہیر عالم میں اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

امام صاحب کا تذکرہ اکثر اہل قلم نے لکھا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے "الغزالی" اردو میں اور جلال ہمائی نے غزالی نامہ فارسی میں (کتاب خانہ تہران) نے ابوریحان بیرونی کتاب آلاثار الباقیہ عن القرون الخالیہ" اور کتاب تحقیق الہند" ابن اثیر نے اپنی تاریخ کامل اور خواجہ نظام الملک طوسی نے "سیاست نامہ" میں اور صدرالدین ابوالحسن حسینی نے کتاب "اخبار الدولۃ السلجوقیہ" اور ابن خلکان نے "وفیات" میں غرض تمام مورخین مذکورہ اور دیگر تذکرہ نویسوں نے جو کچھ امام صاحب کے بارہ میں لکھا ہے اردو اور فارسی اور عربی میں ہمارے سامنے ہے۔ مولانا جلال ہمائی نے یہ تمام مواد ایک جگہ اپنی کتاب غزالی نامہ میں جمع کر دیا ہے۔ ہمارے مقالہ کا ماخذ زیادہ تر یہی ہے مگر ہم نے دیگر کتب سے بھی کم و بیش استفادہ کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے امام صاحب ہی کی تصانیف سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔

ان اوراق میں ہم نے کسی ایک طبقہ کی ممتاز شخصیت کا انتخاب کیا ہے اور اس شخصیت کے عصر کے مشاہیر جن کا تعلق دوسرے طبقات سے ہے ان کا بھی تذکرہ ضمناً کیا ہے، عموماً سلاطین اور وزرا و امرا و ادبا و شعرا و علما و حکما کا تذکرہ ایک ہی شخصیت کے تذکرہ کے ضمن میں آگیا ہے، اسی طرح قارئین کو ہر ایک کے عصر کے حالات کا علم مجملاً ہو سکتا ہے۔

امام محمد غزالیؒ

حجۃ الاسلام امام زین الدین ابو حامد محمدؒ بن محمدؒ بن محمدؒ بن احمد غزالی طوسی اور آپ کے بھائی احمد غزالی طوس کے شہر ”طابران“ کے ایک خاندان کے دو مشہور افراد تھے۔ امام غزالی ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء طغرل بیگ سلجوقی کے اواخر عہد میں طابران میں پیدا ہوئے۔ باپ محمدؒ بن محمدؒ کا پیشہ پارچہ بافی تھا۔ اور بالکل امی تھا۔ لیکن درویش اور متقی تھا۔ روزی حلال سے اپنا اور اہل و عیال کا پیٹ پالتا تھا۔ ۴۶۵ھ میں فوت ہو گیا۔ محمد اور احمد دونوں بچوں کو اپنے ایک دوست ابو حامد احمد بن محمد رادکانیؒ کے سپرد کر گیا۔ دوست صوفی مشرب زاہد اور عابد فقیر اور گوشہ نشین آدمی تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت حتی الوسع کی، باپ کے ترکہ اور اپنی روزی حلال سے جب تک ہو سکا دریغ نہ کیا۔ لکھنا پڑھنا اور مسائل دینی اور مبادیات علوم ادبی و دینی سے جہاں تک خود واقف تھا تعلیم کیے۔ اس کے بعد مدرسہ میں داخل کر دیا۔ ایک غرض یہ بھی تھی کہ نادار طلبا کو اوقاف ملحقہ مدرسہ کی آمدنی سے وظائف ملتے تھے۔ دونوں بچوں کا گذارہ بھی اس صورت میں خاطر خواہ ہو

جائے گا۔ غزالی کو اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا عطا فرمایا تھا۔ مستند استاداں عصر کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے جاتا اور جو کچھ سبق ملتا لکھتا رہتا تھا۔ امام ابو نصر اسماعیل کی خدمت میں پہنچا۔ پھر اپنے وطن طوس میں آیا اور تین سال یہاں رہا جو کچھ پڑھا لکھا تھا دہراتا رہا۔ خواجہ نظام الملک وزیر خاندان سلجوقیہ امام محمد غزالی سے روایت کرتا ہے کہ جب میں جرجان سے طوس کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا میرا ایک تھیلا میں کاغذات تھے جن پر میں استادوں سے سیکھی ہوئی یادداشت لکھتا رہتا تھا۔ چور یہ بھی لے گئے میں ان کے پیچھے گیا اور ان کے سردار کی منت خوشامد کی اور کہا کہ میں طالب علم ہوں، یہ کاغذ تو تمہارے کسی کام کے نہیں مگر میری چند سالوں کی محنت کی کمائی ہے، مجھے واپس دے دو، سردار کو میرے حال پر ترس بھی آیا اور جس کے پاس تھیلا تھا اس سے واپس دلوا دیا اور مجھے کہا کہ یہ کیا علم و ہنر ہے جو تو سیکھ رہا ہے، علم و ہنر تو ایسی چیز ہے جو کوئی چھین نہیں سکتا۔ تیرا مبلغ علم ان اوراق میں ہے چوروں نے چھین لیا اور تو کورا رہ گیا۔ امام صاحب کہتے ہیں پیشوائے دزداں میرا پہلا پیشوا ہے، میں نے سوچا کہ سچ کہتا ہے "علم در جلد خویش باید نہ در چرم میش"۔ اس کے بعد جو کچھ بھی سیکھتا ازبر کرتا۔

طوس سے امام صاحب پھر تحصیل علم کے لیے نیشاپور میں آئے جو اس وقت علمائے خراسان کا علمی مرکز تھا۔ نیشاپور میں مشہور و معروف استاد امام الحرمین ابوالمعالی جوینی تھے جن کا نظیر اس وقت خراسان میں نہ تھا۔ حلقہ درس وسیع تھا۔ غزالی بھی شامل ہو گیا۔

تھوڑے عرصہ میں اپنے ہمدرس طلبا میں ممتاز نظر آنے لگا۔ استاد بھی بھانپ گیا کہ یہ جوہر قابل ہے۔ اس لیے غزالی کی طرف توجہ زیادہ سے زیادہ کی۔ بعض ہمدرس حسد بھی کرنے لگے۔ غزالی کے ہمدرس اکثر علما و فضلائے عصر شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے کیا ہی ہراسی اور ابوالمظفر خوانی وغیرہ مشہور ہیں مگر جو مرتبہ غزالی کو حاصل ہوا وہ اسی کا حصہ تھا۔

غزالی کی عمر اس وقت اٹھائیس ۲۸ سال تھی۔ ادبیات و فقہ و اصول و حدیث و کلام و مناظرہ وغیرہ میں کامل دستگاہ بہم پہنچا چکا تھا۔ اور ہر ایک موضوع پر سلسلہ تالیف بھی نیشاپور میں شروع کر دیا۔ لیکن استاد کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہتا۔ ۴۷۸ھ میں امام الحرمین کا انتقال ہو گیا۔ استاد کی رحلت کے بعد اس کی ملاقات وزیر خواجہ نظام الملک طوسی سے ہوئی۔ نظام الملک کے گوش گذار غزالی کے علم و فضل بالخصوص فن مناظرہ کا شہرہ ہو چکا تھا۔ وزیر نیشاپور کے قدوم میں وارد کر رہا تھا غزالی کو طلب کیا۔ نظام الملک کی ملک ملازمت میں اور بھی علما و فضلا تھے۔ غزالی سے ان کا مناظرہ مختلف مسائل پر ہوا۔ غزالی نے سب کو نیچا دکھایا۔ خود علماء مجلس نے بھی غزالی کے علم و دانش کا اعتراف کیا۔ خواجہ نظام الملک کی توجہ بھی غزالی کی طرف بتدریج زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سلطان ملک شاہ سلجوقی (متوفی ۴۸۵ھ) کا بھی تقرب حاصل ہو گیا۔ اور تمام علما و حکما سے غزالی کا مرتبہ برتر ہو گیا سات سال بعد مدرسہ نظامیہ کا اعلیٰ مدرس مقرر ہوا۔ اس وقت غزالی کی عمر پنتیس سال تھی۔ چار سال تک مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس

وعظ و خطابت و مناظرہ اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔
اکثر طلبا نے استفادہ کیا جو بعد میں علما و فضلا مشہور ہوئے۔ اس
عرصہ میں غزالی کے علم و حکمت کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا اور
طالب علم جذبۂ ذوق و شوق میں مدرسہ نظامیہ کی طرف کھنچے چلے
آتے تھے۔ اس عرصہ میں غزالی نے ایک کام یہ کیا کہ کتب فلسفہ کا مطالعہ
بنظر غائر کیا۔ اور فلسفہ کے دقائق سے بخوبی واقف ہو گیا۔ اس وقت
اس کی عمر انتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ے

سحر گہ رہروے در سرزمینے ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ بود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے

چالیس کی زندگی میں غزالی ایک ذہنی انقلاب کی زد میں آگیا۔ اور اس
کی زندگی کا نیا باب کھلا۔ سب دنیوی عزت و احترام اس کی نظر میں
ہیچ معلوم ہونے لگے اس لیے دنیا اور اس کی تمام ذہنیت
سے منہ موڑ کر مالک الملک حقیقی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بغداد سے نکلا،
حج بیت اللہ کے بعد جامع دمشق میں معتکف ہو گیا۔ اسے تائید
ایزدی اور جذبۂ غیبی سمجھنا چاہیئے کہ علم و فضل و جاہ و عزت و احترام
دنیوی سے کنارہ کش ہو کر مطالعہ قلب میں مشغول ہو گیا۔ متکلم اور
فقیہ صوفی صافی بن گیا۔ شیخ سعدی نے تو ایک صاحب دل کا ذکر
کیا ہے کہ خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں آیا کسی نے پوچھا کہ ان دونوں
میں کیا فرق ہے کہ تو نے ایک کو چھوڑ کر دوسرے فریق کو اختیار
کیا ہے جواب دیا۔ ے

ایں یک گلیم خویش بروں می برد ز موج واں جہد می کند کہ برآرد غریق را

خانقاہ کا گوشہ نشین عابد تو اپنی ہی گودڑی کی خیر مناتا ہے ۔ لیکن فقیہ مدرسہ کوشش کرتا ہے کہ ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچا کر کنارہ پر لائے ۔

لیکن غزالی مدرسہ چھوڑ کر خانقاہ میں آیا۔ اگر اس سے بھی سوال ہوتا تو وہ بھی جواب دیتا اور یہی کہتا کہ فقیہ مدرسہ "او خویشتن گم است کرا رہبری کند"۔ اگر غزالی کو اطمینان قلب کا سامان مدرسہ میں ملتا تو وہ خانقاہ کی طرف کیوں جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خانقاہ کا گوشہ پہلے اطمینان قلب حاصل کر چکا تھا اب یہ تقاضہ فطرت دوسروں کی رہنمائی کے لیے مدرسہ میں آیا۔ غزالی کی مدرسہ میں یہ حالت تھی کہ

از قیل وقال مدرسہ حالے دلم گرفت

غزالی بھی آخر خانقاہ چھوڑ کر پھر مدرسہ میں آئے۔ بغداد سے نکلے تو ایک رفیق "ابو القاسم حاکمی" آپ کا ہم سفر تھا۔ ہم سفر ظاہری اور معنوی دونوں حالات میں رہا۔

غزالی خود بیان کرتا ہے کہ جاہ و منال کا چھوڑنا میرے لیے سہل تھا۔ لیکن ایک عمر جس علم و حکمت کی تحصیل میں صرف کی اس کا یک لخت ترک کرنا میرے لیے مشکل ترین امر تھا۔ یہ نہایت ہی فریب دینے والی شے ہے اور اس سے مخلصی حاصل کرنے میں مجھے نہایت زحمت اٹھانی پڑی۔ مفصل حالات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

مراحل سلوک طے کرتے اور مقامات معنوی سے گزرتے کے بعد امام صاحب پھر نیشاپور آئے۔ نیشاپور میں بھی مدرسہ نظامیہ تھا۔ یہاں درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اب خود علم صبغۃ اللہ میں رنگین

ہو چکا تھا اور شاگرد بھی اسی رنگ کا اصطباغ لے رہے تھے ۔ یہاں بیٹھ کر آپ نے سلاطین و امراء و وزراء وقت کو نامے لکھے ، ان مکتوبات کو کسی بزرگ نے جمع کیا۔ اور کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نام " فضائل الانام من رسائل حجۃ الاسلام " ہے ، آگے چل کر ہم اس کا نمونہ بھی پیش کریں گے۔ امام صاحب کو فارسی اور عربی پر کامل عبور حاصل تھا۔ عربی اس وقت دنیائے اسلام میں رائج الوقت سکہ تھا اور اکثر اہل علم خطابت اور تصنیف و تالیف عربی ہی میں کرتے ۔ اور جو فارسی میں کچھ کہتے تو عربی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ۔ امام صاحب کی طرز تحریر فارسی سادہ اور سلیس ہے ۔ عربی میں فصاحت اور بلاغت کی داد دی ہے ۔

امام صاحب کے استاد علوم مروجہ میں تو بہت ہیں لیکن پیر طریقت حضرت ابو علی فارمدی فضل بن محمد بن علی اور ابوبکر بن عبداللہ نساج مشہور مشائخ صوفیہ ہیں۔ فارمد طوس میں واقع ہے۔ اور حضرت فارمدی دو واسطہ سے مرید شیخ ابوالحسن خرقانی رح تھے۔ آپ اور ابوبکر نساج رح دونوں مشائخ صوفیہ خراساں میں ممتاز تھے، حضرت فارمدی کا انتقال ۴۷۷ھ میں ہوا۔ ابن خلکان نے آپ کا تذکرہ لکھا ہے ۔ اور مولانا جامی نے نفحات الانس میں اور دیگر تذکروں میں بھی آپ کا ذکر خیر کیا ہے ۔ آپ جب کبھی خواجہ نظام الملک طوسی سے ملنے جاتے تو ہر قدر تعظیم کے بعد عزت و احترام سے بٹھاتا حالانکہ غزالی کے استاد امام الحرمین اور مشہور صوفی بزرگ ابوالقاسم قشیری بھی ملتے تو محض قیام پر اکتفا کرتا ۔ کسی نے اس امتیاز کی وجہ دریافت کی تو کہا کہ ہر دو بزرگوار مجھے

لفظ نساج

بحیثیت وزیر ممالک ملتے ہیں مگر حضرت فارمدی محض خلق خدا کی بہبودی کے لیے ملتے ہیں، میرے عیوب بتاتے ہیں اور بندگان خدا کے ساتھ انصاف اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔

شیخ ابوبکر نساج شیخ ابوالقاسم گرمانی (متوفی ۴۵۰ھ) کے مرید تھے۔ ۴۸۷ھ میں وفات پائی۔ شیخ کی وفات سے ایک سال امام غزالی بغداد سے نکلے اور اپنی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اپنے بھائی احمد غزالی کو متعین کیا۔ ۴۹۸ھ میں سفر حجاز و دمشق و بیت المقدس و مصر سے واپس وطن کی طرف مراجعت کی۔ اثنائے راہ میں مقامات مقدسہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ اس طرح دس سال آپ وطن سے باہر رہے لیکن زیادہ عرصہ جامع دمشق اور بیت المقدس میں گوشۂ خلوت میں مجاہدہ اور ریاضت میں بسر کیے۔ جب طوس میں واپس تشریف لائے اوقات کا اکثر حصہ خلوت ہی میں بسر ہوتا رہا۔ ۴۹۹ھ میں سلطان سنجر اور اس کے وزیر فخر الملک بن خواجہ نظام الملک (متوفی ۵۰۰ھ) نے آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ مدرسہ نیشاپور میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کریں۔ امام صاحب رضامند نہ ہوئے مگر بعض دوستوں کے اصرار اور استخارہ اور رؤیائے صادقہ کی بنا پر آپ نے یہ خدمت دینی قبول کی۔ ایک سال طالبان دین کی تعلیم و ہدایت میں مشغول رہے پھر طوس کی طرف مراجعت کی، اور اپنی شہرہ آفاق کتاب "المنقذ من الضلال" یہاں بیٹھ کر لکھی، آپ کی عمر اس وقت پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔

اس کتاب میں آپ نے اپنے سوانح حیات پر تعلق وار دات قلبی بعض احباب کے استفسارات کے جواب میں لکھے اور اسی کتاب میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ علاوہ اسرار یادشاہ "دوزیر مجھ پر خواب اور بیداری میں منکشف ہوا کہ ہدایت بندگان خدا کے لیے مجھے نیشاپور میں جانا چاہیئے۔ مولانا جلال ہمائی غزالی نامہ میں لکھتا ہے کہ امام صاحب کا طرز تدریس و تعلیم و تربیت مدرسہ نظامیہ بغداد اور نیشاپور میں بالکل مختلف تھا۔ بغداد میں تو یکتا عالم متکبر و یگانہ متکلم جدلی تھے، اور نیشاپور میں سرتاپا صاحب حال و آرام و سکون تھے، عارفوں کی زبان کے محاورہ میں یہ کہنا چاہیئے کہ غزالی کا سفر بغداد سے "من الخلق الی الحق" اور طوس سے نیشاپور کی طرف سفر تا آخر عمر من الحق الی الخلق تھا۔ ایک عارف کہتا ہے کہ جو سالک سیر سلوک میں اس طرح عروج و نزول کرتا ہے "بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا" اور یہ کہ "طرق سالکان است و رۃ النارج"۔ ایک اور عارف کہتا ہے کہ "عارف دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو بحر وحدت میں ایسے غرق ہوئے کہ پھر نہ ابھرے یہ مجذوب کہلاتے ہیں، یہ اقتدار کی صلاحیت نہیں رکھتے، دوسرے سیر سلوک میں اعلیٰ مقامات تک پہنچتے ہیں۔ اور پھر نزول کرتے ہیں یہ سالک مجذوب ہیں اور یہی اہل تعلیم و تربیت خلق خدا کے ہوتے ہیں"

مولانا ہمائی نے پتہ کی بات کہی ہے کہ اب غزالی محض صاحب قال نہ تھا۔ صاحب حال بھی تھا، اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی بات کہتا اور یہی وجہ ہے کہ جو اوادت مند حقیقی تھے اور بہت تھے

وہ تو آپ کی صحبت بابرکت سے فیض یاب ہوئے اور آپ کی باتیں آپ کے دل سے نکلتی اور دلوں پر اثر کرتی تھیں، لیکن

"یہی باتیں جو محروم ازلی تھے ان کی بھڑکا کا موجب ہوئیں۔ غزالی کے ذہنی درجات اپنے زمانہ کے علماء کے فہم سے اعلیٰ وارفع تھے، وہ سمجھتے تھے کہ دین وہی ہے جو تقلیداً وہ سمجھ چکے تھے۔ اس لیے غزالی کے مرتبہ کو پہچان نہ سکے۔ اور اپنے ہی اعمال و اقوال کے ترازو میں غزالی کی رفتار و گفتار کو تولتے رہے۔ اسی لیے فقہا و روسائے مذہبی محض حسد و بغض کی وجہ سے غزالی کے مخالف ہو گئے اور حق تو یہ ہے کہ دینداری وہی ہے جو غزالی کی تھی اور وہ سب باطل پرست تھے۔

"آنانکہ دین لیلی و باقی ضلالت است

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم واقعات مذکورہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔

مدارس نظامیہ

خواجہ نظام الملک طوسی وزیر ملک شاہ سلجوقی خود صاحب علم و فضل تھا۔ اور مدت العمر اس کی خاص توجہ نشر علوم و معارف کی طرف رہی، اور طالبان علم کے لیے ہر ایک ممکن سامان حصول علم و آسائش مہیا کر رکھا تھا اس نے مدارس اور خانقاہیں مملکت کے طول و عرض میں تعمیر کیں اور مستند استادان عصر کی تحویل میں دیں۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً اصفہان اور نیشاپور اور بلخ و ہرات اور بصرہ و بغداد میں مدرسے تعمیر

کیے جو نظامیہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ ہر ایک مدرسہ کے ساتھ اوقاف و اموال ۔ ذخائر مخصوص تھے۔ جذبۂ شوق کے تحت بعض طالب علم فارغ التحصیل ہو کر مدرسوں کی اقامت گاہ میں ہی مدت العمر قیام کرتے اور وظیفہ مقررہ کی وجہ سے فکر معاش نہ رہتا تو نشر علم و حکمت میں مشغول ہو جاتے مدارس نظامیہ کے نمونہ پر مصر میں جامع ازہر کا سنگ بنیاد فاطمی خلفاء کے وزیر جوہر نے رکھا جو آج بھی مرکز علم ہے،

ان مدارس کا نظم و نسق متولیوں کے ہاتھ میں تھا جن کا تقرر حکومت وقت کی طرف سے ہوتا۔ ہر ایک مدرسہ کے ملحق ایک ایک کتب خانہ اور ناظم کتب خانہ اور اس کے ماتحت اور کارکن ہوتے۔ ان کا کام یہ تھا کہ کتب خانہ کی فہرست مرتب کرتے اور ہر ایک طالب علم کے مطالبہ پر کتابیں مہیا کرتے۔ ان کے علاوہ کاتب تھے جو کتابوں کی نقل کرتے اور طالبان علم کو مطالعہ کے لیے دیتے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد کے کتب خانہ میں ایک ایک کتاب کے کئی قلمی نسخے تھے اور کتابوں کی تعداد اور کتب خانہ کی وسعت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب ہلاکو خاں کے حملوں کے وقت بغداد کے محلوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، تین دن تک دجلہ کا پانی سیاہ لباس پہنے ہوئے اس علم و حکمت کا ماتم کرتا رہا۔ ناظم کتب خانہ وغیرہ بھی بڑے پایہ کے عالم مقرر ہوئے۔

مدرسین وہ مقرر ہوتے جن کے علم و فضل کا شہرہ ممالک اسلام میں پھیل چکا تھا۔ مدرس اعلیٰ جس کو ہم "پرنسپل" اور نائب مدرسین پروفیسر کہتے ہیں مدارس نظامیہ میں جو بھی وقتاً فوقتاً مقرر ہوئے

ان کے نام فاضل تذکروں میں مذکور ہیں۔ ان کا کیا مذکور ہے۔ جو طالب علم فارغ التحصیل ہو کر نکلے ان میں سے چند ایک فوزی ابیوردی ظہیر فاریابی جو مشہور شاعر فارسی ہے مدرسہ نظامیہ نیشاپور کے وظیفہ خوار طالب علم تھے۔ نظامیہ بلخ کا ایک طالب علم رشیدالدین وطواط شاعر اور ادیب اور اتسز خوارزم شاہ کا درباری تھا اور شیخ سعدی شیرازی (متوفی ۶۹۴ھ) نظامیہ بغداد کا وظیفہ خوار طالب علم تھا۔ اور اگر تعلیم و تربیت کی کیفیت ذہن نشین کرنا چاہو تو خود شیخ سعدی کی زبان سے سن لو۔

مرا در نظامیہ ادرار بود ۔۔۔ شب و روز تلقین و تکرار بود

میں نظامیہ (بغداد) میں ایک وظیفہ خوار طالب علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو کچھ استاداں مدرسہ تعلیم و تلقین ان کے وقت کے مدرسہ میں فرماتے رات کے وقت اس کو تکرار کرتا۔

مراستاد را گفتم ای پر خرد ۔۔۔ فلاں یار بر من حسد می برد

مدرسہ نظامیہ کے مدرس اعلیٰ امام ابوالفرج ابن جوزی تھے ان کی خدمت میں عرض کی میرا ہمدرس فلاں طالب علم ہے جو مجھ پر حسد کرتا ہے۔

چو من داد معنی دہم در حدیث ۔۔۔ برآمد بہم اندرون خبیث

جب کبھی میں حدیث کا کوئی نکتہ بیان کرتا ہوں تو اس کے اندر سے خناسی دلاور مضطرب ہو کر باہر نکلتا ہے۔

شنید این سخن پیشوای ادب ۔۔۔ بر تندی برآشفت و گفت ای عجب

میری شکایت سن کر پیشوائی ادب سخت برافروختہ ہوا اور کہا کہ عجیب

ماجرا ہے :۔

سعدی پسندت نیامد ز دوست ‌‌ ‌‌ ندانم کہ گفتت کہ غیبت نکوست

تجھے اپنے دوست کا حسد تو ناگوار گزرا مگر مجھے معلوم نہیں کہ تجھے یہ کس نے تلقین کی کہ "غیبت" اچھی چیز ہے :۔

گر او راہ دوزخ گرفت از خسی ‌‌ ‌‌ ازیں راہ دیگر در او رسی

اگر وہ کمینگی کی وجہ سے ایک راہ سے دوزخ میں داخل ہوا تو دوسرے راستہ (غیبت) سے داخل ہوگا۔

یہ پند و نصائح کا دفتر جو شیخ سعدیؒ نے کھولا اسی تعلیم و تربیت کا اثر ہے جو مدرسہ نظامیہ میں قبول کیا۔

مدرسہ نظامیہ کی تاریخ خود ایک مستقل موضوع ہے۔ ان مدارس مدرس اور طالب علموں کے نام اور حالات کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔

سلطان ملک شاہ سلجوقی کا مذہب حنفی تھا اور خواجہ نظام الملک وزیر شافعی تھے، اس مقام پر یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیے کہ مذہب " سے مراد ائمہ دین کا تفقہ اور اجتہاد فی الدین ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ یا شافعی کا یہ یا وہ مذہب ہے تو اس سے مراد ان کا تفقہ فی الدین اور اجتہاد فقہی ہے جو اپنے زمانے کے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب ان حضرات نے وضع کیا۔

اور ایسے مذاہب اسلامیہ بہت ہیں جو ائمہ دین سے منسوب ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب مذاہب اسلامیہ میں ان کا تذکرہ مفصل لکھا ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہر ایک مذہب ایک نظریہ فی الدین ہی ہے اور

کوئی ایسی شے نہیں کہ کوئی مسلمان متمکن ہو کہ اس کا اتباع کرے اگرچہ یہ نظریہ نہایت قابل قدر ہیں مگر یہ ذہنی جمود اور بے حسی کی دلیل ہے کہ ہم تعلیماً انہی کو وحی آسمانی کا درجہ دیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر ایک زمانہ میں ابوحنیفہ وغیرہ فقہا پیدا ہوں اور اپنے زمانے کے ذہنی اور خارجی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور ان اصول دین کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کی جامع و مانع کتاب قرآن عظیم ہے "تفقہ فی الدین" کریں ابوالفضل کہتا ہے کہ گر بوحنیفہ در زمان مابودے فقہ دیگری نوشت۔ جس قوم کے حل و عاقد پر جمود چھا جاتا ہے اور حسب مثنوی قرآن حکیم بے شعور مقلد ہو کر رہ جاتی ہے اور پرانی لکیر پیٹتی رہتی ہے اور "اللہ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو (خارجی حالات کے مناسب) نہ بدلے اور جب نہیں بدلتی تو اس کے برے دن آجاتے ہیں اور ٹالے سے نہیں ٹلتے۔" مسلمانوں کے تنزل کا یہی سبب ہے۔

چونکہ خواجہ نظام الملک کا مذہب شافعی تھا اس لیے زیادہ تر مدارس نظامیہ میں شافعی مذہب کے علماء کا دخل رہا۔

نظامیہ اصفہان

نظامیہ اصفہان کی شہرت خانوادہ خجندی سے وابستہ ہے۔ صدرالدین خجندی المعروف "صدلایہ" کا تذکرہ مفضل بن سعد بن حسین مافروخی اصفہانی نے اپنی کتاب "محاسن اصفہان" میں کیا ہے۔ یہ تذکرہ ولیس پانچویں صدی ہجری میں گذرا ہے۔ یہ خانوادہ مذہباً شافعی تھا

خواجہ نظام الملک نے مدرسہ نظامیہ اصفہان کا نظم و نسق اسی کے سپرد کیا۔
اس خانوادہ کے ممتاز ارکان چند ایک حسب ذیل ہیں جن کا تعلق تدریس
یا نظارت اوقاف مدرسہ سے تھا۔

۱- ابو بکر محمد بن ثابت بن حسن بن علی خجندی (متوفی ۴۸۳ھ) مولف
کتاب نزہۃ المناظر و نفائس الذاخر ہے علاوہ فقہا اصفہان میں ممتاز مرتبہ
کی شخصیت ہے۔ نظام الملک نے اس کو مدرسہ نظامیہ اصفہان میں
مدرس مقرر کیا۔ اس کے علم و فضل کا اندازہ اس کے شاگردوں کے علم و
فضل سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک ابو عبداللہ بن ابو سعد (متوفی
۵۲۵ھ) رے، کا رہنے والا تھا، دوسرا ابو علی اصفہانی حسن بن سلمان
بن عبداللہ بن فتی نہروانی (متوفی ۵۲۵ھ) ہے اس نے کچھ عرصہ نظامیہ
بغداد میں بھی تدریس کی ہے (طبقات شافعیہ میں سلمان کی جگہ سلیمان
باپ کا نام لکھا ہے) اس نے دس مجلدات میں کتاب "القانون فی اللغۃ"
اور ایک تفسیر بھی لکھی۔ نظامیہ اصفہان میں اسی کا درس ابو سعد احمد
بن محمد بن ثابت بن حسن بن علی خجندی پسر ابو بکر خجندی مذکور دیا کرتا جو ۵۲۱ھ
میں فوت ہوا۔ اس نے اپنے باپ ابو بکر سے تحصیل علم کی، تیسرا
صدرالدین ابو بکر محمد بن عبداللطیف بن محمد بن ثابت خجندی دربار سلطانی
اور خلیفہ وقت کا مقرب تھا۔ مدرسہ نظامیہ بغداد میں بھی مدرس رہا
۲۲ شوال ۵۵۲ھ میں بغداد سے اصفہان کی طرف آتا ہوا ہمدان و کرج
کے درمیان اثناء سفر میں فوت ہوا۔ ابن اثیر نے اس کا تذکرہ کیا
ہے۔ چوتھا ابوالقاسم صدرالدین عبداللطیف بن محمد بن عبداللطیف بن محمد
بن ثابت خجندی فقیہ ادیب و شاعر تھا۔ جب ۵۲۵ھ میں پیدا ہوا اور

جمادی الاول ۵۸۰ھ میں فوت ہوا۔ پانچواں محمد بن عبداللطیف بن محمد بن عبداللطیف بن محمد بن ثابت خجندی ابو بکر خجندی کا پوتا اوقاف نظامیہ بغداد میں نظارت کے عہدہ پر فائز رہا۔ ہم نے صرف ایک ہی خاندان کا ذکر خیر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی علماء فضلا نظامیہ اصفہان سے وابستہ تھے۔

نظامیہ نیشاپور

اس مدرسہ کا انتظام اور درس و تدریس خواجہ نظام الملک نے امام الحرمین ابوالمعالی جوینی کے سپرد کر رکھا تھا۔ یہ امام غزالی کا استاد ہے غزالی کے ہمدرس ابو نصر عبدالرحمٰن بن ابوبکر احمد سراج (ولادت ۴۲۲ھ وفات ۵۰۱ھ) ابوالحسن کیا ہراسی (متوفی ۵۰۴ھ) تھے۔

نظامیہ بغداد

تمام مدارس نظامیہ میں مدرسہ بغداد سب سے بڑھ کر پایہ کا تھا۔ اس مدرسہ کا سنگ بنیاد ذوالحجہ ۴۵۷ھ میں رکھا گیا۔ دو سال کے عرصہ میں عمارت مدرسہ مکمل ہوئی۔ اور روز شنبہ دہم ذی القعدہ ۴۵۹ھ میں رسم افتتاح ادا کی گئی۔ ابن خلکان "وفیات" میں اس کا ذکر مفصل کرتا ہے۔ رسم افتتاح کے وقت خواجہ نظام الملک کی دعوت پر علماء، اعیان مملکت جمع تھے۔ ابو سعید احمد بن محمد نیشاپوری صوفی کے زیر اہتمام عمارت مدرسہ مکمل ہوئی۔ اور مدرسہ کی تولیت شیخ ابو منصور بن یوسف کو تفویض ہوئی۔ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں مدرسہ نظامیہ کو دیکھا تھا اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کرتا ہے

کر خواجہ نے دو لاکھ دینار اس مدرسہ کی عمارت پر صرف کیے - اور پندرہ ہزار سالانہ شاگردوں کے نفقہ کے لیے خاص تھا - اور چھ ہزار طالب علم بیک وقت علوم فقہ و حدیث و ادب وغیرہ کی تحصیل میں لگے ہوئے تھے۔ اور بے بضاعت شاگردوں کو کتابیں اور دیگر ضروریات کے مصارف بھی ملتے تھے۔ خازن دارالکتب کا ماہانہ دس دینار مقرر تھے اسی پر دوسرے ملازمین کی تنخواہوں کا اندازہ ہو سکتا ہے پھر تو یہ ہے تعلیم قریب مفت تھی اگر ہم اپنے زمانے سے اس کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حکومت کی بے توجہی سے تعلیم اتنی مہنگی ہے کہ ایک متوسط الحال خاندان تعلیم سے محروم ہے - اس لیے اکثریت جاہل ہے، اور عام جہالت کا نتیجہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں فتنہ و فساد اور جرائم کی کثرت ہے -

مدرسہ نظامیہ بغداد کا نظم و نسق خواجہ نظام الملک نے براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ ایک مدرس اعلیٰ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزی شیخ سعدیؒ وغیرہ کا استاد ہے۔ اس خاندان کے چند افراد کا نام حسب ذیل ہے -

۱۔ جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن ابوالحسن علی بن محمد بن جوزی - حنبلی مذہب کے بلند پایہ فقہا میں سے ہے مورخ اور مشہور حافظ عصر تھا - اکثر کتابوں کا مصنف ہے۔ تاریخ میں اس کی کتاب المنتظم فی تاریخ الامم، اور شذور العقود فی تاریخ العہود، ہے -

۲ - محی الدین ابو محمد یوسف بن عبدالرحمٰن بن جوزی محتسب بغداد اور مدرس مدرسہ مستنصریہ تھا۔ بغداد کے مدارس کا اکرم نے اپنی

کتاب "بغداد" میں کیا ہے۔ ان میں سے ایک مدرسہ مستنصریہ خلیفہ عباسی باللہ مستنصر سے منسوب تھا۔ محی الدین خلیفہ کا مقرب بھی تھا اور سفارت پر بھی کبھی کبھی جایا کرتا اور اس سلاطین اور ملوک سے بھی اس کا واسطہ تھا۔ شب شنبہ ذی القعدہ ۵۸۰ھ میں پیدا ہوا اور محرم ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں کے قتل عام میں مارا گیا۔

۳۔ شرف الدین عبداللہ
۴۔ تاج الدین عبدالکریم } یہ دونوں بھائی محی الدین مذکور کے تھے اور تینوں بھائی بیک وقت بغداد میں مقتول ہوئے۔

۵۔ جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن بن یوسف بن جوزی محی الدین مذکور کا بیٹا ہے۔ جب کبھی باپ سفارت کے ضمن میں باہر جاتا یہ مدرسہ مستنصریہ میں باپ کی جگہ درس دیتا۔ یہ بھی باپ کے ساتھ ہی فتنہ مغول میں قتل ہوا۔ یہ اپنے جد کی طرح واعظ وغیرہ بھی تھا۔ اس کی مجلس وعظ میں سامعین پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا۔ شیخ سعدیؒ نے گلستان میں اسی ابن جوزی کا ذکر کیا ہے کہ "چنانکہ مرا شیخ اجل ابوالفرج بن جوزی بترک سماع می گفت الخ" یہی ابن جوزی ہے اسی کے زمانہ میں شیخ سعدی کا مقام بغداد میں تھا۔

۶۔ شمس الدین ابوالمظفر یوسف بن قزغلی المعروف بہ سبط ابن جوزی ساتویں ہجری کا مشہور مؤرخ ہے۔ اسی کی تاریخ "مرآۃ الزمان" کا قلمی نسخہ مؤلف کا دستخطی ابن خلکان نے دیکھا تھا۔ یہ بزرگ بخلاف دیگر بزرگان خانوادہ حنفی تھا ۵۸۲ھ میں پیدا ہوا اور وفات شب

سہ شنبہ ۱۲ ذالحجہ ۵۲۰ھ میں واقع ہوئی۔
اس خاندان کے حالات ابن خلکان اور ابن اثیر نے کامل میں اور دیگر مورخین نے لکھے ہیں۔
۵۶۰ھ میں بازار نظامیہ میں آگ لگ گئی۔ اور عمارت مدرسہ کو بھی بہت نقصان پہنچا، اکثر لوگ ہلاک ہوئے۔ عطا محمد جوینی نے اوقاف مدرسہ کی محاصل سے مدرسہ کی عمارت از سر نو درست کر دی۔ ۶۷۱ھ میں شرف الدین ہارون شمس الدین صاحب دیوان جوینی نے مدرسہ میں سلسلہ تدریس جاری رکھا۔ آٹھویں صدی ہجری تک مشہور سیاح ابن بطوطہ بغداد میں آیا۔ اپنے سفر نامہ میں بغداد اور مدرسہ نظامیہ کی تعریف میں رطب اللسان ہے کہ دنیا میں اس کا مثل نہیں۔

مدرسین نظامیہ بغداد

خواجہ نظام الملک کو ابو اسحاق شیرازی سے بہت عقیدت تھی، آپ ان ایام میں علمائے شافعیہ میں ممتاز تھے۔ خواجہ کی خواہش تھی کہ آپ ہی مدرس اعلیٰ ہوں۔ افتتاح کے دن شیخ مدرسہ کی طرف آرہے تھے کہ ایک لڑکا سر بازار راستہ روک کر کہنے لگا: "یا شیخ کیا آپ مدرسہ میں درس دیں گے جس کی عمارت لوگوں کے خون سے بنی ہے" یہ سنا شیخ صاحب لوٹے اور خواجہ سے معذرت کے کے بعد کہا کہ کسی اور کو یہ منصب دیں۔ خواجہ نے سر دست ابونصر بن صباغ کو اولیں مدرس نظامیہ مقرر کیا۔ ابونصر صرف بیس لعد مدرس رہا، اس عرصہ میں خواجہ نے شیخ ابو اسحاق کو راضی کر لیا

مگر آپ نے مدرسہ کی عمارت میں قدم نہ رکھا، ایک چھوٹی سی مسجد قریب ہی تھی یہاں بیٹھ کر طالبان علم کو درس دیا کرتے۔ شیخ ابو اسحاق ۴۵۹ھ سے ۴۷۶ھ تک یعنی وفات تک مدرس رہے۔ سبحان اللہ جب مدرس تقویٰ کے ایسے بلند مقام پر ہوں تو شاگردان کی صحبت میں کس حد تک فیض یاب ہوئے ہوں گے۔

تین سال یعنی ۴۷۹ھ تک ابو نصر بن صباغ اور شیخ ابو سعید یکے بعد دیگرے مدرس رہے ان کے بعد شیخ ابو القاسم دبوسی سال وفات یعنی ۴۸۲ھ تک مدرس اعلیٰ کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ان کے بعد حسین بن علی طبری مولف کتاب "عمدہ" مدرس مقرر ہوئے ان کا شریک کار ابو محمد فضل شیرازی تھا۔ ان کا دور بھی ۴۸۳ھ میں ختم ہوا۔ ان کے بعد امام محمد غزالی جمادی الاول ۴۸۴ھ میں کرسی تدریس پر متمکن ہوئے۔ مگر آپ نے چار سال بعد مدرسہ نظامیہ اور بغداد کو چھوڑا۔ آپ کا بھائی امام احمد غزالی آپ کی جگہ مسند ارشاد پر بیٹھا۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کی مکمل تاریخ لکھی گئی ہے۔ مدرسین کی فہرست طویل ہے اور اس مدرسہ کے حالات کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق امام غزالی رح تک ہے

ہمعصر حکماء و مشائخ صوفیہ

ہم ذیل میں ان اشخاص کے نام لکھتے ہیں جو امام غزالی کے ہمعصر حکما و مشائخ صوفیہ میں سے تھے یہ شخصیتیں مشاہیر اسلام میں

شمار ہوتی ہیں۔ اور تاریخ سلجوقیہ عماد کاتب اور تاریخ الحکما و شہرزوری و یافعی و طبقات شافعیہ و طرائق الحقائق و وفیات ابن خلکان و کامل ابن اثیر وغیرہ میں ان کا تذکرہ ہے۔ ان مشاہیر کے تذکرہ سے ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ امام محمد غزالی کے زمانہ کی اعلیٰ ذہنیت کا اندازہ ہو سکے، اور یہ کہ امام صاحب کا مرتبہ اپنے معاصرین میں کیا ہے؟

۱۔ خواجہ عبداللہ انصاری ہروی، آپ شیخ الاسلام عبداللہ بن محمد بن علی اور بالاختصار "پیر ہروی" کے نام سے مشہور ہیں۔ مشائخ صوفیہ خراسان میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے، ۴۸۱ھ میں وفات پائی۔

۲۔ خواجہ یوسف ہمدانی، ابو یعقوب یوسف بن ایوب بن یوسف "مرو" کے مشائخ میں سے ہیں، ۹۴ سال کی عمر میں بماہ ربیع الاول ۵۳۵ھ میں وفات پائی۔

۳۔ عین القضاۃ ابوالمعالی عبداللہ بن محمد میانجی ہمدانی امام محمد غزالی کے بھائی امام احمد غزالی کے مرید اور تربیت یافتہ تھے ابوالقاسم وزیر کو امام صاحب سے سخت دشمنی تھی۔ بالآخر بے گناہ مرید کو اسی جرم میں قتل کیا کہ امام محمد غزالی کا طرفدار ہے، یہ واقعہ چہار شنبہ جمادی الآخر ۵۲۵ھ کا ہے۔

۴۔ احمد بن علی بغدادی معروف بہ ابن زہر صوفی متوفی ۴۹۶ھ

۵۔ عبدالواحد بن استاذ ابوالقاسم قشیری متوفی ۴۹۴ھ

۶۔ ابو سعید عبداللہ بن عبدالکریم (۴۱۳ھ تا ۴۷۷ھ)، ابو سعید اور عبدالواحد مذکور ابو نصر عبدالرحیم بن عبدالکریم استاذ ابوالقاسم قشیری کے

خانوادہ سے ہیں۔ ابوالقاسم (وفات ۴۶۵ھ) بن ہوازن مشہور
صوفی بزرگ ہیں مولانا جامی نفحات الانس میں اور اکثر تذکرہ نویس آپ
کے رسالہ "قشیریہ" کا حوالہ دیتے ہیں۔ تصوف میں یہ اعلیٰ پایہ کی کتاب
ہے۔

۷۔ زین الدین عمر بن سہلان ساوی مولف کتاب "بصائر نصیریہ" مشہور
باقامت نیشاپور میں تھی۔ کتابت پر گذر تھی۔ ابوعلی سینا کی کتاب "شفا"
لوگوں کو لکھ کر دیتا۔

۸۔ ابوالعباس لوکری شاگرد بہمنیار بن مرزبان آذربائیجانی اور وہ شاگرد
بوعلی سینا کا یعنی ایک واسطے سے شیخ الرئیس کا شاگرد ہے۔ خراسان
میں فلسفہ کو اسی نے نشر کیا۔

۹۔ ابوحاتم مظفر اسفرائنی۔ یہ شخص عمر خیام کا ہمعصر مشہور ریاضی دان
تھا۔ اس نے حکیم ارشمیدس کا ترازو ایجاد کیا جس سے فلزات اور دیگر اشیا
کے صحیح اوزان معلوم ہو سکتے ہیں۔ ارشمیدس نے معلوم کر لیا تھا کہ پانی
میں ہر ایک چیز کا وزن خاص تناسب سے کم ہو جاتا ہے، ابوحاتم
نے ترازو بنایا اور ہر ایک شے خالص کا وزن دریافت کیا۔

۱۰۔ معدی بیہقی، محمد بن احمد فلسفی اور ریاضی دان عمر خیام کا شریک کار
رصد ملک شاہی میں تھا۔ تاریخ بیہقی میں اس کا مذکور ہے۔ فدائی
جو حسن بن صباح نے تیار کیے تھے اکثر وزرا و امرا انکے ہاتھ سے قتل
ہو چکے تھے معدی ۴۸۵ھ میں مارا گیا۔

۱۱۔ حکیم مکی بن محمد غزنوی منجم، ریاضی اور نجوم میں کامل دستگاہ تھی
سلطان ابراہیم بن مسعود بن سلطان محمود غزنوی کا دبیر تھا۔ تاریخ بیہقی

میں اس کا بھی تذکرہ ہے۔ ۵۲۱ھ میں وفات پائی۔

۱۲۔ حکیم علی بن محمد قاہنی، طبیب اور فلسفی تھا۔ ایک سو سال قمری زندہ رہا۔ ۵۴۶ھ میں فوت ہوا۔

۱۳۔ میمون بن نجیب واسطی، امام غزالی کے عہد کا مشہور طبیب اور فلسفی تھا اس نے عمر خیام کا ہاتھ بھی رصد اور تقویم جلالی میں بٹایا۔ ظہیر الملک علی بیہقی حکران ہرات کا مقرب تھا۔ تاریخ الحکما شہرزوری میں اس کا تذکرہ ہے۔

ہمعصر شعراء فارسی

امام غزالی کا ابتدائی زمانہ حکومت سلجوقیہ سے وابستہ رہا۔ خواجہ نظام الملک آپ کا مربی تھا۔ آپ کی زندگی کا اکثر حصہ اسی دور میں گذرا۔ جب تک خواجہ نظام الملک زندہ رہا شعر و شاعری کا بازار سرد رہا۔ خواجہ کی توجہ زیادہ تر علم و حکمت کے نشر کی طرف رہی شاعری کو وہ محض دماغی تعیش اور غیر مفید سمجھتا تھا۔ ان ایام میں ایک امیر "معزی" شاعر تھا جس کو سلجوقی سلطان ملک شاہ کے دربار تک رسائی تھی اور اس کی بھی یہ حالت تھی کہ نظامی عروضی "چہار مقالہ" میں لکھتا ہے کہ اس کا باپ امیر الشعراء برہانی ملک شاہ کے ابتدائی دور میں فوت ہو گیا۔ مرنے سے پہلے ایک قطعہ کہا اس کا ایک شعر مشہور ہے۔

من رفتم و فرزند من آمد خلف صدق　　　او را بخدا و بخداوند سپردم

ملک شاہ نے امیر معزی کی دستگیری کی مگر حالت یہ تھی کہ کبھی باریابی کا موقعہ ملا کبھی دور ہی سے سلطان کا سلام ہو جاتا نہ کچھ کھانے کو پیٹ بھر ملتا اور نہ پوشش کے لیے کپڑا ہی ایسا تھا کہ

دربار سلطانی کے مناسب ہوتا۔ قرض پر گذارہ تھا مگر تابکے۔
دربار سلوقیہ تو شعر و شاعری کی زینت سے بے نیاز تھا مگر ہمسایہ ممالک اسلامیہ غزنویہ و خضر خانیہ۔ سلاجقہ کرماں وغیرہ میں اس کا کچھ چرچا تھا۔ اگرچہ امام غزالی کو ادب فارسی پر پورا عبور تھا مگر شعر و شاعری سے سروکار نہ تھا۔ ملک شاہ کے بعد دربار سنجر سلوقی اور بہرام شاہ غزنوی کے دربار میں شاعری زندہ ہوئی۔ امیر صاحب کے ہمعصر شعرا میں سے بعض سے مراسم دوستانہ امام صاحب کے بھی تھے، ان میں سے ایک حکیم عمر خیام ہے جو مشاہیر اسلام میں شمار ہوتا ہے اور اس کی شہرت محتاج تعارف نہیں۔ اس کی رباعیات فارسی کا ترجمہ یورپ کی علمی زبانوں میں ہو چکا ہے یہ ممتاز شخصیت ملک شاہ کے دربار میں بحیثیت شاعر وارد نہیں ہوئی تھی۔ یہ اعلیٰ پایہ کا شاعر اور ادیب اور فلسفی اور ریاضی دان اور علم ہیئت میں ماہر تھا۔ اس نے "رصدگاہ" تیار کی اور "تقویم جلالی" مدون کی، لیکن تعجب ہے کہ آج اس کا نام بحیثیت شاعر ہی زندہ ہے۔ پروفیسر براؤن ادبیات ایران کی تاریخ میں حکیم شفائی کے تذکرہ کے ضمن میں لکھتا ہے کہ شاعری شفائی کیلئے موجب فخر نہ تھی مگر شفائی کو اگر کوئی جانتا ہے تو صرف شاعری کی وجہ سے، اور اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو اس کا نام بحیثیت حکیم صرف تذکروں کے کسی گوشہ میں رہتا۔

امام محمد غزالی کی ملاقات گاہے گاہے حکیم خیام سے ہوتی۔ اور مسائل حکمت پر بحث بھی رہتی۔ ایک دفعہ امام صاحب نے حکیم سے

دریافت کیا کہ اس کا سبب کیا ہے کہ اجزاء فلک سے ایک نقطہ معین قطب کا ہی ہے حالانکہ تمام فیلسوف اس بات پر متفق ہیں کہ افلاک کے اجرام متشابہ ہیں۔ عالم تکوین میں ترجیح بلا مرجح محال ہے، اس لیے قطب کیوں اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ حکیم صاحب چکرائے اور گردش اجرام سماوی کے حالات بطور مقدمات بیان کرنے لگے اور لمبی چوڑی تشریح میں کھو گئے۔ کہ اتنے میں قریب کی مسجد سے موذن نے اذان دی، امام صاحب نے کہا کہ

جاء الحق وزھق الباطل

(حق آیا اور باطل نفرد ہو گیا)

اُٹھے اور مسجد کی طرف رُخ کیا۔

ایک اور شاعر مسعود سعد سلمان امام صاحب کا ہمعصر تھا۔ یہ فخر پنجاب کے صدر مقام لاہور کے لیے ہے کہ اس مشہور شاعر کی پیدائش اس شہر میں ۴۳۹ھ میں واقع ہوئی۔ لیکن اصل اس کی ہمدان ہے۔ اس کا تذکرہ ہفت اقلیم اور ریاض الشعرا وغیرہ میں مفصل ہے۔

عثمان بن محمد مختاری غزنوی ارسلان شاہ بن مسعود بن ابراہیم غزنوی (۵۱۱ھ۔ ۵۰۹ھ) کا درباری شاعر ہے۔ اس کے مرتبہ کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حکیم سنائی غزنوی بھی اس کی تعریف کرتا ہے، اسی کا ہمعصر جس سے اس کا مناظرہ ادبی بھی رہا، رشیدی ہے۔ رشیدی ظہیر الدولہ بن ابراہیم بن مسعود غزنوی کا درباری تھا۔

امیر معزی نیشاپوری عہد ملک شاہ "سلجوقی" میں مشہور ہوا ہے، امام غزالی نے بھی اس کی ملاقات تھی، ۵۴۲ھ میں قزوین میں فوت ہوا۔

ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی غزنوی ہے وہ بلند مرتبہ شخصیت ہے کہ مولانا رومی اس کے مداح ہیں، حکیم سنائی کی مشہور کتاب "حدیقہ" کا ایک نمونہ مولانا رومی کے سامنے تھا جس پر آپ نے "مثنوی معنوی" لکھی، فرماتے ہیں :-

نیم جوشی کردہ ام من نیم خام ۔۔۔ از حکیم غزنوی بشنو تمام

جمعہ یک شنبہ ۱۱ شعبان ۵۲۵ھ رحلت فرمائی۔

ناصر خسرو، علوی متخلص بہ "حجت" ایران کے فلسفیوں اور شعرا میں سے ہے، اس کا "سفر نامہ" اور "زادالمسافرین" مشہور کتابوں میں۔ اسماعیلیہ فاطمیہ کے بارہ داعیوں میں سے ایک ہے ان کو حجت کہتے تھے۔ ذی قعدہ ۳۹۴ھ میں پیدائش اور ۴۸۱ھ میں وفات واقع ہوئی۔ ناصر خسرو نے اپنے "سفر نامہ" میں اپنے ایک ہمعصر شاعر "قطران آذر بائیجانی" کا بھی ذکر کیا ہے۔ دونوں کی ملاقات "تبریز" میں ہوئی تھی۔

ان شعرا کے علاوہ امام صاحب کے معاصرین شعرا فرغانی اور "عمعق بخاری" (متوفی ۵۴۳ھ) رشیدی سمرقندی بھی ہیں۔ "عمعق" امیر الشعرا اور رشیدی سید الشعرا کے لقب سے مشہور ہیں، دونوں خضر خاں بن طفغاج خاں ابراہیم ملوک خانیہ ماوراءالنہر کے درباری شاعر تھے۔ ایک روز خضر خاں نے رشیدی کی عدم حاضری میں عمعق

بخاری سے دریافت کیا کہ رشیدی کے کلام کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ جواب دیا کہ شعر تو اچھے کہتا ہے مگر ان میں نمک کی چاشنی نہیں، چند روز کے بعد رشیدی خضر خاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو خضر خاں نے باتوں باتوں میں کہا کہ میں نے عمعق سے تمہاری شاعری کے بارہ میں رائے دریافت کی تھی کہا کہ شعر اچھے کہتا ہے مگر بے نمک ہیں۔ رشیدی نے اسی وقت ایک قطعہ لکھ کر خضر خاں کو دیا کہ عمعق کو میری طرف سے جواب دیں۔

شعرہائی مرا بہ بے نمکی
عیب کردی روا بود شاید

شعر من ہمچو شکر و شہد است
و ندریں دو نمک نکو ناید

شلغم و باقلیت گفتہ تو
نمک اے قلتبان ترا باید

ان شعرا کے علاوہ ابوالفرج رونی، اور ابو طاہر خاتونی مؤلف کتاب مناقب الشعراء اور تاریخ آل سلجوق، اور لامعی جرجانی اور ابوالمعالی اور شہابی سمرقندی اور اسدی طوسی مؤلف گرشاسب نامہ، وغیرہ امام صاحب کے ہمعصر شعرا تھے، اسدی طوسی، فردوسی مؤلف شاہنامہ کا استاد ہے۔

ہمعصر سلاطین و وزرا و امراء

لفظ "سلطان" ایک خطاب ہے جو خلفائے عباسیہ کی طرف سے ان اشخاص کو عطا ہوتا رہا جو مملکت عباسیہ کے کسی حصے پر بطور نائب السلطنت یا ہماری زبان میں صوبہ دار مقرر ہوتے یا وہ خود ہی کسی حصہ ملک کو بزور بازو دبا بیٹھتے مگر یہ عام عقیدہ تھا کہ سلطنت

اور حکومت کا حق مسلمانوں میں صرف قریش کو حاصل ہے۔ اس لیے مسلمان
خواہ مجبوراً کسی غیر قریش کی حکومت عملاً تسلیم بھی کر لیتے اعتقاداً اسے
جائز حکمران نہ سمجھتے۔ جب تک خلیفہ وقت اس کے تقرر کی تصدیق
اور توثیق نہ کرتا اس طرح ہر ایک سلطان گو خود مختار ہی تھا لیکن
کسی نہ کسی طرح خلیفہ وقت کی سند حاصل کرتا۔ ہمارے ہندوستان
کے مغلیہ شہنشاہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر نے بھی یہ سند حاصل
کی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے بغیر بھی شہنشاہ ہی تھے اور ان کے
بزرگ بے سند بھی شہنشاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر قریش
صاحبان حکومت کو خلیفہ نہیں سلطان کہتے ہیں۔ سب سے پہلے
جس نے اس رسم کو توڑا وہ ترکی سلطان سلیم تھا۔ لیکن سلطان ان
کو بھی سلاطین روم و شام ہی کہتے ہیں۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو خلافت
قریش خلفاء عباسیہ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ مگر جسے حدیث
نبوی "الائمۃ من القریش"۔ قرار دے کر غیر قریش کو سلاطین کہا جاتا
ہے اگر صحیح بھی ہو تو اس کا مفہوم واضح ہے کہ جب تک قریش
خلافت کے اہل تھے، حکومت ان کے قبضہ میں رہی۔ اس کے بعد
ترکوں اور دیگر مسلمان اقوام میں منتقل ہو گئی۔ اگر امامت اور خلافت
ایک ہی شے ہے تو اس پر بحث تحصیل حاصل ہے۔ دیکھنا یہ
ہے کہ عملاً کیا ہوا۔ غیر قریش بھی بڑے پایہ کے علماء دین گذرے
ہیں بلکہ بقول علامہ ابن خلدون ہر ایک علم و فن کے مستند استاد
عجمی ہی تھے بلکہ لونڈیوں کی اولاد تھے۔ بہرحال چونکہ یہ لقب اعتقاداً
معراج پا گیا ہم بھی انہیں سلاطین کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔

امام صاحب کا تعلق خاندان سلجوقیہ کے تاجداران ملک شاہ اور محمد بن ملک شاہ اور سلطان سنجر سے بالخصوص رہا اور وہ بھی آپ کا حسب احترام اور عزت کرتے رہے۔ امام صاحب نے ان کی ہدایت کے لیے مکتوب لکھے۔ بغداد میں خلفاء عباسیہ سے بھی ایسا تعلق قائم رہا امام صاحب کے وقت سلجوقی سلطان قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رکن الدین بن ابوطالب طغرل بیگ (سنہ ۴۲۹-۵۵ھ)

۲۔ عضدالدین بن ابو شجاع الپ ارسلان (سنہ ۴۵۵-۶۵ھ)

۳۔ جلال الدین ابوالفتح ملک شاہ بن الپ ارسلان (سنہ ۴۶۵-۸۵ھ)

۴۔ ناصرالدین محمود بن ملک شاہ (سنہ ۴۸۵-۸۶ھ)

۵۔ رکن الدین بن ابوالمظفر (سنہ ۴۸۶-۹۸ھ)

۶۔ غیاث الدین ابو شجاع محمد بن ملک شاہ (سنہ ۴۹۸-۵۱۱ھ)

۷۔ معزالدین ابوالحارث سنجر بن ملک شاہ (سنہ ۴۹۰-۵۵۲ھ)

۸۔ محمود بن محمد بن ملک شاہ بن الپ ارسلان (سنہ ۵۱۲-۵۲۵ھ)

۹۔ طغرل دوم بن محمد بن ملک شاہ (سنہ ۵۲۵-۲۹ھ)

یہاں تک یہ سلاطین امام صاحب کے ہمعصر تھے۔ اس خاندان کے دیگر سلاطین حسب ذیل ہیں۔

۱۰۔ مسعود بن محمد بن ملک شاہ (سنہ ۵۲۹-۴۷ھ)

۱۱۔ مغیث الدین بن ملک شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ (سنہ ۵۴۷ھ)

۱۲۔ غیاث الدین محمد بن محمود بن محمد بن ملک شاہ (سنہ ۵۴۷-۵۴ھ)

۱۳۔ سلیمان شاہ بن محمد بن ملک شاہ (سنہ ۵۵۴-۵۶ھ)

۱۴۔ ارسلان بن طغرل بن محمد بن ملک شاہ (سنہ ۵۵۶-۷۱ھ)

۱۵ - طغرل سوم بن ارسلان بن طغرل (۵۷۱-۵۹۰ھ)

یہ آخری سلطان تکش خوارزم شاہ کے مقابلہ میں مارا اور خاندان سلجوقیہ ایرانیہ کا اس کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔

ہمعصر خلفاءِ عباسیہ

۱ - عبداللہ القائم بامر اللہ (۴۲۲-۴۶۷ھ)
۲ - عبداللہ المقتدی بامر اللہ (۴۶۷-۴۸۷ھ)
۳ - احمد المستظہر باللہ (۴۸۷-۵۱۲ھ)

ہمعصر خلفاءِ فاطمیہ

۱ - المستنصر باللہ ابو تمیم معد بن الظاہر (۴۲۷-۴۸۷ھ)
۲ - المستعلی باللہ ابو القاسم احمد بن مستنصر (۴۸۷-۴۹۵ھ)
۳ - الآمر باحکام اللہ ابو علی منصور بن مستعلی (۴۹۵-۵۲۴ھ)

ہمعصر سلاطین غزنویہ

۱ - ابوالمظفر ظہیر الدولہ رضی الدین ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی (۴۵۱-۴۹۲ھ)
۲ - علاء الدولہ سلطان مسعود بن ابراہیم بن مسعود (۴۹۲-۵۰۸ھ)

سلاطین خانیہ ماوراء النہر

سلاطین خانیہ کو مختصر خانیہ اور خاقانیان ماوراء النہر بھی کہتے ہیں۔ ہمعصر حسب ذیل تھے۔

۱۔ سلطان خضر خاں بن طفغاج خاں ابراہیم (۸۸-۴۸۲ھ)
۲۔ بغرا طفغاج خاں مسعود (۴۸۸-۴۹۲ھ)
۳۔ ارسلان خاں محمد بن سلیمان بن داؤد (۴۹۵-۵۲۴ھ)

ہمعصر سلجوقی کرمانی

۱۔ علاؤالدین بن قرا ارسلان قاورد بیگ بن جعفر بیگ (۴۳۳-۶۵ھ)
۲۔ کرمان شاہ بن قاورد (۴۶۵-۶۶ھ)
۳۔ رکن الدین سلطان شاہ (۴۶۶-۷۷ھ)
۴۔ توران شاہ (۴۷۷ھ)
۵۔ ایران شاہ (۴۹۰-۹۴ھ)

ہمعصر وزرا و امرا

۱۔ عمیدالملک کندری ابونصر محمد بن منصور وزیر الپ ارسلان تھا۔ ۴۵۶ھ میں معزول ہو کر مارا گیا اور وزارت خواجہ نظام الملک طوسی کو ملی۔ عماد کاتب تاریخ سلجوق میں لکھتا ہے کہ عمیدالملک اولین وزیر دولت سلجوقیہ تھا۔

۲۔ ابوعلی قوام الدین حسن بن علی بن اسحاق الملقب بہ خواجہ نظام الملک طوسی مشاہیر اسلام میں شمار ہوتا ہے صرف دس سال الپ ارسلان کا اور بیس سال ملک شاہ کا وزیر رہا۔ بروز جمعہ ۲۱ ذی القعدہ ۴۰۸ھ میں پیدائش واقع ہوئی اور ماہ رمضان ۴۸۵ھ میں فدائیان حسن بن صباح کے ہاتھ سے مارا گیا

۳- تاج الملک ابوالغنائم مرزبان بن خسرو فیروز معروف بہ ابن دار خواجہ نظام الملک کے بعد وزیر ملک شاہ ہوا۔ غلامان خواجہ نظام الملک کے ہاتھ سے چند ماہ بعد محرم ۴۸۶ھ میں مارا گیا۔

۴- مجد الملک ابوالفضل قمی وزیر برکیارق تھا۔ امرائے دربار نے بادشاہ کی موجودگی میں ۴۹۲ھ میں قتل کر کے ریزہ ریزہ کر دیا۔ امام صاحب نے ایک مکتوب میں جو فخر الملک کے نام لکھا مجد الملک اور تاج الملک کا نام بھی یاد کیا ہے۔

۵- مؤید الملک ابوبکر عبید اللہ بن خواجہ نظام الملک بھی ۴۸۷ھ میں برکیارق کا وزیر مقرر ہوا۔ ایک لڑائی جو سلطان برکیارق اور سلطان محمد بن ہمدان میں ہوئی مارا گیا۔

۶- فخر الملک مظفر بن خواجہ نظام الملک ۴۸۸ھ میں وزیر برکیارق مقرر ہوا۔ اور ۴۹۰ھ تک سلطان سنجر کا وزیر رہا بروز عاشورا ۵۰۰ھ مارا گیا۔

۷- صدر الدین ابو اسحاق محمد بن فخر الملک بن نظام الملک باپ کے قتل کے بعد وزیر سلطان سنجر ہوا ۵۱۱ھ میں بلخ میں قتل کیا گیا۔

امام صاحب کا تعلق خاندان خواجہ نظام الملک سے ہمیشہ رہا۔ صدر الدین اور اس کا باپ فخر الملک آپ کا احترام اس حد تک کرتے رہے کہ یہ بات کسی اور عالم دین کو ان ایام میں میسر نہ تھی۔ اور فخر الملک ہی نے آپ کو نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں سلسلہ درس جاری رکھنے پر مجبور کیا۔ امام صاحب نے جو مکتوبات ان وزراء کو لکھے وہ اب بھی محفوظ ہیں۔

صدرالدین کی وفات کے بعد خواجہ نظام الملک کے برادرزادہ ابوالحسن شہاب الاسلام عبدالرزاق سنجر کا وزیر مقرر ہوا۔ عبدالرزاق کا باپ عبداللہ بن علی بن اسحاق فقیہ اجل تھا اور امیر معزی شاعر کا ممدوح ہے۔
ان وزرا کے علاوہ اور بھی ہیں اور اگرچہ ہر ایک یگانہ روز گار تھا مگر جہاں تک امام صاحب کا تعلق ہے انہی وزرا مذکورہ کا نام تذکروں اور تواریخ میں لیا گیا ہے۔ اکثر امرا و وزرا کو آپ نے اپنے مکتوبات میں مخاطب کیا ہے۔

عہد امام محمدؒ غزالی

امام صاحب کا زمانہ چند خصوصیات کی وجہ سے تاریخ اسلام میں نمایاں امتیاز رکھتا ہے، ان ایام میں ہر ایک علم و فن کے علماء و حکماء کثرت سے پیدا ہوئے اور علم و حکمت کی اشاعت کی طرف سلاطین اور وزرا کی توجہ بھی زیادہ تر رہی چنانچہ مدارس ملک کے طول و عرض میں عام تھے۔ ان میں سے مدارس نظامیہ کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ تالیف و تصنیف بھی بالخصوص فقہ و اصول و حدیث کلام و حکمت علیٰ زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ مذہب اہل سنت والجماعت کی اشاعت بھی بہ نسبت دیگر مذاہب زور پر تھی۔ تمام سلاطین اور ان کے وزرا اور خلفاء عباسیہ سنی تھے۔ حکومت کی سرپرستی میں علم و حکمت و مذہب تسنن کی اشاعت خاطر خواہ ہوئی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تسنن شروع سے مانج الوقت ملک مذہبی تھا۔ لیکن زیادہ تر سیاسیات کی وجہ سے تفریق بعد میں پیدا ہوئی گئی۔ ہم نے اپنی کتاب "مذاہب اسلامیہ

میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اس لیے اس مقام پر اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ حوہری صدی ہجری میں جو خارجی تاثرات کارفرما تھے ان میں سے سیاسیات کے علاوہ حکمت یا فلسفہ ایرانی و یونانی بھی تھا جس کی وجہ سے اختلاف سنی و شیعہ و معتزلی و اشعری وامی وغیرہ پیدا ہوا۔ امام صاحب ان اختلاف مذاہب سے خوب واقف تھے۔ لیکن اس کے عنصر کو سیاسیات تک محدود سمجھتے رہے، اور ان کو نظر انداز کیا۔ امام صاحب کی بالغ نظری نے بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں میں عام اختلاف اصول میں نہیں فروع میں ہے، اور ان میں سے اکثر جزو دین بھی نہیں۔ یہ اختلاف اور اس کی شدت علم و حکمت کی اشاعت کے ساتھ کم ہوتی جائے گی اور چنداں مضر بھی نہیں۔ لیکن حقیقی خطرہ دین اسلام کو فلسفہ نظریہ یونان و ایران کی طرف سے ہے اس لیے امام صاحب کی توجہ تمامتر اسی کے سدباب کی طرف مبذول رہی، اور آپ نے نہایت کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اس لیے آپ کا لقب "حجۃ اسلام" دنیائے اسلام میں آج تک مشہور ہے۔

ان ایام میں جملہ مسلمانوں کے مختلف فرقے مجادلہ و مباحثہ میں مصروف تھے۔ فن خطابت اور جدل اور خلاف بھی اختراع ہوا۔ اس فن پر کتابیں بھی تصنیف ہوئیں اور امام صاحب کی تصانیف میں بھی اصول مجادلہ کا مذکور ہے۔ اس میں امام صاحب کے متقدمین اور بالخصوص ہمعصر علماء امام الحرمین ابوالمعالی جوینی اور شیخ ابواسحاق شیرازی اولین مدرس اعلےٰ مدرسہ نظامیہ بغداد کی تصانیف مشہور

ہیں۔ ان میں ان مناظرات کی مفصل تاریخ مذکور ہے جو ان حضرات اور دیگر علماء کو اپنے معاصرین علماء سے پیش آئے بالخصوص جامع منصور خلیفہ عباسی میں مناظرہ قاضی ابوالطیب و ابوالحسن طالقانی اور مناظرہ ابواسحاق شیرازی و ابوعبداللہ دامغانی اور مناظرہ ابواسحاق و ابوالمعالی جوینی نیشاپور میں اور مناظرہ ابواسحاق اسفرایینی و قاضی عبدالجبار معتزلی اور مناظرہ قاضی عبدالطیب و ابوالحسن حنفی وغیرہم۔ شیخ ابواسحاق شیرازی مدرس نظامیہ کے بارہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ مسائل خلاف اس کو اس طرح ازبر تھے جس طرح ملاؤں کو سورہ فاتحہ حفظ ہے۔ فن خلاف فن مجادلہ کا ایک شعبہ ہے، "فن جدل" منطق کی پانچ صنعتوں "برہان" اور "خطابہ" اور "شعر" اور "جدل" "مغالطہ" میں سے ایک ہے۔ یہ فن امام صاحب کے زمانہ میں اہم خیال کیا جاتا تھا۔ جو شخص اس میں ماہر ہوتا وہ فریق مخالف کو بسہولت نیچا دکھا سکتا تھا۔ ان ایام میں ہر ایک فرقہ کے علماء اپنے معتقدات کی تائید میں اسی فن سے کام لیتے تھے، یہی فن جدل یا مجادلہ فن خلاف و مناظرہ سے موسوم ہوا۔ ارباب جدل و مناظرہ نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ یہ فن ہر ایک علم فقہ و نحو و کلام وغیرہ پر حاوی تھا۔ اور ہر ایک علم پر اسی فن کی مدد سے علماء نے کتابیں لکھیں۔ مثلاً "خلافیات نحو" اس میں کوفہ و بصرہ کے نحویوں کے اختلاف کے وجوہ بیان کیے گئے۔ "خلافیات فقہ" وہ اختلاف حنفی و شافعی یا شیعہ و سنی کے عقاید میں اس کا بیان، اسی طرح "خلافیات کلام" میں اختلاف عقاید و اشاعرہ و معتزلہ وغیرہ کا مذکور ہے۔ فن جدل کو "فن مواضع" بھی کہتے ہیں اس لیے کہ جدل اور

مناظرہ تمام عقاید علمی و مذہبی و غیر مذہبی میں ہوتا ہے اور کسی خاص عقیدہ سے اس کی بحث مختص نہیں ہے۔ لیکن فن خلاف کا عموما موضوع وہ فرعی اختلاف عقاید ہے جو فرقہ شافعیہ و حنفیہ سے تعلق رکھتا ہے بعض علماء شیعہ۔ شیخ طوسی نے "کتاب خلاف" میں اور سید مرتضی علم الہدی نے کتاب انتصار" فن شیعہ اور سنی کے اختلاف عقاید کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے فن خلاف عام ہے لیکن مناظرہ بطریق خاص مجادلہ ہے، علماء اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ کسی موضوع میں تنظرو بحث سے اظہار حقیقت و صواب ہو۔ ہمارے زمانے میں اس کو تنقید، یا نقد و نظر بھی کہتے ہیں۔ لیکن "مجادلہ" کی غرض تو محض اپنی فضیلت اور اور مخاطب کی فضیحت ہی ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے اور ہدایت ہے کہ اگر ضرورۃً مجادلہ کی نوبت آ ہی جائے تو جس کا طریق یہ ہے کہ حکمت اور موعظۃ حسنہ سے کام لو۔

مناظرین دو فریق کسی مسئلہ یا موضوع پر بغرض تحقیق بحث کرتے ہیں اگر سوال و جواب کی صورت میں بحث ہو تو ایک "سائل" اور دوسرا "مجیب" سے موسوم ہوتا دوسری صورتیں بھی ہیں ایک شخص اپنے عقیدہ یا نظریہ کی تائید میں استدلال عقید و تقلید سے کام لیتا ہے اور دوسرا جواب میں ایک تقریر اس کی تردید میں کرتا ہے ایک "مستدل" دوسرا "مانع" سے تعبیر ہوتا ہے۔ اور ایک دوسرے کا "خصم" کہلاتا ہے اس فن کی اصطلاحات بہت ہیں مثلاً "مناقضہ" و "معارضہ" و دوران و دائرہ ملازمہ دلیل و رکن و علت و شرط و لازم و ملزوم و تعلیل و جرح وغیرہ ہم فن جدل امام صاحب کے زمانہ میں مدون ہو چکا تھا۔ اور ہم کہہ چکے

ہیں کہ اسی فن کا حربہ ہر ایک فرقہ اور فرقہ پرست عالم بے تکلف استعمال
کر رہا تھا۔ ابوالمعالی جوینی نے کتاب مغیث الخلق فی اختیار الحق، لکھ کر مذہب
شافعی کو حنفی پر ترجیح دی اور کتاب ■ فن خلاف میں لکھی۔ علامہ
ابواسحاق شیرازی کو غضنفر المناظرہ کہتے۔ ابن صباغ نے یہ فقرہ چسپ
کیا کہ اگر شافعی اور ابوحنیفہ باہم سازگار ہوں تو ابواسحاق کا تمام علم ندارد
ہو جائے۔ ابواسحاق نے اس فقرہ کے جواب میں کتاب مہذب، تالیف کی
ابواسحاق کے علم و فضل کا شہرہ دور دور ہو چکا تھا۔ جب عباسی خلیفہ المقتدی
بامر اللہ (۴۶۷-۴۸۷ھ) نے آپ کو خراسان کی طرف بحیثیت سفیر بھیجا تو
مرد و زن کا ہجوم شہر سے باہر استقبال کے لیے جمع ہو گیا۔ اور اس
کی رکاب کو بوسہ دیتے تھے، اور خچر کے سموں کی خاک تبرکاً یمنًا
اٹھاتے۔

امام محمد غزالی اس فن جدل وغیرہ سے پورے واقف تھے۔ آپ
کی تصانیف سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے ابتدا میں خواہ آپ کی
غرض مجادلہ عقیدہ تزق ( ) ا ہی ہو لیکن جب
آپ قیل و قال مدرسہ سے بیزار ہو گئے۔ اور طلب حق میں نکلے
تو غرض تحقیق کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس لیے آپ لکھتے ہیں کہ مجادلہ
میں جذبہ مخالفت کے تحت ایسی باتوں کی تردید پر بھی اتر آتے ہیں،
جن کی صداقت بداہتاً ثابت شدہ ہے۔ یہ نہایت مذموم طریق مناظرہ
ہے۔ اس لیے امام صاحب کسی متکلم سے مناظرہ پسند نہ فرماتے
جو ہمیشہ عقیدہ کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔

چہ نازی بحرف کساں خامہ وار — حریفے ز تحقیق خود ہم برآر

امام صاحب تقلید کو اگرچہ ایک ناگزیر امر سمجھتے تھے مگر تقلید بر نظر تحقیق اور شے ہے اور تقلید کورانہ اور چیز ہے اس ادعا و جمود تقلید کے امام صاحب سخت مخالف تھے ؎

انکاری غیر باش تصلق ایں است ۔ واگرد بدل دلیل توفیق ایں است
تبعیت خلق از حقت غافل کرد ۔ ترک تقلید گیر تحقیق ایں است

(ذیل)

علاوہ مجادلہ و مباحثہ و مناظرہ علمی و مذہبی امام صاحب کے لئے زمانہ کی چند اور بھی تاریخی خصوصیات ہیں۔ ایک رواج دعوت ”باطنیہ“ ہے۔ باطنیہ یا اسماعلیہ فرقہ شیعہ ہے۔ حضرت امام جعفر صادق تک تو تمام فرقہ شیعہ کا اتفاق ہے۔ مگر آپ کے بعد مسئلہ امامت و خلافت پر ان کا اختلاف بہت ہے۔ باطنیہ یا اسماعلیہ یہ کہتے ہیں کہ امامت کا وراثت حضرت جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو پہنچا ہے شیعہ امامیہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت امام نے اسمٰعیل کو عاق کر دیا تھا اور وہ باپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اور حضرت امام نے اپنا جانشین دوسرے بیٹے موسےٰ کاظم کو نامزد کیا تھا۔ حضرت موسےٰ کاظم کے بعد آپ کی اولاد نسلاً بعد نسلٍ منصب امامت کی مستحق رہی ہے اور اس منصب پر متمکن رہی، فرقہ امامیہ دوازدہ اماماں حضرت علی سے محمد المہدی بن امام عسکری کو اماماں برحق تسلیم کرتے ہیں، یہ سب امام سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ لیکن اسماعیلیہ میدان سیاسیات میں کود پڑے ان کا حریف خلافت عباسیہ تھی۔ جس کا مذہب جماعت و سنت تھا۔ چونکہ وہ خلفاء عباسیہ کے مخالف سیاسی اغراض کی

بنا پر تھے اس لیے مؤرخین نے سمجھا کہ وہ سہرے سے اس مذہب کے مخالف تھے جو خلفاء عباسیہ کا تھا۔ اسماعلیہ سنیوں کے ایسے ہی مخالف تھے جیسے شیعہ امامیہ کے۔ ہم نے باطنیہ کے عقاید پر اپنی کتاب "مذاہب اسلامیہ" میں مفصل بحث کی ہے اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ اس فرقہ کے کئی نام مختلف بلاد اسلامیہ میں مختلف وجوہ پر مشہور تھے ان کو فاطمیہ اور علویہ اور باطنیہ و اسماعلیہ و شیعہ (علی الرغم شیعہ اثنا عشریہ) اور ملاحدہ و کہتے۔ حسن بن صباح انہی کا داعی تھا۔ اور اس کے فدائیوں نے خواجہ نظام الملک اور دیگر وزرا و امرا و بعض سلاطین کو قتل کیا۔ ان کو "حشاشین" بھی کہتے ہیں اور انگریزی میں بھی لفظ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ (ASSOSSIN) ہے جس کے معنی قاتل سفاک ہے۔ حشیش بھنگ کو کہتے ہیں۔ غالباً حسن بن صباح کو اس بوٹی اور اس کے نشہ آور اثر کا علم ہندوستان کے جوگیوں کے ذریعہ ہوا۔ ملتان تک وادی سندھ پر قبضہ مسلمانوں کا خلافت امویہ میں ہو چکا تھا۔ سندھ میں بھنگ آج بھی عام استعمال ہوتی ہے یہی حشیش پلا کر حسن اپنے مریدوں کو وہ سبز باغ دکھاتا کہ وہ اس کے فدائی بن گئے۔ یہ امام غزالی کا ہمعصر تھا۔

تیسری خصوصیت امام صاحب کے زمانہ کی حروب الصلیبیہ ( ) ہیں۔ یورپ کے مورخین کے علاوہ مسلمان مورخین میں سے ابن اثیر نے "کامل" میں اور یافعی نے "مراۃ الجنان" میں اور ذہبی نے "دول الاسلام" میں ان کا تذکرہ مفصل لکھا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع

ہے۔ ادھر جنگ صلیب کا آغاز ہو رہا تھا ادھر امام صاحب اس فتنہ و شر و فساد سے کنارہ کش ریاضت و ذکر و فکر میں مشغول تھے

حروب الصلیبیہ بظاہر مذہبی مگر در اصل سیاسی جنگ نصاریٰ یورپ اور مسلمانان بلاد اسلامیہ میں تھی۔ مگر حقیقی جنگ دینی فلسفہ یونان و اسلام کے درمیان تھی۔ لقول الذکر جنگ میں امام صاحب نے حصہ نہیں لیا مگر آخر الذکر جنگ میں مسلمانوں کی قیادت کی ۔ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند   الفتش را در دلش انداختند

فلسفہ

خلافت راشدہ اور تابعین کا دور اس دماغی تعیش سے مبرا ہے جو دوسری صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوا۔ مسلمان مصر اور شام اور ایران وسط ایشیا اور افغانستان اور بلوچستان اور وادی سندھ تا ملتان مسخر کر چکے تھے خلافت راشدہ کے بعد اموی خلافت خالص عرب حکومت تھی۔ ان کی زندگی سپاہیانہ تھی۔ بلحاظ عقاید موجد تھے، توحید پر پختہ ایمان تھا اور سیدھے سادے ارکان اسلام صلوٰۃ صوم و حج و زکوٰۃ کے سوا اور کچھ ان کے اعمال میں تصنع نظر نہیں آتا تھا۔

جب غیر مسلم اقوام سے ان کا تصادم ہوا۔ اور حکومت ممالک مذکورہ پر بالاستقلال قائم ہوگئی اور امن کا دور شروع ہوا تو ان کی توجہ ان غیر مسلم اقوام کی تہذیب و تمدن و ثقافت کی طرف بھی ہوئی ان میں سے یونانی اور ایرانی اور ہندی فلسفہ قابل ذکر ہے۔ ان تینوں اقوام کا فلسفہ دور اسلامی سے بہت عرصہ پیشتر ایک دوسرے

بہ اثر انداز ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی توجہ بالخصوص یونانی فلسفہ کی طرف ہوئی جس کو افلاطون اور ارسطو مدون کر چکے تھے، اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ یونانی جو خلافت راشدہ کے عہد میں شام و مصر اور عراق کے کچھ حصہ پر مسلط تھے مسیحیت اختیار کر چکے تھے۔ یہ مذہب سینٹ پولوس کی اختراع تھی اور حواریان مسیح کا دین نہ تھا جو غیر بنی اسرائیل میں اشاعت دین جائز نہیں سمجھتے تھے۔ پولوس جو نہ حواری اور نہ حواریوں کی صحبت کا یافتہ تھا بلکہ رسالت دین مسیحی تھا اس نے رومیوں اور یونانیوں میں اس مسیحیت کا پرچار کیا جو بقول فرانسیسی فاضل رینان اس کی اپنی اختراع تھی اور اصطلاح "مسیحیت" بھی اس کی اپنی ایجاد تھی۔ حواری اپنے آپ کو "مومنین" اور "اخوان" ہی کہتے، بہرحال جب مسلمانوں کا تعارف ان سے ہوا تو ان کو اہل کتاب سمجھتے ہوئے حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم کا پیرو یقین کیا، توراۃ و انجیل کا احترام تو واجب ہی تھا ان کے خود ساختہ عقاید کو بھی دین مسیحی کا جزو ہی سمجھا۔ حالانکہ کچھ تو پولوس اور کچھ فلسفہ یونان و روم سے اس کی صورت بہت کچھ مسخ ہو چکی تھی صرف ایک مسیح کا نام تھا جس کی آڑ میں اس کی اشاعت ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے یونانیوں کو اہل کتاب اور نصاریٰ سمجھ کر ان کی طرف بالخصوص زیادہ توجہ مبذول کی، اور ان کے ذریعہ فلسفہ یونان سے بھی واقف ہوئے۔ ایک خرابی یہ ہوئی کہ جس طرح آج ہم یونانی فلسفیوں کی تصانیف سے واقف ہیں ان ایام میں عرب واقف نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود

یونانی اسے فراموش کر چکے تھے۔ پہلی دفعہ ہسپانیہ میں ابن رشد وغیرہ نے ارسطو کی کتب بعد تصحیح عربی میں شائع کیں اور یورپ بھی ان سے روشناس ہوا لیکن بعض علم منطق و ہندسہ وغیرہ رائج ہو چکے تھے اور مسلمان علماء و حکماء ان سے نہ صرف پوری طرح واقف تھے بلکہ اس پر کچھ اضافہ بھی کر رہے تھے۔

جہاں تک خالص فلسفہ کا تعلق ہے یہی جبر دست ہماری بحث کا موضوع ہے۔ جب مسلمان علماء نے ان کا مطالعہ کیا تو مذہب سے الگ ہو کر نہ کیا اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ایک دین اسلام ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا اور ان کی زندگی کا تار پود تھا۔ فلسفہ کی بنا عقلیات پر تھی۔ اور اسلام خود تفکر و تدبر و تفکر کی دعوت دے رہا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے مسلمان علماء نے اپنے عقاید مروجہ کو اسی عقلی فلسفہ کے ترازو میں تولا۔ تو پورے نہ اترے، پہلی غلطی ان سے یہ ہوئی کہ اس فلسفہ کے ترازو کو انہوں نے صحیح تصور کیا۔ امام محمد غزالی نے سب سے پہلے مسلمانوں کو اسی غلطی کی طرف توجہ دلائی لیکن امام صاحب سے پیشتر مسلمانوں میں ایک فلسفی فرقہ "معتزلہ" کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ بلکہ خلفاء عباسیہ میں سے مامون رشید اور آٹھواں خلیفہ معتصم معتزلی تھا۔ جب اس مذہب کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی تو اس کی اشاعت ممالک اسلامی میں خاطر خواہ ہوئی۔ اور یہ مسئلہ حدوث و قدم و خلق قرآن اس حد تک زیر بحث رہا کہ اکثر ائمہ دین مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اور طرح طرح کی عقوبت میں گرفتار ہوئے لیکن جب القادر باللہ عباسی (متوفی ۴۲۲ھ) کی خلافت کا دور آیا تو

انہوں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ خلیفہ کا عقیدہ دوبارہ خلق قرآن معتزلہ کے خلاف تھا۔ اور اس لیے خود اُس نے اس عقیدہ کے رد اور بطلان میں ایک کتاب لکھی۔ اب ردعمل شروع ہوا تو معتزلہ عتاب میں آگئے۔ معتزلہ کے مقابلہ میں علماءِ حدیث تھے اور انہی کی ایک شاخ "اشعری" تھے، یہ لوگ علی بن اسماعیل اشعری کے پیرو تھے، علی ابو موسےٰ اشعری صحابی کی اولاد سے تھا۔ معتزلہ اور اشعریہ بھی فرقہ در فرقہ تقسیم ہو گئے۔ اور ہر ایک فرقہ ایک دوسرے سے مجادلہ میں الجھا ہوا تھا اور جذبہ مخالفت کے تحت ایک دوسرے کی تکفیر کرتا تھا۔

امام صاحب ان تمام فرقوں اور ان عقاید اور ان کے مناظروں سے خوب واقف تھے۔ ابتدا میں خود بھی اشعریہ کی حمایت میں حصہ لیتے رہے۔ آخر ان پر ان مناظروں کی بیہودگی اور فرقہ بندی اور شر انگیز تفرقہ کے اسباب واضح ہوئے تو کنارہ کش ہو گئے یہ مذاہب جو رائج الوقت تھے تو ایک فقہا کے تفقہ کے اختلاف کی وجہ سے ظہور میں آئے لیکن اس میں کچھ قباحت نہ تھی۔ تفقہ عقلی تھا اور اختلاف رائے ناگزیر امر تھا۔ یہ کچھ ایسی بات نہ تھی کہ مسلمان فقہا کے اجتہادات عقلیہ کے اختلاف پر دست و گریبان ہوں، نہ یہ وحی آسمانی تھی کہ جس کے قبول کرنے پر مکلف ہوں ایک فقیہ کا شخصی عقلی اجتہاد ہی تھا۔ اور ہر ایک اہل رائے کا حق تھا کہ اس کی تائید یا تردید کرے یا اپنا اجتہاد پیش کرے۔

چہ خوش است گر محک تجربہ آید بمیاں	تا سیہ روئے شود ہر کہ درو غش باشد

امام صاحب خود مجتہد تھے اور آپ نے تحقیق کے بعد معلوم کر
لیا کہ تفرقہ اور فرقہ بندی کے اسباب میں سے ایک تو یہی اجتہادات
فقہا کا اختلاف ہے۔ یہ دو قسم کا تھا ایک عقلی اور دوسرا نقلی۔
جو لوگ عقلی اجتہاد کرتے وہ مسائل قرآن کی آیات اور اپنے تدبر و
تفکر سے کرتے۔ یہ اہل الرائے کہلائے اور ان کے امام ابو حنیفہ
نعمان بن ثابت کوفی تھے۔ (۸۰-۱۵۰ھ) دوسرے روایات
سے فقہی مسائل اخذ کرتے یہ اہل حدیث تھے یہ امام عبداللہ بن محمد
بن ادریس شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) اور مالک بن انس (متوفی ۱۷۹ھ)
اور امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) کے پیرو تھے۔ ان حضرات کا
اختلاف جو بھی تھا وہ فرعی فقہی مسائل میں تھا۔ اصول پر سب کا اتفاق
تھا۔ امام محمد غزالی نے ان کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا مگر جیسا
کہ ہم لکھ چکے ہیں خراسان میں مسلک شافعی اور طریقہ اشعری رائج
تھا اور امام محمد غزالی کی تعلیم و تربیت امام الحرمین کے تحت اسی مذہب
اور طریقہ پر ہوئی۔ اگرچہ یہ آپ کی زندگی کا ابتدائی دور تھا مگر اس
کا نقش اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ آپ کی تصانیف میں میلان طبع
زیادہ تر اسی طرف پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر مذہب شافعی یا ابو حنیفہ میں
کوئی بات صریحاً مخالف عقل معلوم ہوتی تو رد کرتے۔ اسعد میہنہ
نے ایک روز دریافت کیا کہ آپ کا مذہب ابو حنیفہ کا ہے یا
شافعی کا جواب دیا کہ عقلیات میں میرا مذہب برہان ہے اور
شرعیات میں قرآن، نہ ابو حنیفہ کا اجتہاد میرے لیے سند ہے
اور نہ شافعی کی فقہ غرض، بحیثیت محقق آپ کا مسلک یہ تھا کہ خدا

صفا و مرع مالکرہ۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ امام صاحب کو ان فقہا کے اجتہادات کی طرف رجوع کی ضرورت نہ تھی۔

ان ایام میں جبکہ مناظرہ کا میدان گرم تھا اور علما کو اگر کوئی اعزازی امتیاز حاصل تھا تو اسی نسبت سے کہ کون مخالف فریق کو بچھاڑتا ہے۔ امام صاحب نے مجادلہ قطعاً ترک کر دیا تھا۔ بلکہ ایک شخص جو آپ کو مناظرہ میں الجھانا چاہتا اسے امام صاحب نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ یہ فن میں نے عراق کے لونڈوں کی تفریح کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ یعنی مناظرہ کا شوق ہو تو علما عراق سے کرو۔ آپ حضرت ابراہیمؑ کے مزار پر دو دفعہ فاتحہ خوانی کے لیے گئے اور یہ عہد کیا کہ (۱) کسی امیر وزیر کے دولت پر نہیں جاؤں گا۔ (۲) کسی امیر وزیر کا عطیہ وغیرہ قبول نہ کروں گا (۳) کسی سے مباحثہ نہ کروں گا۔

وزیر خواجہ فخر الملک بن خواجہ نظام الملک کے اصرار اور احباب کی درخواست کا آپ کا اثر نہ ہوا کہ پھر سے مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں سلسلہ تدریس جاری رکھیں لیکن رویاء میں ہدایت ہوئی کہ خلق خدا کا فائدہ اسی میں ہے اس لیے مدرسہ میں درس شروع کر دیا علماء عصر نے شور مچایا کہ غزالی خطرناک عقاید طلبا کے دماغ میں ٹھونس رہا ہے۔ اور بار بار مناظرہ کی دعوت دی لیکن امام صاحب اپنے عہد پر قائم رہے اور بالکل خاموش رہے۔ اب علما نے حاکم نیشاپور کو بھڑکایا اور درخواست کی کہ غزالی کو ہمارے ساتھ مناظرہ پر مجبور کیا جائے۔ چنانچہ حاکم نے آپ کو علماء کی موجودگی میں طلب کیا۔ امام صاحب کو مجبوراً آنا پڑا۔ حاکم نے کہا کہ آپ کو علماء کے

مطالبہ کا علم ہے کس لیے مناظرہ سے گریز کرتے ہیں ۔ اور اگر یہ سمجھتے ہیں کہ علماء حق پر ہیں تو اپنی غلطی تسلیم کریں ، اور اگر یقین ہے کہ آپ ہی حق پر ہیں تو علما کو قائل کریں۔ آپ نے فرمایا کہ بات یہ ہے میں نے حضرت خلیل اللہ کے مزار پر تین عہد کیے تھے اور ان پر آج تک قائم ہوں ۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ کسی امیر وسلطان کے در دولت پر نہ جاؤں گا ۔ اہل الامر کی اطاعت واجب ہے آپ نے طلب فرمایا میں حاضر ہو گیا ۔ میں خود اپنی مرضی سے نہیں آیا ۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ کسی سے مباحثہ نہیں کروں گا ۔ آپ مجبور کر رہے ہیں ، اس لیے میرے دو عہد تو آپ کی وجہ سے اور ان علماء کے شور و شغب سے ٹوٹے ۔ اگر آپ مجبور کریں تو میرے لیے کیا عذر باقی رہ جاتا ہے ۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی اور سب کی بخشش کی دعا مانگوں ۔ پھر علماء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سبحان اللہ ، میری عمر اس وقت تک تحصیل علم میں بسر ہوئی ۔ ان علماء میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے تحصیل علم میں میری طرح محنت کی ہو ۔ غرض امام صاحب نے جو تقریر اس وقت فرمائی اس کا اثر حاکم پر خاطر خواہ ہوا ۔ معذرت کی اور نہایت احترام سے رخصت کیا ۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

امام صاحب کے ہمعصر علماء تو بہت ہیں اور اکثر صاحب تصنیف بھی ہیں ؛ ان میں سے ایک علامہ زمخشری صاحب تفسیر کشاف ، میرا شیخ بھائی نے کتاب کشکول میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ علامہ امام صاحب

کے پاس گیا اور تفسیر کے کچھ حصے پیش کیے۔ امام صاحب نے کہا کہ آپ علماء
قشری میں سے ہیں۔ علامہ مدت العمر اس بات پر فخر کرتے رہے
کہ غزالی نے مجھے علماء میں شمار کیا ہے۔ علامہ کی وفات ۵۲۰ھ میں
ہوئی اور امام صاحب ۵۰۵ھ میں فوت ہوئے۔ ابوالفتح اسعد بن
میہنی فن خلاف و مناظرہ مشہور تھا۔ اور امام صاحب کا مخالف تھا۔
امام صاحب کو مناظرہ میں الجھانا چاہا اور پہلے یہ سوال کیا کہ آپ حنفی ہیں
یا شافعی آپ نے کہا کہ میرا مذہب عقلیات میں برہان اور شرعیات میں
قرآن ہے بوحنیفہ اور شافعی میرے لیے کوئی سند نہیں۔ وہ سند لیفیں
جھانکنے لگا کہ اب بحث کس مذہب کے نقطہ نظر سے کرے۔ جو
شخص مذاہب سے بالاتر ہے اسے کیسے نیچا دکھائے۔ اسی
طرح ابوبکر طرطوسی محمد بن اسد بن محمد اندلسی جو فقہائے مالکیہ میں
ممتاز تھا اور ابن ابی رندقہ کی کنیت سے مشہور ہے (۴۵۱-۵۲۰ھ)
امام صاحب کا مخالف تھا۔ امام صاحب کی شہرہ آفاق کتاب احیاء العلوم
الدین کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھی۔ شام میں امام صاحب سے ملا۔
اور کوشش کی کہ بساط مناظرہ بچھائے۔ امام صاحب نے فرمایا
وترکناہ بصبیۃ فی العراق: ابن خلکان نے یہ واقعہ روایت کیا ہے
مناظرہ میں عموماً دو پہلوان اکھاڑہ میں اترتے ہیں اور کچھ زور بازو
اور کچھ داؤ پیچ سے حریف کو پچھاڑنا چاہتے ہیں۔ آج تک کبھی
کسی نے بغرض تحقیق مناظرہ نہیں کیا اور نہ فریق مخالف کے دلائل
کی صداقت تسلیم کی، البتہ بحث کی گرمی میں نوبت تو تو میں میں سے
بعض اوقات لام و کاف تک پہنچ جاتی ہے اور نتیجہ سوائے عداوت

وغیرہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ عبدالقادر بدایونی اپنی منتخب التواریخ میں اکبر کے حالات میں لکھتا ہے کہ اکبر یہ چاہتا تھا کہ متضاد و فریق کے اختلافی مسائل علما مذاکرہ علمی سے فیصلہ کریں اور کسی ایک بات پر اتفاق کریں اس لیے مملکت کے منتخب نمائندہ علماء دین کو دعوت دی کہ مجلس مذاکرہ علمیہ میں بیٹھ کر مناظرہ کریں۔ ہر ایک عالم اپنا تفوق اور فضیلت جتانا چاہتا تھا۔ اگر ایک کسی امر کو جائز کہتا تو دوسرا ناجائز قرار دیتا۔ ایک حلال کہتا تو دوسرا حرام روایتوں سے ثابت کرتا یہاں تک تو خیر تھی، بحث کی گرمی میں ایسے ناشائستہ کلمات ایک دوسرے کے حق میں کہتا کہ اکبر کی موجودگی کا کا بھی پاس نہ رہا اکبر کو کہنا پڑا کہ جو شخص آداب مناظرہ کو ملحوظ نہ رکھے گا اس مجلس سے نکلوا دیا جائے گا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ میں اکبر کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا میں نے دبی آواز سے کہا کہ پھر تو سب ہی اس لائق ہیں کہ نکلوا دیے جائیں، یہ ذہنیت ہمارے علماء دین کی ہر ایک زمانہ میں رہی ہے اور آج تک اس میں فرق نہیں آیا۔ او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ ان حضرات نے علم محض جدل کا ایک آلہ تصور کر رکھا ہے۔

اور جو عقیدتمند ان کے پیرو ہیں وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کا فتویٰ ایک دوسرے کے حق میں صحیح ہے تو ان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں۔

ان علماء کا نام ملکوں میں آتا ہے مگر ان کو وہ قبولیت

کبھی حاصل نہیں ہوئی جو امام صاحب کے حصہ میں آئی اگر آپ
بھی انہی کی روش اختیار کرتے تو شاید مشاہیر میں آپ کا شمار
نہ ہوتا۔ آپ مسلمانوں سے نہیں لجھے لیکن دشمنان دین کے مقابلہ
میں مردانہ وار سینہ سپر ہوئے۔ اور انہی ہتھیاروں سے کام لیا
جو مخالفت اسلام کے خلاف استعمال کر رہے تھے، یہ ہتھیار "علم
کلام" ہے۔

ابتدا میں ہمارے سلف صالحین فلسفہ اور علم کلام کی مذمت دل
کھول کر کرتے رہے اور مسلمانوں کو اس سے باز رکھتے مگر جب
دیکھا کہ اس کی طرف لوگ خود بخود کھچے آتے ہیں تو کچھ نرم پڑ گئے
امام شافعی نے اتنا کہہ دیا کہ خاص خاص آدمیوں کو مدافعت کے لئے
اگر فلسفہ سیکھنا پڑے تو قباحت نہیں لیکن عوام کو پھر بھی سختی سے
باز رکھتے۔ جب رفتہ رفتہ علم کلام عام ہو گیا تو اس کی بنا پر مناظرہ
پر فن شریف سمجھا گیا۔ امام صاحب کے زمانہ میں تو اس کو خاص
اہمیت حاصل ہو چکی تھی، امام صاحب نے فلسفہ کا رد فلسفہ ہی سے
کیا یہ پر لطف کہانی آپ خود امام صاحب کی زبانی سنیں۔ لیکن پہلے
یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ فلسفہ ارسطو کو شائع کرنے
والے خود مسلمان فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) اور بوعلی ابن سینا (متوفی
۴۲۸ھ) تھے اور امام صاحب کے زمانہ تک اس کا زور اور قوت
اس حد تک تسلیم شدہ تھی کہ علماء اسلام اس سد سکندر میں رخنہ
نہیں ڈال سکے۔ امام صاحب نے اسے گرا کر خاک میں ملا دیا۔
قرآن عظیم کا ارشاد ہے کہ دشمنان دین، اللہ اور اپنے دشمنوں

کے مقابلہ میں ہر ممکن قوت فراہم کرو اور اس کا مظاہرہ بھی کرو۔
آنحضرتؐ نے اس آیہ کریمہ سے اجتہاد فرمایا کہ قوت تیروں میں
ہے۔ ان ایام میں تیر وہی کام دے رہے تھے جو ہمارے
زمانہ میں توپیں اور بم دے رہی ہیں۔ تیر کچھ آنحضرت کی اختراع
نہ تھے، اس لیے ہر ممکن قوت میں وہ تمام اسباب قوت شامل ہیں
جو دشمن استعمال کر رہا ہو اور ان کے ذریعہ غلبہ بھی حاصل کرتا ہو۔
امام صاحب کے زمانہ میں فلسفہ ہی بہت بڑی قوت استدلالیہ تھی۔
اور ہمارے علما اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے تھے، ان کے
پاس یہ کارگر حربہ نہ تھا جو دشمن بے تکلف استعمال کر رہا تھا۔
امام صاحب نے پہلے اس حربہ پر قبضہ کیا اور اس کو استعمال کرنا
سیکھا، اور اس خوبی سے استعمال کیا کہ دشمن نے ہتھیار ڈال دیے
آپ نے پہلے آثار ارسطو و فارابی و ابن سینا و رسائل اخوان الصفا
کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔

چوتھی ہجری کے وسط میں ایک خفیہ انجمن بصرہ میں قائم
کی گئی۔ اس انجمن کے اراکین بلاشبہ بلند پایہ علماء تھے جو فلسفہ سے
خوب واقف تھے۔ اس جمعیت کا نام انہوں نے اخوان الصفاء رکھا
ان کا مقصد یہ تھا کہ دین اسلام میں خرافات اور اوہام کی آمیزش
بہت بڑی حد تک ہو چکی ہے اس کو غلاظت سے پاک و
صاف کیا جائے۔ اور فلسفہ ہی ایک ایسی شے ہے جس کے ذریعہ
یہ کثافت دور ہو سکتی ہے۔ اور یہ کہ شریعت اسلام اس وقت
کمال کو پہنچے گی جب فلسفہ بھی اس کا یاور ہو۔ مقصد اخوان الصفا

صرف اتنا ہی ہے کہ شریعت کی موافقت فلسفہ سے ہو اور اسی موافقت کے ساتھ وہ تمام کثافتیں جو اس میں شامل ہو گئی ہیں دور کی جائیں اور اسلام ایسی صورت میں پیش کیا جائے کہ اہل عقل و حکمت اسے قبول کریں۔ اخوان الصفا نے اس بات کی بھی تصریح کر دی کہ خود فلسفہ چونکہ غیر اقوام کی نامحوس زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی ہے اس کے حقائق عام فہم نہیں اور اس میں بہت کچھ تحریف کی گئی ہے۔ اس لیے اخوان الصفا کا مقصد یہ بھی ہے کہ اس کو اصلی صورت میں پیش کریں اور اس کے مقاصد واضح کریں اور عام فہم زبان میں بیان کریں۔

ظاہر مقصد جو رسائل میں بار بار واضح کیا گیا ہے یہی کچھ تھا اور اگر اس کی تہ میں کچھ غرض پوشیدہ تھی۔ تو اس کا علم کسی کو نہ ہوا اور نہ اب تک ظاہر ہوا۔ اس انجمن کا صدر مقام بصرہ اور بغداد میں تھا۔ اس کے اراکین کا نام اور ان کے حالات بھی صیغہ راز میں رہے اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ رسائل جن کی تعداد اکاون ہے کس نے لکھے، لیکن ان میں مختلف علوم و فنون مروجہ پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اور معارف مذہبی اور تاریخ مذاہب اور شریعت وغیرہ پر بھی بحث ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخوان الصفا گاہے گاہے کسی موضوع کو انفرادی و اجتماعی حیثیت میں زیر بحث رکھتے اور جو کچھ اس تحقیق کا نتیجہ ہوتا اس کو ایک رسالہ کی صورت میں شائع کرتے۔ غالباً افکار تو سب اخوان کے تھے مگر قلم بند کرنے والا ایک ہی ہوتا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی علماء یہود نے بھی "تلمود"

وفلسفا کی تدوین مگر یہ محض مذہبی تھی اسی طرح کی تھی۔ مگر علما یہود کے نام وحالات تو ہمیں معلوم ہیں اخوان الصفا کی شخصیت گوشہ گمنامی ہی میں رہی؛ کی توجیہ بظاہر یہی ہے کہ ؎

حلی کہ چنگ وعدہ پہ تقریری کنند ۔ پنہاں خورید بادہ کہ تکفیری کنند

رسائل اخوان الصفا کا ترجمہ یورپ کی زبانوں اور کچھ حصہ اردو اور فارسی میں ہو چکا ہے۔ راقم الحروف نے اوائل عمر میں پڑھے تھے۔
اور مصر اور ہندوستان میں کئی دفعہ طبع ہوئے۔ پچاس مقالے فنون طبیعی وریاضی والہیات اور مسائل عقلیہ وفلسفا واجتماعی (معاشرت) وغیرہ پر مشتمل ہیں اور ایک خود اخوان الصفا کے بارہ میں ہے کہ اس انجمن کا رکن کن شرائط پر کوئی شخص ہو سکتا ہے اور اراکین کا برتاؤ باہمی کیسا ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ اخوان الصفا کے نمونہ پر آج ترقی یافتہ ممالک یورپ اور امریکہ میں بے شمار انجمنیں قائم ہیں جو علوم وفنون کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور ان کے مقالات " انسائکلو پیڈیا " کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ رسائل اخوان الصفا کے مطالعہ سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ ان ایام میں مسلمانوں کا ذہنی ارتقا اس مقام تک پہنچ چکا تھا کہ آج بھی انکی تحقیق پر اضافہ بہت کم ہوا ہے۔

اگرچہ مولفین رسائل نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا مگر انسان رازجو واقع ہے اور قیاس کیا گیا ہے کہ اس عصر کے علما ہی ہیں ایسے بلند پایہ اشخاص مولف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے پانچ اشخاص کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) - ابوسلیمان محمد بن سعود بستی معروف بہ "مقدسی" منطقی۔

(۲) ابوالحسن علی بن ہارون زنجانی صیابی۔

(۳) ابواحمد مہرجانی۔

(۴) عرفی احبدی -

(۵) زید بن رفاعہ۔

خطیب بغدادی اور شہرازری تاریخ حکماء میں اور دیگر مورخین ان مشاہرین کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ ایک سو سال بعد ابوالحکم عمر بن عبدالرحمٰن کرمانی نے بلاد اسپانیہ میں ان رسائل کو شائع کیا۔ یہاں پہلے ہی فلسفہ کا زور تھا۔ اس لئے علماء اسلام کی توجہ خاص کر ان کے مطالعہ اور ان کے موضوع کو زیر بحث لانے پر لگ گئی۔ لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے رہے کہ ان کا مصنف یہی شخص ہے۔ ابوالحسن علی بن یوسف قفطی تاریخ الحکماء میں روایت کرتا ہے کہ ابو حیان توحیدی لکھتا ہے کہ وزیر صمصام الدولہ یعنی ابوعبداللہ بن سعدانی (متوفی ۳۷۵ھ) نے زید بن رفاعہ (مزعومہ مولف رسائل کے بارہ میں ۳۷۳ھ میں لبید سے دریافت کیا ہمنے اخوان الصفا اور ان کی انجمن اور رسائل جہاں تک مجھے علم تھا بتائے اور یہ بھی کہا کہ ہم نے اپنے استاد ابوسلیمان منطقی (مزعومہ مولف رسائل) سے بھی ان رسائل کے بارہ میں اس کی رائے دریافت کی تو اس نے کہا کہ ان مؤلفین کی کوشش یہ ہے کہ دین کو فلسفہ سے بمطابق کریں حالانکہ ان میں باہمی مطابقت نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں کا مقصد اور نظریہ مختلف ہے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو مولفین ہمارے ہاں کے "فری میسن" کی طرح اپنی شخصیت بحیثیت مولف پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے یا یہ مولف نہ تھے بعض

قیاس آرائی پر لوگوں نے ان رسائل کی تالیف ان سے منسوب کر دی لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ فرقہ معتزلہ ان رسائل کی اشاعت میں نہایت سرگرم رہا۔ اور قیاس غالب یہ ہے کہ اسی فرقہ کے علماء ان رسائل کے مولف تھے۔

غرض امام صاحب کے زمانہ میں فلسفہ اور ایسی کتب جیسی کہ رسائل اخوان الصفا ہیں ان کی اشاعت ہو چکی تھی اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ عقلیات کا کم و بیش ہر ایک قوم و ملت میں دخل جہاں تک دین کا تعلق ہے ضرور رہا ہے۔ اور قرآن تو بار بار اسی کی طرف دعوت دیتا ہے اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ کوئی ناگوار بحث نہ ہونی چاہیے تھی کہ ان کے عقاید کس حد تک ان کے دین سے لگا کھاتے ہیں۔ مگر جو کچھ ان کا عمل، معاملات دینی میں تھا وہ سمجھتے تھے کہ عین عقاید کے مطابق ہے، حالانکہ عمل اور عقاید دو مختلف امور ہیں، عمل سے اصطلاح میں کہتے ہیں مشرکین کا بھی وہی کچھ ہے جو موحدین کا ہے۔ وہی دعائیں اور پرارتھنا اور وہی قیام و رکوع و سجود دونوں میں عملاً ایک ہی ہے مگر عقاید میں بہت فرق ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عقیدہ ایک ذہنی امر ہے۔ اور عمل محسوس و معین شے ہے عقیدہ رفتہ رفتہ بدل جاتا ہے مگر عمل میں بہت کم فرق آتا ہے اور لوگ ہمیشہ اپنے عمل سے عقیدہ کی صورت پیدا کرتے ہیں حالانکہ عقیدہ اعمال کو ابتدا میں تشکیل دیتا ہے۔ فلسفہ ذہنی شے ہے، اور یہ نظریے حکماء کے ہر ایک قوم و ملت میں مختلف رہے ہیں اس اختلاف کی وجہ اختلاف عقلیات نہیں، عقل حیوانی غلطی نہیں کرتی۔ اگر علماء بھی

اس غلط فہمی میں الجھے ہوئے ہیں کہ تفاوت مدارج عقل کی وجہ سے غلطی ہوتی ہے اور غلطی کرنا عقل کا خاصہ ہے ۔ یہ بحث امام صاحب کے رسائل میں بھی ہے حقیقت یہ ہے کہ ناممکن ہے کہ انسان کسی واحد شے کے حقائق و امکانات پر کماحقہ پوری طرح حاوی ہو سکے۔

یہ اختلاف زاویہ نگاہ اور حد نظر ہے اور بس اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر ہم توہمات سے خالی الذہن ہوں تو جو کچھ ہم مشاہدہ اپنے زاویہ نگاہ اور حد نظر تک کریں گے وہ بالکل صحیح ہوگا خواہ کسی دوسرے اہل نظر سے یہ مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ جسے ہم غلطی کہتے ہیں وہ کوتہ بینی ہے جو یقینی امر ہے۔ یعنی یقیناً کسی کی نظر محدود ہیں اور کسی کی کم و بیش ہوتی ہے ۔ اگر وہ توہمات اور تمناؤں سے خالی الذہن ہو کر کسی شے کا مشاہدہ جیسی کہ وہ کرے گا تو اس کی نظر ایک ہی پہلو پر ہوگی اس شے کے دوسرے حصے جو اس کے حواس کے سامنے نہیں ہیں ۔ پوشیدہ رہیں گے ۔ لیکن جو کچھ اس نے مشاہدہ کیا ہے اور جزوی ہی ہوگا صحیح ہے علاوہ ازیں اگر عام غلط محاورہ میں ہم اسے عقلی غلطی ہی کہیں تو یہ بھی حقیقت ہے کہ عقل کی غلطی عقل ہی سے رفع ہوتی ہے اور رفع ہوتی رہی

قرآن کی اس آیت میں تدبر کرنا چاہیئے کہ اولی الالباب وہ ہیں جو متفکر و تفکر سے صحیفہ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ۔ ربنا خلقت ھذا باطلا ۔ یہ کائنات باطل مخلوق نہیں ہے یہ عقلی استدلال کا نتیجہ ہے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے حالات میں مذکور ہے کہ آپ کو ملکوت السمٰوٰت والارض کا مشاہدہ کرایا

گیا " تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو یہ سب تذکرہ و تدبر و تفکر
سے صحیح نتائج ہیں جو اہل منظر مشاہدات سے اخذ کرتے ہیں
یہ بحث امام صاحب کے حالات میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

یونانی فلسفہ جو یونان و روم اور بعد ازاں مسلمانوں میں رواج پا
پاگیا آج اس کی غلطیاں ہر ایک طالب علم پر واضح ہو چکی ہیں۔
مگر حقیقت وہی کوتہ بینی ہے اور موجودہ زمانہ کے ذہنی ارتقا
نے اس کے نقائص بھانپ لیے جو ان فلسفیوں پر واضح نہ تھے
اور یہی غلطیاں امام صاحب نے بھی اپنی کتاب "
اور مقاصد الفلاسفہ" میں نمایاں کیں، غلط فہمی سے بعض علماء نے جو
امام صاحب کے بعد ہوئے اور ان میں " ابن رشد" امام صاحب
کا سخت مخالف تھا یہ سمجھا کہ امام صاحب خود فلسفہ کو فی نفسہ مذموم
قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ امام صاحب کی بحث کا موضوع صرف چند
فلسفیوں کے نظریے ہیں۔ ابن رشد (متوفی ۵۰۵ھ) نے امام صاحب
کی کتاب " تہافتہ الفلاسفہ" کا رد " تہافتہ التہافت" لکھتے ہوئے
یہ فقرہ بھی چست کیا کہ " یہ شخص ایسا احسان فراموش واقع ہوا
ہے کہ فلسفہ ہی سے سب کچھ سیکھا اور فلسفہ ہی کی تردید کرتا
ہے " کس نیا موخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد " خواجہ زادہ
(متوفی ۸۹۳ھ) میں سلطان محمد ثانی عثمانی فاتح قسطنطنیہ کے اشارہ
پر ایک محاکمہ غزالی اور ابن رشد پر لکھا۔ ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ)
اور ابن قیم (متوفی ۷۵۱ھ) بھی امام صاحب کے مخالفین میں سے
تھے۔ لیکن ابن رشد کی مخالفت کو یہ نہیں پہنچے۔ یہ صرف

اپنے عقاید کا مظاہرہ ہی کرتے ہیں۔ ذرا معقولیت کے ساتھ ابن رشد امام صاحب کے بارہ میں یہ بھی لکھتا ہے کہ "اس شخص کا کوئی خاص مذہب نہیں، بظاہر اشعری ہے مگر صوفی بھی ہے اور فلسفی بھی ہے" امام ابن تیمیہ تو ہر ایسے شخص کو جو فلسفی یا فلسفہ کو پسند کرتا ہوں قابل نفرت قرار دیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ فلسفہ اور تصوف کا ایک جیسا مخالف ہے۔ اور امام غزالی جس پر دونوں باتیں تھیں۔ اس لئے دھری دشمنی بھی تھی۔ ابن تیمیہ نے غزالی کی کتاب احیاء العلوم پر تنقید کی۔ مگر ابن رشد کی مخالفت صرف فلسفہ کی حمایت کی وجہ سے تھی۔ بظاہر امام ابن تیمیہ وغیرہ کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ علماء اسلام فلسفہ کو غیر اسلامی اس لئے سمجھتے تھے۔ کہ ایک تو یہ یونان وروم و ایران و ہندوستان کی پیداوار ذہنی تھی۔ اور دوسرے ان کے زمانہ میں غیر مسلم یہود نصاریٰ و ایرانی بھی بلند پایہ فلسفی موجود تھے۔ ان میں سے شاہ پور بن سہل (متوفی ۲۵۵ھ) اور یوحنا ابن ماسویہ (متوفی ۲۴۳ھ) اور قسطان لوقا اور مسیحی بن یونس اور بختیشوع اور حنین بن اسحاق اور ماسرجویہ وغیرہم کا شمار مشہور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ جیسا کہ ہدایت قرآن یہ ہے کہ دشمنان دین کا مقابلہ ہر ایک ممکن قوت سے کرو۔ ہر ممکن قوت یہی ہے۔ جو دشمنان دین کے قبضہ میں ہو۔ یہ خیال خام ہے چونکہ تیر و تفنگ غیر مسلم عوام کی اختراع ہے اس لئے غیر اسلامی اور بدعت ہے۔ اور بدعت ضلالت اور سزادار

جہنم ہے، اسی کوتہ بینی اور تنگ نظری کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تنزل میں مبتلا رہے۔ چونکہ فلسفہ بالکل غیر اسلامی شے سمجھا گیا تھا اس لیے بیچارے اخوان الصفا نے بھی خیر اسی میں دیکھی کہ پوشیدہ ہی رہیں۔ ابوحیان توحیدی کا شمار مخبیر اسلام میں ہوتا ہے۔ یہ صوفی متکلم تھا۔ ابن جوزی کہتا ہے کہ "زنادقہ" تین آدمی ہیں۔ ایک ابن راوندی دوسرا ابوالعلاء اور تیسرا ابوحیان اور ابوحیان بدتر دشمن اسلام ہے۔ یہ تینوں فلسفی تھے اور فلسفہ مخالف اسلام سمجھا گیا اس لیے تینوں ابن جوزی کے نزدیک دشمن اسلام ہیں۔

امام صاحب کے مخالف حکماء و علماء

قاضی ابوالولید محمد بن احمد اندلسی (ہسپانیہ) ابن رشد کے نام سے مشہور ہے۔ پیدائش ۵۲۰ھ اور وفات ۵۹۵ھ میں واقع ہوئی جب بنو امیہ نے ہسپانیہ کو مسخر کیا اس وقت بقول ڈریپر جہالت کی تیرہ و تار گھٹا میں گھرا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے مشعل علم و حکمت روشن کی، دارالعلوم، مدرسے اور مکتب قائم کئے۔ یورپ کے شہروں سے طالب علم یہاں آتے اور دولت علم سے مالا مال ہو کر جاتے۔ اس وقت علم و حکمت کو یورپ اور پادری اسلامی اور غیر مسیحی سمجھتے تھے اس لیے اسے کفر سے موسوم کیا۔

ابن رشد ہسپانیہ کے "شہر کارڈوا" میں پیدا ہوا آباؤ اجداد طبقہ امراء سے تھے اس لیے تعلیم و تربیت بھی امیرانہ ہوئی۔ ابن رشد کے عام دوستانہ ابوبکر سے تھے اس کی شہرہ آفاق کتاب طحاوی

کا ترجمہ پہلے عبرانی میں پھر لاطینی میں ہوا۔ یورپ یونانی فلسفہ بالخصوص ارسطو کو فراموش کر چکا تھا۔ ابن رشد نے تلاش سے قلمی نسخے فراہم کیے جو بہت بری حالت میں ملے، اس نے کئی محو شدہ الفاظ کو سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے از سر نو لکھا، اور بہت کچھ تصیح کی۔ اور شائع کیا۔ امام صاحب کی کتاب تہافت الفلاسفہ، کا رد میں تہافت التہافت یا، تہافت ابی حامد، لکھی۔ دیگر تالیفات مثلاً کتاب،، الکشف عن مناہج الادلہ، میں تمام الفاظ بھی امام صاحب کے حق میں کہا ہے اور یہ بھی لکھتا ہے کہ غزالی کے دلائل "مشککہ، اور شبیہ مجبرہ، میں اکثر لوگوں کو حکمت اور شریعت میں گمراہ کرنے والی ہیں۔ امام صاحب کی تصانیف جواہر القرآن اور مشکوٰۃ الانوار اور المنقذ من الضلال. اور کیمیائے سعادت اور التفرقہ بین الاسلام والزندقہ پر تنقید کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس نے شریعت اور حکمت دونو کو خراب کیا۔ شاید اس کا اصلی مقصد بھی یہی کچھ تھا۔ اور اگر نیت نیک تھی تو عملاً نتیجہ برا ہی پیدا ہوا۔ اس کا کوئی مذہب مذاہب میں سے نہیں ہے، حو مع الاشاعرۃ اشعری و مع الصوفیہ صوفی و مع الفلاسفہ فیلسوف وحتی انہ کا قیل

یوما یمان اذا لقیت ذا یمن   وان لقیت معدیا فعدنان

بظاہر یہ جاہل اور شریر تو نہیں لیکن اس کی باتیں جاہلانہ اور شرارت آمیز ہیں۔

امام صاحب کے مخالفوں میں سے علاوہ ابن رشد حسب ذیل علماء حکماء بھی ہیں جو مشاہیر اسلام میں شمار ہوتے ہیں۔

(۱) ابوالولید طرطوشی (متوفی ۵۲۰ھ)

(۲) ابوعبداللہ محمد مازری (متوفی ۵۳۶ھ)

(۳) عثمان بن عبدالرحمٰن شہرزوری معروف بہ ابن صلاح (ولادت ۵۷۷ھ وفات ۶۴۳ھ)

(۴) ابن تیمیہ تقی الدین احمد (متوفی ۷۲۸ھ)

(۵) ابن قیم ابوعبداللہ محمد (متوفی ۷۵۱ھ)

(۶) ابن منیر

(۷) ابن جوزی ابوالفرج (متوفی ۵۹۷ھ)

(۸) برہان بقاعی

(۹) یوسف دمشقی

(۱۰) بدر زرکشی

(۱۱) ذہبی (۶۷۳ھ - ۷۴۸ھ)

(۱۲) قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ)

(۱۳) ابن حزم (یا ابن حزم)

امام صاحب کے موافق علماء دیکھا تو بہت ہیں مشاہیر حسب ذیل ہیں۔

(۱) امام عبدالغافر فارسی صاحب تاریخ نیشاپور۔

(۲) عین القضاۃ ہمدانی۔

(۳) ابن عساکر دمشقی صاحب تاریخ دمشق (۴۹۹ - ۵۷۱ھ)

(۴) ابن نجار محب الدین محمد (متوفی ۶۴۳ھ)

(۵) سمعانی ابوسعید عبدالکریم (۵۰۶ - ۵۶۲ھ)

(۶) سبکی۔

(۷) یافعی
(۸) ابن خلکان ابوالعباس احمد بن ابراہیم (متوفی ۶۸۱ھ)
(۹) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی
(۱۰) صلاح الدین صفدی
(۱۱) امام فخرالدین صفدی (متوفی ۷۶۴ھ)
(۱۲) محمد خرزمی
(۱۳) عبدالوہاب شعرانی
(۱۴) قطب الدین محمد عقلانی
(۱۵) ابوالفضل عراقی
(۱۶) فاضل نودی
(۱۷) شیخ عبدالقادر مؤلف تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء

علماء متاخرین کی فہرست طویل ہے، ان میں سے شیخ بھائی (متوفی ۱۰۳۰ھ) اور زبیدی (۱۲۰۵ھ) صاحب تاج العروس و شرح احیاء العلوم مشہور مصنفین ہیں۔

متقدین میں سے بعض حضرات نے امام صاحب اور ابن رشد پر "محاکمہ" بھی لکھا، ان میں سے محمد لطفی نے جس بے لطفی سے ابن رشد کی حمایت کی ہے اس کے بعض فقرات سے واضح ہوتی ہے امام صاحب کو متقاضی اور ابن رشد کو قاضی ابن قاضی لکھتا ہے عربی زبان میں اسم پر صرف "مت" کا اضافہ ہو تو معنی چھوٹا ہو جاتے ہیں مثلاً "بنی" اور "بنیی" یعنی چھوٹا بنی اسی طرح قاضی اور متقاضی یعنی چھوٹا قاضی، ابن رشد تو بیشک قاضی ابن قاضی ہے لیکن امام صاحب

کبھی اس عہدہ جلیلہ پر فائز نہیں ہوئے اور نہ کبھی قضاۃ کا دعویٰ کیا،
صرف ایک قاضی کے عہدہ کی رعایت سے امام صاحب کو متقاضی بنا
دیا، محمد لطیفی نے "تاریخ فلاسفہ اسلام" لکھی، اس میں ایک اور مقام
پر لکھا ہے کہ یہ شخص جو حجۃ الاسلام کے لقب سے مشہور ہے اس سے
کہیں بڑھ چڑھ کر ابن رشد نے اپنی تصنیفات میں شریعت کی مدافعت
اور اس کے احکام کی نصرت کی ہے،

آمی زادہ رومی نے بھی ایک محاکمہ لکھا تھا، محمد لطفی لگے ہاتھوں
اس کی بھی مزاج پرسی اس طرح کرتا ہے کہ اس بات پر تعجب نہ کرنا
چاہیئے کہ علم رومی نے غزالی اور ابن رشد کے اختلاف پر محاکمہ لکھا
اس کی عبارت ہی اس کے قلت فہم پر دلالت کرتی ہے، ایک اور
شیخ ملک مبارک محمد لطفی کی طرح غزالی کی مخالفت کرتا ہے مگر لطفی
کی طرح بے لطف نہیں،

ابوبکر محمد بن عبدالملک ابن طفیل (متوفی ۵۸۱ھ) اندلسی فلسفیوں میں
ممتاز ہے، امام صاحب کی تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ اپنی کتاب
اسرار الحکمۃ المشرقیہ لعنی رسالہ حی بن   میں امام صاحب کا ذکر کرتا ہے
ابن طفیل کہتا ہے کہ حقائق کا علم جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں، جو بھی
حقیقت کے انکشاف کے لیے کوشش کرتا ہے۔ خاص لذت محسوس
کرتا ہے کہ زبان اور بیان اس کی شرح سے عاجز ہے، اور کبھی وجد
و سرمد کے مرتبہ پر بھی پہنچ جاتا ہے کہ اس حالت میں حقیقت کو
پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ بعض حضرات جو اس حالت تک پہنچے ہیں
عالم استغراق میں "سبحانی ما اعظم شانی" "ولیس فی ثوبی الا اللہ" کہتے ہیں،

اور شیخ ابو حامد غزالی پر بھی یہ حال وارد ہوا ہے ابن طفیل یہ بھی لکھتا ہے
کہ فلسفہ جیسا کہ چاہیئے اندلس میں وارد نہیں ہوا اور اہل اندلس پیشتر
اس کے کہ منطق سے واقف ہوں ریاضیات میں مشغول رہے ، اور
علم منطق سے کما حقہ بہرہ ور نہ ہوئے اور منطق کے بعد فلسفہ کی طرف
توجہ کم ہی رہی اور ان میں ابو بکر محمد بن یحیٰ معروف بہ ابن صائغ یا ابن
باجہ (متوفی ۵۳۳ھ) سے بڑھ کر استاد کوئی نہیں ہوا۔ لیکن ابن باجہ
دنیا دار آدمی تھا اور کمال انسانی اور دریافت حقیقت حاصل نہ کر سکا۔
(یاد رہے کہ جہاں کہیں فلاسفہ مغرب استعمال ہوتا ہے۔ مراد
ابن باجہ و ابن طفیل و ابن رشد ہے اور فلاسفہ مشرق سے مراد
فارابی اور ابن سینا اور غزالی ہیں)
ابن طفیل کہتا ہے کہ میں نے ابن باجہ کو تو نہیں دیکھا لیکن اس
کے مقالات کا مطالعہ کیا ہے جو نہایت مختلف ہیں قدیم فلسفیوں کے فلسفہ
کی شرح لکھتا ہے اور غزالی اور بو علی سینا اور فارابی کو ایک ہی
ردیف میں رکھتا ہے اور ان پر تنقید کرتا ہوا کہتا ہے کہ ان حضرات
کا فلسفہ فہم حقائق کے لیے کافی نہیں، لیکن فارابی کی تالیفات جہاں تک
مجھے ملیں زیادہ تر فن منطق میں ہیں اور اس کے فلسفہ میں بہت
شکوک موجود ہیں البتہ ابن سینا کی روش تحقیق صحیح ہے جو ارسطو میں
بھی پائی نہیں جاتی لیکن وہ خود کتاب شفا میں لکھتا ہے کہ میں نے مشائیوں
کی روش پر لکھی ہے اور اگر کوئی چاہے کہ حقیقت اور میرے عقاید
باطنی سے آگاہ ہو تو میری کتاب "فلسفہ مشرقیہ" کی طرف رجوع کرے۔
غزالی جو کچھ کہتا ہے اس کا فائدہ لوگوں کو اس وقت تک نہیں پہنچ

سکتا جب تک ان کو بصیرت نفس پہلے ہی نہ ہو۔ اور وہ غزالی کی طرح صاحب حال اور ہم عقیدہ نہ ہوں،

امام صاحب کے مخالفوں میں سے ابوالفرج ابن جوزی اور شمس الدین ابوالمظفر معروف بہ سبط ابن جوزی (۵۸۲-۶۵۴ھ) اور ابن تیمیہ اور اس کا شاگرد رشید ابن قیم تمام علماء حنبلی مذہب تھے اور غزالی کا مذہب شافعی تھا اس لیے یہ حضرات امام صاحب کے مخالف ہیں۔ سبط ابن جوزی کہتا ہے کہ غزالی نے کتاب احیاء العلوم مذہب صوفیہ پر لکھی ہے اور قواعد فقہ اسلامی کی رعایت نہیں کی، ابن تیمیہ اس لیے امام صاحب سے خفا ہے کہ یہ فلسفی ہے اور بدین اور سست عقیدہ رکھتا ہے، ابن تیمیہ ہر ایسے کو ملعون کہتا ہے کہ جو کتب فلسفہ کو غیر زبانوں سے عربی میں نقل کرتا ہے اور مسلمانوں میں رائج کرتا ہے۔ احیاء العلوم کی نسبت کہتا ہے کہ غزالی کو فن درایت و حدیث سے بہت تھوڑی واقفیت تھی۔ ابن جوزی نے تو احیاء العلوم کے رد میں کتاب اعلام الاحیاء فی اغلاط الاحیاء لکھی اور سخت اعتراض کیے۔ ابن قیم بھی تعصب میں ان حضرات سے کم نہیں اور اس نے بھی احیاء العلوم کا رد لکھا ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ غزالی شافعی مذہب اور اشعری مسلک کا آدمی تھا اور جویائے حقیقت تھا۔ اور دلیل عقلی کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور جو کچھ اس نے افکار و عقاید تازہ پیدا کیے اور دوسرے کے کلام سے وہی کچھ اخذ کیا جو دلیل اور حجت سے ثابت شدہ تھے وہ ان مخالف حضرات کے عقاید کے موافق

نہ تھے اس لیے ان کو غزالی کے دلائل اور برہان عقلی و نقلی سے کچھ سروکار نہیں وہ اپنے عقائد کے ترازو میں اسے تولتے ہیں اور ان باہم میں مذاہب ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ اگر امام صاحب کی مؤلفات احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال و مشکواۃ الانوار اور جواہر القرآن اور المستصفیٰ وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا جو کچھ امام صاحب نے لکھا ہے وہ آپ کی ذاتی تحقیق ہے۔

ملا جلال ہمائی کہتے ہیں کہ غزالی تو ہر معقول بات کو لے لیتا ہے اور علماء اہل سنت بعض نامعقول باتوں کو بھی اپنے عقاید میں داخل سمجھتے ہیں اور جس طرح سنی شیعہ کو شیعہ سنی کو بدین کہتے ہیں یہ بات غزالی میں نہیں اس لیے کہ اس کے عرفان اور تصوف اور ریاضت نے اس کے عقاید میں تعدیل پیدا کر دی تھی۔ اور احادیث صرف اہل سنت کے طریق پر ہی نہیں لیتا بلکہ ائمہ شیعہ سے بھی روایت کرتا ہے۔ المختصر یہ کہ گم فتار ابوبکر و علی نہ تھا۔

امام صاحب کا ارشاد ہے کہ علم منطق شناخت حدود و براہان و شرائط قیاس لازم ہے، مخالف کہتے کہ غزالی نے کس لیے تحصیل منطق کو حرام مطلق نہیں سمجھا۔ ابن صلاح اور شرف نودی اور ابن تیمیہ اور ابن قیم کا عقیدہ تھا تحصیل منطق حرام ہے۔ ابن قیم کہتا ہے کہ علم منطق کو جہل کہا جائے۔ امام شافعی اور احمد اور دیگر ائمہ دین نے کب منطق پڑھا۔ ان حضرات کی تصانیف پڑھ کر دیکھو تو منطق کے امیان سے مطلق آلودہ نہیں، اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے علم منطق

مختلف ہے بعض تو اسے واجب عینی اور بعض واجب کفائی اور بعض مباح اور بعض حرام سمجھتے ہیں۔ ابن تیمیہ وغیرہ آخر الذکر زمرہ میں ہیں۔ امام صاحب کے ایک فقرہ "لیس فی الامکان ابدع مما کان" یعنی خلقت عالم اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جیسی کہ مشاہدہ ہو رہی ہے۔ اس پہ مخالفوں نے کتابیں لکھیں۔ اور امام صاحب کے بعض شاگردوں نے کہا کہ یہ قول امام صاحب کا نہیں مخالفوں نے ان سے منسوب کیا ہے۔

امام صاحب سے جو حضرات مخالف ہیں ان کی مختصر فہرست ہم لکھ چکے ہیں، یہ امام صاحب کے اقوال کی تاویل کرتے ہیں اس کا تذکرہ موجب طوالت ہے۔ آج ہم امام صاحب کے مرتبہ سے خوب واقف ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمعصر علماء حکماء بھی کسی ایسے شخص کے رتبہ سے واقف نہیں ہو سکتے جو ان سے بالاتر ہو۔ ابن رشد وغیرہ فلسفی تو امام صاحب کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ان کی طرح محض فلسفی کیوں نہیں۔ اور علماء اسلام اس لیے کہ وہ فلسفی کیوں ہے۔ علماء ظاہر اس لیے کہ اس کا مسلک صوفیہ کیوں ہے۔ اور امام صاحب کے بعض اقوال کو بدعت ملامت بنایا۔ امام صاحب نے ایہ " " کی تفسیر میں یہ بھی کہہ دیا کہ دوستی زر و سیم بھی عبادت اصنام میں داخل ہے۔ ابن قیم کہتا ہے کہ کسی مفسر نے آج تک یہ تفسیر نہیں کی اور دوستی زر و سیم پرستش اصنام کیسے ہو سکتی ہے۔

علی بن یوسف بن تاشفین ولادت ۴۹۶ھ وفات ۵۳۷ھ شاہ اندلس و مراکش مذہب مالکی میں سخت متعصب واقع ہوا تھا۔

اور فلسفہ و منطق سے غزالی سے بیر تھا۔ فقہائے مالکی اور دوسرے مخالفان غزالی نے اسے بھڑکایا اس نے فرمان شائع کیا کہ کتب غزالی بالخصوص احیاء العلوم جہاں بھی ملے اور جس کسی کے پاس ہو جلا دے اس کی تعمیل ہوئی مگر اس کی بادشاہت نہ رہی اور امام صاحب کے دوستوں نے اسے آپ کی کرامت پر محمول کیا۔

قاضی عیاض نے بھی مولفات غزالی کے جلانے کا فتویٰ دیا۔ قاضی صاحب مراکش میں ۵۴۴ھ میں فوت ہوئے۔ فقہائے بلاد مغرب کا رئیس ابوالحسن علی بن حرزہم معروف بہ ابن حرازم مغربی نے بھی فتویٰ صادر فرمایا کہ احیاء العلوم کا پڑھنا پڑھانا حرام اور جلانا واجب ہے۔

امام صاحب کے شاگردان رشید

امام صاحب مدرسہ نظامیہ بغداد میں چار سال اور نیشاپور میں ایک سال درس دیتے رہے، امام صاحب کی عادت تھی ان اوقات کے علاوہ جو عبادت اور ریاضت میں بسر ہوتے باقی اوقات میں طالبان علم و حکمت و حق کو درس دیتے رہے بغداد میں تین سو طلبا آپ کے حلقہ درس میں شامل ہوتے اور ان میں سے ہر ایک فارغ التحصیل ہو کر یگانہ روزگار ہوا۔ نیشاپور میں بھی طالبان حق کا ہجوم رہتا، طوس آپ کا مولد ہے۔ یہاں ایک خانقاہ اور مدرسہ تعمیر کیا۔ ایک سو طالب بیک وقت آپ کے فیوض روحانی سے بہرہ یاب ہو کر ہدایت خلق خدا میں مصروف رہے۔ چھٹی صدی ہجری کے اکثر علما و حکما بالخصوص اہل خراساں آپ ہی کے شاگرد اور

تربیت یافتہ تھے۔ ان میں سے ایک امام محی الدین محمد بن یحیٰ بن ابی منصور نیشاپوری ہیں۔ ۵۴۸ھ میں قوم غزان نے خراسان پر حملہ کیا سلطان سنجر سلجوقی اسیر ہوا، پانچ سال قید و بند میں رہا یہ فتنہ پانچ سال مسلسل رہا اس فتنہ میں امام صاحب کے اکثر شاگرد جو فضلاء عصر تھے مارے گئے۔ امام یحیٰ بھی شہید ہوئے۔ استاد خاقانی شروانی نے درد انگیز مرثیہ لکھا چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

آن مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد
وان نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد

گردون سر محمد یحیٰ بباد داد
محنت نصیب سنجر مالک رقاب شد

ای مشتری معاینہ از برکہ
در گردن محمد یحیٰ طناب شد

امام یحیٰ ایک عرصہ تک مدرسہ نیشاپور اور نظامیہ ہرات میں درس دیتے رہے۔ علماء و فضلاء کی ایک جماعت آپ کی شاگرد تھی۔ امام یحیٰ عربی میں اشعار بھی خوب کہتے ایک فاضل آپ کے بارہ میں کہتا ہے کہ

مغاث الدین والاسلام یحیا
یحی الدین مولانا دین یحیٰ

کان اللہ رب العرش یلقی
علیہ حین یلقی الدرس وحیا

جب آپ درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ روح القدس آپ کی زبان پر بولتا ہے۔ مولانا جامی نے آپ کے دو بیت کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے۔

وقالوا لعین الشمس فی السماء حسنۃ

ازالشمس لاقتہ فما خلتہ صدقا

فما التری من غاۃ فی صاو وجہہ

وقد لسعا قلبی نیسقتنہ حقا

مولانا رومیؒ کا ترجمہ ہے

می شنیدم موئے چوں افتد در آب — میں نے سنا ہے کہ بال پانی میں گرے تو
مار گردد از شعاع آفتاب — سورج کی کرنوں سے سانپ بن جاتا ہے
بر رخت پیچید زلف و دل گزید — تیرے چہرہ پر زلف نے بل کھائے اور
باورم شد آں حدیث تا صواب — دل کو ڈسا مجھے یقین ہو گیا کہ لوگ سچ کہتے ہیں

امام یحییٰ کو سفاک قاتلوں نے نہایت اذیت کے ساتھ مارا۔ منہ خاک سے بھرا اور گردن میں کپڑا ڈال کر پھانسی دی ملک الشعرا خاقانی کہتا ہے کہ

نادر محنت است در این تنگنائے خاک — محنت برائے مردم و مردم برائے خاک
صدمت محمد رسل نماشت خلق — چاں نہ تراز محمد یحییٰ فضائے خاک
آں کو وہ روز تہلکہ دعلال غذائے سنگ — دیں کردہ گاہ کشتہ دہاں را فدائے خاک

امام یحییٰ کی ولادت ۴۷۶ھ اور شہادت ۵۴۸ھ میں واقع ہوئی اسی سال ابوالفتح محمد ابن عبدالکریم شہرستانی مولف کتاب "ملل و نحل" نے بھی وفات پائی۔

امام یحییٰ کے بہت شاگرد سر آمد روزگار ہوئے۔ ان میں سے ایک ابوالبرکات نجم الدین محمد بن موفق بن سعید فیوشانی نیشا پوری وہ مشہور شخصیت ہے جس کی تحریک پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے فاطمی خلفاء مصر کا نام خطبہ سے خارج کر کے خلفاء عباسیہ کا نام بر سر ممبر پڑھوایا۔ اس کے علاوہ امام شہاب الدین محمد بن محمود طوسی اور شیخ فخر الدین محمد بن ابی علی نوقانی (۵۱۶-۵۲۹ھ) قاضی ابو طالب محمود بن علی اصفہانی مشہور و معروف مدرس (متوفی ۵۸۵ھ) سب اپنے زمانہ

کے منتخب علماء فضلا امام یحییٰ کے شاگرد تھے۔

امام غزالی کا ایک اور شاگرد ابوالفتح محمد بن فضل مارشکی طوسی ہے یہ بھی فتنہ غزاں میں ۵۴۹ھ میں شہید ہوا۔ ایک اور شاگرد ابو منصور محمد بن اسعد واعظ عطاری طوسی معروف بہ "حفدہ" ہے مرو میں ۵۷۱ھ میں فوت ہو کر مدفون ہوا۔

ایک اور شاگرد ابن برہان فقیہ ابوالفتح احمد بن علی نظامیہ بغداد میں مدرس رہا۔ ۴۷۹ھ میں پیدا ہوا اور ۵۲۰ھ میں فوت ہوا۔

تاج الاسلام ابن خمیس ابو عبداللہ حسین بن نصر موصلی (متوفی ۵۵۲ھ) اور ابو محمد انصاری عامر بن دعش شامی (۴۵۰-۵۳۱ھ) اور مروان طنزی بن علی بن سلامہ ساکن دیار بکر وزیر زنگی آق سنقر والیٔ موصل (متوفی ۵۴۰ھ) اور استاد ابوطالب رازی عبدالکریم بن علی بن ابی طالب (متوفی ۵۲۹ھ) اور ابوالفتح باقرجی عبدالواحد بن حسن مدرس نظامیہ بغداد (متوفی ۶۳۳ھ) اور ابن عربی معافری ابوبکر محمد بن عبداللہ اندلسی (ولادت ۴۶۸ھ وفات ۵۴۳ھ) اور ابو سعد نوقانی محمد بن اسعد بن محمد ملقب بہ "بریدہ" (شہادت حادثہ غزاں میں ۵۵۴ھ) اور قاضی ابو نصر احمد بن عبداللہ بن خمقری (ولادت ۴۶۶ھ وفات ۵۴۴ھ) سب امام غزالی کے شاگرد تھے۔

محمد بن تومرت ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن تومرت معروف بہ "مہدی ہرغی" یہ بھی امام صاحب کا شاگرد تھا اس نے دیار مغرب میں دعویٰ مہدویت کیا تھا۔ اقوام بربر نے مراکش اور ہسپانیہ اور نواح مصر میں شورش اور انقلاب برپا کر رکھا تھا ابن اثیر وغیرہ اس کے حالات

مفصل لکھتا ہے، اکثر لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے (ولادت ۴۸۵ھ اور وفات ۵۲۴ھ)

ابو حامد اسفرائنی محمد بن عبدالملک بن سمعانی اسفرائنی اور ابو سعید محمد بن جاوانی عراقی (۴۴۶-۵۲۰ھ) بھی امام صاحب کا شاگرد ہے اس نے مقامات حریری پر شرح لکھی ہے۔

ابراہیم بن محمد غنوی رقی صوفی (۴۵۹-۵۴۳ھ) اور ابو عبداللہ حسین بن نصر جہنی کعبی (۴۶۶-۵۵۲ھ) اور خلف بن احمد نیشاپوری اور ابو الحسن سعد الخیر بن محمد بن سہل انصاری اندلسی (متوفی ۵۴۱ھ) اور ابو منصور سعید بن محمد بن رزاز مدرس نظامیہ (۴۶۲-۵۳۹ھ) اور ابو الحسن علی بن حمویہ بن محمد بن حمویہ جوینی ابو عبداللہ شافع بن عبدالرشید جیلی (متوفی ۵۴۱ھ) اور ابو الفتح نصر بن محمد ابراہیم آذربائیجانی مراغی اور ابو الحسن علی محمد مطہر بن مکی بن مقلاص دینوری (متوفی ۵۳۳ھ) اور ابو محمد صلاح بن محمد اور جمال الاسلام ابو الحسن علی بن مسلم، یہ سب امام صاحب کے شاگرد ہیں۔ تمام شاگردوں کا تذکرہ ابن خلکان اور طبقات شافعیہ اور مراۃ الجنان وغیرہ کتب میں کیا گیا ہے۔

امام صاحب کے ایک شاگرد محمد بن تومرت کے بارہ میں ہم سطور بالا میں لکھ چکے ہیں کہ اس نے دعویٰ مہدویت کیا تھا۔ یافعی مراۃ الجنان میں واقعات سال ۴۹۹ھ کے ضمن میں لکھتا ہے کہ اس سال ایک شخص نے "نہاوند" میں دعویٰ نبوت کیا اور سحر اور شعبدہ بازی سے بھی کام لیا۔ گرفتار ہو کر مارا گیا۔ ہم نے اپنی کتاب "مذاہب اسلامیہ" میں مدعیان مہدویت و نبوت کا تذکرہ مفصل لکھا ہے اسلئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں مدعیان

مہدویت و نبوت آنحضرتؐ کے بعد بہت پیدا ہوئے ہیں اور احادیث موضوع انکی تائید میں بہت ہیں جب تک لوگوں کو کسی مہدی وغیرہ کا انتظار ہے ایسے مدعیان پیدا ہوتے رہیں گے، تعجب یہ ہے کہ ایک مہدی کے بعد دوسرے کا انتظار باقی رہتا ہے۔

المنقذ من الضلال

یہ کتاب امام صاحب نے اپنی وفات سے چار سال پیشتر لکھی اس کتاب کی تصنیف کی وجہ یہ ہوئی کہ لوگ اکثر امام صاحب سے سوال کرتے کہ آپ نے کس طرح مذاہب مروجہ کی بھول بھلیوں سے نجات حاصل کی اور تقلید کا پھندا توڑ کر تحقیق کی منزل پر پہنچے اور اس تمام تحقیق کا نتیجہ کیا ہوا، اور فلسفہ کو چھوڑ کر تصوف سے رشتہ جوڑا امام صاحب اکثر حلقہ درس میں عموماً ان امور پر گفتگو کرتے مگر پھر خیال آیا کہ کیوں نہ ایک رسالہ کی صورت میں ان استفسارات کا مفصل جواب لکھا جائے کہ آئندہ نسلوں کے بھی کام آئے۔ یہ تمام باتیں امام صاحب نے رسالہ المنقذ من الضلال میں لکھی ہیں، اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سر سید احمد خاں غفرلہ نے بھی اردو میں ترجمہ کیا اور تنقید بھی کی، حافظ انور علی رہتکی نے سلیس اردو میں ترجمہ کیا دونوں ترجمے ہماری نظر میں اوائل عمر میں گذرے ہیں۔ مولانا ہمائی نے فارسی میں ترجمہ کیا جو ہمارے سامنے ہے، اس رسالہ کے مطالعہ سے امام صاحب کے فلسفہ کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے جو ڈیکارٹ وغیرہ فلسفیوں سے مختلف ہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ڈیکارٹ نے اپنی تحقیق کو انہی لفظوں میں بیان کیا ہے

جو امام صاحب نے رسالہ مذکورہ میں استعمال کیے ہیں۔ امام صاحب نے ہر ایک شے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا لیکن جب تصوف کی طرف رجوع کیا تو واضح ہو گیا کہ "یقینے خفتہ در ہر پردہ ظن"۔ اور یہی کچھ ڈیکارٹ کا نظریہ ہے۔ مگر ڈیکارٹ تو باتوں کے لڈو بناتا ہے جس سے کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتا اور امام صاحب تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب پر انکشاف حقیقت منحصر یقین کرتے ہیں، امام صاحب فرماتے ہیں کہ اختلاف امم و اقوام عالم بہ تعلق مذہب اتنا ہے کہ ان کے اسباب پر طلبہ اطلاع مشکل ہے۔ ہر ایک فرقہ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک ناجی اور دوسرے گمراہ ہیں۔ "کل حزب بما لدیہم فرحون"۔ اور اپنے عقاید کی تائید میں جب دلائل عقلیہ سے کام نہیں چلتا تو برہان قاطع یعنی تلوار سے کام لیتے ہیں۔ آنحضرت کا ارشاد بھی ہے کہ جلدی میری امت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی مگر ان میں سے ایک ہی ناجی ہوگا۔ "ستفترق امتی علی نیف وسبعین فرقۃ الناجیۃ منہم واحدۃ"۔ ہر ایک فرقہ دعوے ہے کہ ناجی وہی ہے اور امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں آغاز جوانی سے اب تک میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے اس بحر بیکراں میں شناوری کرتا رہا ہوں اور ہر ایک فرقہ کے عقاید اور ہر ایک مذہب کے اسرار و رموز کی جستجو میں مصروف رہا، غرض یہ تھی کہ معلوم ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور سنت و بدعت میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں نے ظاہر پرست علما کا بھی جائزہ لیا تو جو ظاہری رسوم شرع سے ادھر ادھر ہونا گمراہی سمجھتے ہیں اور کافر اور زندیق کے دلوں کو بھی ٹٹولا کہ تمام ادیان و مذاہب کو ٹھکرا کر کسی

شریعت کے پابند نہیں ہیں غرض مسلک ظاہریہ و باطنیہ و حکما اور متکلمین وصوفیا و زہاد و عباد و کفار و زنادقہ کے عقاید سے کما حقہٗ واقف ہو گیا میں یہ چاہتا تھا کہ ان تمام مذاہب کے اختلاف کے اسباب ذہن معلوم ہوں اور کس لیے یہ لوگ اپنے اپنے مذاہب کے گرویدہ ہیں بات یہ ہے کہ میری سرشت و فطرت میں تحقیق کا مادہ تھا اور میں تشنگی تحقیق ہر ایک مرحلہ پر شدت سے محسوس کرتا رہا یہ بات کچھ میری اختیاری نہ تھی بلکہ میری فطرت کا یہ تقاضہ تھا۔ اس کے ساتھ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری روح کو تقلید سے نفور تھا۔ کیونکہ مجھ پر یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ اکثریت دلیل و برہان سے کسی مذہب سے وابستہ نہیں بلکہ محض تقلیداً غلو کر رہی ہے۔ جب تک مجھے کوئی بات کسی مذہب یا عقیدہ میں معقول نظر نہ آئی میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ابھی عہد جوانی باقی تھا کہ آخر تقلید کا پھندا جس میں لوگ جکڑے ہوئے تھے میں نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور وہ عقاید جو وراثت میں مجھے ملے تھے میں ان سے دست بردار ہو گیا۔ میں نے یہود و نصاریٰ کے لڑکوں کو دیکھا اور اسی طرح مسلمانوں کی اولاد کی حالت تھی مگر اپنے آبائی مذہب میں نشو و نما پاتے ہیں۔ ان کی عقاید موروثی میں پرورش ہوتی ہے مجھے یہ حدیث بھی ازبر تھی کہ ہر ایک مولود اپنی اصلی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے یہودی و نصرانی و مجوسی بنا لیتے ہیں اس لیے میرے اندر ایک تحریک اٹھی کہ دریافت کیا جائے کہ فطرت کیا ہے اور یہ علم کے بغیر ممکن نہ تھی اس

لیجئے اب اس ڈھب میں لگا کر حل کیا ہے؟ تاکہ میں اسی کا اتباع کروں، یہ نقطہ مجھ پر منکشف ہوا کہ علم حقیقی وہی ہے جس میں شک وشبہ و غلط و پندار کی گنجائش نہ ہو جس میں شک وشبہ کی گنجائش ہو وہ علم نہیں محض توہمات ہیں۔ علم وہ ہے کہ معجزہ وکرامت بھی اس کی حقیقت کا بطلان نہ کر سکیں۔ مثلاً دس زیادہ ہیں تین سے اگر کوئی اس حقیقت کا منکر ہو اور کہے کہ تین زیادہ ہیں دس سے ہیں تو خواہ وہ عصا کی سانپ بنا کر دکھا دے میں ہرگز یقین نہ کروں گا گو مجھے اس کی شعبدہ بازی کے اسباب کا علم نہ ہو اور مجھے حیرت بھی ہو کہ اس نے عصا کا سانپ کیسے بنا دیا۔ لیکن میرے علم میں کبھی یہ شک وشبہ نہ ہوگا کہ دس زیادہ ہیں تین سے۔ جب علم کی تعریف میں نے اس حد تک اپنے ذہن میں پختہ کر لی تو اب دیکھنا یہ تھا کہ علم کی بنیاد کن امور پر ہے تو سب سے پہلے ان امور کا جائزہ لیا جس کو میں اپنا علم و فراست سمجھ رہا تھا۔ آیا یہ میرا علم ایسا ہے کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں یہ قطعی یقینی ہے یا محض اوہام و خیالات ہیں۔ جب میں نے جائزہ لیا تو واضح ہو گیا کہ یہ یقینی امر نہیں اور میں علم سے بالکل خالی ہاتھ ہوں، ضروریات اور حسیات کے سوا اور کچھ میرے پاس نہیں (ضروریات سے مراد بدیہیات اولیہ ہیں۔ جیسے دس زیادہ ہیں تین سے اور کل جزو سے بڑا ہے اور اجتماع ضدین محال ہے)، اس لیے میں نے سوچا کہ میری مشکلات کا حل انہی ضروریات و حسیات سے ہی ہو گا۔ اور انہی کو اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دینی چاہیے۔ اس لیے میں نے انہی کا جائزہ لیا کہ آیا یہ قابل اعتبار

بھی ہیں۔ شاید یہ بھی تقلید کا کرشمہ ہو کہ میں بدیہات کو سنگ بنیاد علم
حکما کی طرح سمجھ رہا ہوں اور ان کی بھی وہی کیفیت ہو کہ اکثر لوگ اپنے
نظریات پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے میں نے ضروریات اور محسوسات
میں فکر کی کہ دیکھوں ان میں شک وشبہ کی گنجائش تو نہیں۔

جب میں نے حواس اور محسوسات میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں
شک وشبہ کی گنجائش بہت ہے، اور ان سے اطمینان قلب حاصل
نہیں ہو سکتا۔ سب سے قوی تر حس بصر ہے جو سایہ کو ساکن دکھاتی ہے
حالانکہ تجربہ و مشاہدہ سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ سایہ کبھی کا ساکن
نہیں ہوتا۔ اجرام سماوی کو چھوٹے چھوٹے ذرات دکھاتی ہے حالانکہ علم
ہندسہ کی رو سے یہ ہمارے کرہ ارض سے بھی بڑے ہیں۔

حاکم عقل نے محسوسات کی تکذیب کی تو مجھے ان سے دست بردار
ہونا پڑا۔ اس لیے میں نے اولیات عقلی کی طرف رجوع کیا۔ محسوسات
نے مجھے کہا کہ جناب عقل نے ہماری تکذیب تو کی ہے۔ مگر یہ خود کہاں
کی معتبر ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جس طرح ہمیں نیچا دکھایا ہے اسی طرح
اس پر بھی کوئی اور حاکم ہو (فوق کل ذی علم علیم) اتنا تو سوچیں کہ آپ کی
آدھی زندگی خواب میں گذرتی ہے اور جو کچھ خواب میں آپ مشاہدہ کرتے
ہیں عقل تصدیق کرتی ہے مگر بیداری میں جھٹلاتی ہے کہ یہ تمام اوہام
وخیالات کیا یہ ممکن نہیں کہ اور عقل سے زبردست تر حاکم بھی ہو جو
اشتباہات عقول کو آشکارا کرے۔ اور اس کی ضمانت آپ کے پاس
کیا ہے کہ جسے آپ بیداری سے تعبیر کرتے ہیں وہ بھی ایک صورت
خواب ہی ہو۔ اور محققین صوفیہ بھی تو یہی کہتے ہیں، کہ سب کچھ جو اس

زندگی میں مشاہدہ ہوتا ہے مجازی ہے۔ حقیقت بعد از مرگ خلق جدید میں آشکارا ہوگی۔

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید
شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد

میرا ذہن حدیث نبوی کی طرف منتقل ہوا (الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا) لوگ سوئے ہیں مرکر جاگیں گے۔ اور آیہ قرآن بھی ہے کہ

فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید

ان خیالات کا دورہ کرکر میرے دماغ پر ہجوم ہو رہا تھا، لیکن میرا سرمایہ تو یہی حس اور بدیہیات اولیہ ہی تھے، لیکن جب ان سے اعتبار اٹھ گیا تو میں خالی ہاتھ رہ گیا۔ اب میری حالت سفسطہ ( ) کی سی ہو گئی۔ لیکن یہ سب کچھ حال ہی حال تھا میں اسے زبان پر نہ لایا۔ قریب دو ماہ مجھے وادی وحشتناک سوفسطائی میں سرگرداں ہونا پڑا۔ اور اس درد کا کوئی درماں نظر نہ آیا۔ آخر اللہ تعالے ہی کے کرم و فضل سے مجھے رہائی ملی اور میری حالت صحت و اعتدال پر آگئی یعنی ضروریات عقلی مورد اطمینان ہوئی مگر یہ کسی نظم و ترتیب استدلال سے کیفیت حاصل نہ ہوئی۔ بلکہ میری رہنمائی اس نور نے کی جس سے سموات و ارض روشن ہیں۔ الغرض نور الہٰی کی ہدایت سے میں نے ظلمات سفسطہ سے رہائی پائی دوبارہ سرمایہ عقل میرے ہاتھ لگا اور میں نے سرمایہ ضروریات اولیہ کے ذریعہ تحقیق شروع کی۔

جو لوگ حق کی تلاش کرتے رہے اور کر رہے ہیں میں نے ان کو چار جماعتوں میں منقسم دیکھا۔

(۱) متکلمان جو اپنے آپ کو اہل رائے و نظر کہتے ہیں۔

۲ - باطنیہ کہ اپنے آپ کو اہل تعلیم کہتے ہیں اور امام معصوم سے وابستہ ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم علم براہ راست امام معصوم سے حاصل کرتے ہیں۔

۳ - فلاسفہ جو اپنے آپ کو اہل منطق و برہان کہتے ہیں۔

۴ - صوفیہ جو مدعی کشف و شہود و مقرب بحضرت حق ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر حق کی تلاش ہے تو انہی چار فرقوں میں ملے گا۔ کیونکہ دوسرے فرقے تو محض اہل تقلید ہیں انہیں تحقیق سے کچھ سروکار نہیں۔ اور میرا شیشۂ تقلید عرصہ سے چور چور ہو چکا تھا اس لیے مذاہب تقلیدی سے مجھے کوئی واسطہ نہ رہا۔ میں نے سمجھا کہ اگر حق ان چار فرقوں میں بھی نہ ملا۔ تو پھر خدا حافظ، اس لیے ان فرقوں کے راستوں پر تمام تر کوشش ذہنی سے چلنا شروع کیا۔ تو طریق متکلمان اختیار کیا اس مرحلہ سے گذر کر فلاسفہ کے طریقہ میں داخل ہوا۔ یہ بھی طے کر کے وارد تعلیمات باطنیہ ہوا۔ اس سے بھی گذر کر طریق صوفیہ اختیار کیا۔ غرض میں نے چاروں مسلک کی کما حقہ پیمائش کی۔

امام ان چاروں مذاہب کے مسلک اور مطالب کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "فن کلام" پر جو کچھ متقدمین نے لکھا تھا میں اس سے پورا واقف ہو گیا اور اس علم میں میں نے بھی کچھ تصنیف کیا۔ آخر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ علم حمایت عقاید دینی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اگر اس سے یہ مقصد حاصل بھی ہو تو میرے مقصد کے لیے کافی نہیں کیونکہ اس فن میں طریق استدلال

یہ ہے کہ مخالف کے نقائص واضح کیے جائیں ۔ یہاں چونکہ ضروریات عقلی کے سوا اور کچھ تحقیق بھی کارآمد نہیں سمجھتا تھا اس لیے یہ علم میرے درد کی دوا نہ تھی ۔

فلسفہ کے بارہ میں میں نے خیال کیا کہ میری تمام مشکلات کا حل شاید اسی سے ہو ۔ علم کلام سے فارغ ہو کر میں نے ادھر توجہ کی ۔ بغداد میں تین سو طالبان علم کو درس دے رہا تھا اور تصنیف کا سلسلہ بھی جاری تھا فراغت کے وقت بغیر مدد استاد و معلم میں نے فلسفہ کی تحصیل پر صرف کر دیا ۔ دو سال کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ میں نے اس علم کے تمام رموز اور اسرار معلوم کر لیے ۔ ایک سال اور فلسفیوں کے افکار پر غور کرتا رہا ۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ بھی میرے درد کی دوا نہیں ۔ اس علم کے اکثر مسائل تخیلات واہی ہیں ممتاز فلسفی دھری اور طبعی والٰہی ہیں ۔ امام صاحب ان کے عقاید وغیرہ پر مفصل بحث کے بعد لکھتے ہیں کہ فلسفہ کی چند اقسام ہیں منطق اور ریاضیات اور طبعیات اور الٰہیات و سیاسیات ، ریاضیات اور منطق دونوں برہان ہیں اور ان کو کوئی ربط حقائق دینی سے نہیں ۔ طبعیات جہاں تک کہ ان کا تعلق مسائل دینی سے نہیں احکام نظری کے جز ہیں اور سیاسیات کچھ تو امور دنیوی اور کچھ امور اخلاقی سے ربط رکھتی ہیں ۔ اور ان میں صوفیہ کے کلمات کی آمیزش بھی ہے

فلاسفہ کی اکثر غلط کاری اور اشتباہات الٰہیات میں ہے اور ممتاز فلسفی یونانی افلاطون و ارسطو اور اسلامی فلسفی فارابی اور ابن سینا مطالب الٰہی کے بارہ میں اشتباہ میں ہیں ۔ ان کے اشتباہ بالخصوص بیس مسائل میں ہے جس کو ۔۔ نے اپنی کتاب تہافتہ الفلاسفہ میں شرح و بسط

سے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ فلاسفہ کا کفر تین مسائل میں ہے
ایک انکار معاد جسمانی دوسرے یہ کہ خدا تعالےٰ کو کلیات کا علم ہے
جزئیات کا نہیں۔ اور تیسرے قدم وازلیت عالم۔ مسئلہ نفی صفات
میں وہ معتزلہ کے نزدیک تر ہیں۔ اور اسی طرح وہ دوسرے مسائل میں
بھی ہیں۔ لیکن محض اس عقیدہ پر معتزلہ کی تکفیر جائز نہیں۔ اور یہ کہ
ہر ایک فرقہ جو دوسرے فرقہ کی تکفیر کرتا ہے محض تعصب باطل ہے،
اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقہ،
میں مفصل بحث کی ہے۔

مذہب تعلیمیہ کی طرف توجہ میں نے فلسفہ سے فارغ ہو کر کی، فلسفہ
کے بارہ میں مجھے یقین ہو گیا کہ عقل محض معمائے ہستی کی گتھی کو سلجھا نہیں
سکتی۔ جب میں باطنیہ کی طرف متوجہ ہوا تو تالیف تعلیمیہ کا (شاید اشارہ
حسن بن صباح کی طرف ہے) ظہور ہوا۔ اور باطنیہ کی باتیں لوگوں میں
حکایت ہونے لگیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حقائق امور بواسطہ امام معصوم
سے معلوم کرتے ہیں اور معارف الٰہی امام قائم بحق کی جانب سے
انہیں پہنچتے ہیں۔ اب مجھے جستجو اس کی ہوئی کہ دیکھوں یہ کیا کہتے ہیں
اور فرقہ کے نہاں خانہ کی تلاش میں نکلا۔

اتفاقاً انہی دنوں میں حضرت خلافت نے مجھے اس خدمت پر
مامور کیا کہ درباره حقیقت مذہب باطنیہ کتاب لکھوں، ایک تو میری اپنی
خواہش بھی یہی تھی اب خلافت امر نے مجھے ان کی تحقیق پر بالکل متوجہ
کر دیا۔ ان کی کتابیں ہر ایک گوشہ سے فراہم کیں اس کے علاوہ میرا
ایک دوست بھی تھا جس کی آمدورفت میرے ہاں تھی، میرا صورت

ایک عرصہ سے فرقہ باطنیہ سے وابستہ تھا اور ان کے مدرج عقاید سے خوب واقف تھا۔ میں اس سے پوچھتا اور وہ بھی اس فرقہ کے عقاید و حکایات جمیعہ سے شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا۔ وہ یہ بھی کہتا کہ اس وقت تک جو کتابیں اس مذہب کے رد میں لکھی گئی ہیں ان کا مضحکہ ہمارے ہم عقیدہ احباب اڑاتے ہیں کہ ہمارے مدرج عقاید اور دلائل سے تو واقف نہیں کچھ اپنے خود ساختہ عقاید اور دلائل پیش کرتے ہیں اور منسوب ہم سے کرتے ہیں۔ میں نے نہ چاہا کہ میں بھی کچھ ایسی بات لکھوں کہ اسی طرح میرا بھی مضحکہ اڑائیں اور کہیں کہ ناسمجھی کے باعث یہ کچھ لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری تمام تر کوشش یہی رہی کہ ان کی مدرج عقاید اور دلائل سے پوری آگاہی ہو نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتاب لکھی اور اس گروہ کے مخالفوں کا ہدف طعن بن گیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ تو نے کتاب اس نہج سے لکھی ہے کہ اس کا نفع تو تمام تر فرقہ باطنیہ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ حارث محاسبی نے معتزلہ کے رد میں کتاب لکھی اور احمد بن حنبل نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی تیرا جواب نہ دیکھے تو محض طور پر شبہ اعتزال ذہن باقی رہے گا۔

امام صاحب باطنیہ کے بارہ میں "القسطاس المستقیم" میں لکھتے ہیں کہ میرا مقصد سردست بیان ابطال و فساد طریقہ باطنیہ نہیں کیونکہ میں نے یہ مطالب دوسری چند کتابوں میں لکھے ہیں ان میں سے ایک کتاب "مستظہری" اور دوسری "حجۃ الحق" ہے جو ان

سوالات کا جواب ہے جو مجھ سے بغداد میں کیے گئے تھے تیسری
کتاب "مفصل الخلاف" ہے اور یہ ان سوالات کا جواب ہے جو ہمدان
میں مجھ سے کیے گئے۔ چوتھی کتاب "الدرج" ہے جو تعلیمیہ کی
بعض بے بنیاد اور سست باتوں کے بارہ میں ہیں جو طوس
میں مجھ پر واضح ہوئیں۔ پانچویں کتاب "القسطاس المستقیم" ہے
کہ یہ جداگانہ تالیف ہے۔

باطنیہ معلم کی رٹ لگاتے ہیں اور اگر ان سے پوچھو کہ معلم سے
کیا سیکھا ہے تو بغلیں جھانکیں گے۔ اور جب جواب سے عاجز آتے
ہیں تو حوالہ امام غائب دیتے ہیں اور اظہار فضیلت کے مقام میں
فیثاغورث کے افکار کی آڑ لیتے ہیں جو رسائل اخوان الصفا میں
نقل کیے گئے ہیں۔

میں مذہب باطنیہ اور طریقۂ باطنیہ سے خوب واقف اور
ان کے مسلک کے رموز و دقائق سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ بات
جس سے قلب کو اطمینان و آرام و خورسندی ہو اس میں نہ پاسکے۔

طریقۂ صوفیہ۔ جب ان تینوں مرحلوں سے گذر چکا تو طریقۂ صوفیہ
کی حقیقت معلوم کرنے پر متوجہ ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کا انکشاف
ممکن نہیں جب تک دو باتیں پہلے حاصل نہ ہوں۔ ایک علم اور کی
عمل، علم تصوف کی تحصیل تو مجھ پر آسان تر تھی۔ لیکن عمل ذرا ٹیڑھی
کھیر تھی۔ مگر میں نے پہلے علم تصوف کے مؤلفات مثلاً
ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" اور تالیفات حارث محاسبی اور ماثورات
شبلی و جنید و بایزید سے حاصل کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصوف ازبعے

نظر علم تمام علوم شرعی سے تفاوت نہیں رکھتا۔ اگر کچھ ہے تو وہ عمل میں ہے۔ محض شراب کے نام سے نشہ کی لذت محسوس نہیں ہو سکتی۔
ذوق ایں مے نہ شناسی ، محض علم سے تو کام نہیں چلتا جب تک عمل نہ لایا جائے اور یہ تو مجھ پر بھی اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اس وقت تک جو کچھ میں نے پڑھا لکھا محض قیل و قال ہی تھا۔ تصوف حال ہے، اور حال ہی سے حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ تمام عقاید دینی میں سے میرا ایمان ان تین بنیادی باتوں پر تھا خدا اور پیغمبر اور روز جزا لیکن ان کے عوامل جو میری ذہن میں نقش تھے بیشمار تھے۔ ان کی کیفیت خواہ کچھ بھی۔ میرا ایمان ان تین باتوں پر پختہ تھا۔

جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ حقیقت تصوف بغیر حال و تقویٰ و قطع علائق شہوانی منکشف نہیں ہو سکتی تو رفتہ رفتہ دنیوی امور میری نظر میں سرد پڑتے گئے کہ یہ سب تعلیمات شیطانی ہیں۔ ان علائق میں شریف ترین علاقہ دینوی تدریس و تعلیم ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی بے قاعدہ ہی ہے۔ اس نوع کی تدریس و تعلیم و افادہ و استفادہ جو ہر ایک شخص کا معمول ہے اس جہاں کے امور میں سے یہ بھی فریب ہی ہے۔ اور اگر سچ پوچھو تو تدریس میں بھی خلوص نیت نہ تھا۔ بلکہ طلب جاہ مال وسعت شہرت کار فرما تھی۔ اب مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ تقلیدی علم و فن میں عمر عزیز تلف کی آخر میں نے عزم بالجزم کیا کہ تمام بند تعلقات توڑ چھوڑ کر یک سوئی حاصل کروں اور بغداد سے باہر نکل جاؤں، لیکن میں علائق دنیوی ریاست و جاہ و شہرت و منصب تدریس و تعلیم میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک طرف تو ایمان کو س

رحلت بجا رہا تھا اور دوسری طرف تختہ بند ہوا دیوس تھا۔

چھ ماہ اسی کشاکش میں گذر گئے۔ آخر ماہ رجب ۴۸۸ھ میں میری زبان خود بخود بند ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن پر قفل لگا دیا گیا۔ بہت چاہا کہ اصحاب کی خوشنودی کے لیے ہی سہی سلسلہ تدریس جاری رکھوں میسر نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ غذا بھی کم سے کمتر ہوتی گئی دوست تو میری بیماری کے علاج کی فکر میں تھے مگر میرے درد و درماں باطنی کا کسی کو علم نہ تھا۔

آخر جذبہ غیبی نے دستگیری کی اور چراغ ہدایت میرے راہ میں رکھا گیا۔ اور اس ورطہ ہولناک سے رہائی بخشی، کہ تمام علائق دینوی جاہ و مال و شہرت و زن و فرزند سب میری نظر میں ہیچ پڑ گئے، اب میں نے ارادہ کر لیا کہ بغداد سے شام کی طرف سفر کرنا چاہیے۔ بظاہر میں نے سفر مکہ کی عزیمت ظاہر کی، مجھے ڈر تھا خلیفہ اور دوست احباب مانع سفر ہوں گے، ہر ایک شخص اپنے اپنے ظن کے مطابق میری نسبت چہ می گوئی کر رہا تھا۔ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا سوائے کفاف زن و مرد دور کیا۔ اس کفاف کو ان کے لیے چھوڑا بغداد سے باہر نکلا اور شام کا راستہ لیا۔ یہاں دو سال تک عبادت و خلوت و ریاضت کے سوا اور کچھ کام نہ تھا۔ جیسا کچھ طریقہ صوفیہ سے معلوم تھا اس پر عمل کرتا رہا۔ ایک مدت تک مسجد دمشق میں معتکف رہا منارہ مسجد پر چڑھ کر دروازہ بند کر لیتا اور تمام روز ذکر و فکر میں مشغول رہتا۔

دمشق سے میں بیت المقدس میں آیا۔ یہاں بھی ریاضت میں مشغول رہا روز۔ " ۔ میں جا کر دروازہ بند کر لیتا اور اسی طرح ذکر و فکر میں مشغول

رہتا۔ اس کے بعد میرے دل میں سفر حج اور زیارت تربت رسولؐ کا
شوق موجزن ہوا ۔ خلیل اللہ کی زیارت کے بعد میں حجاز کے سفر
پر روانہ ہو گیا ۔ سفر حجاز کے بعد ناگاہ زن و فرزند کی فکر لاحق ہوئی ۔
اس لیے وطن کی طرف مراجعت کی ، اور یہاں بھی خلوت اور عزلت میں
دن بسر ہونے لگے ۔ کبھی تنگی معیشت اور حوادث دنیا اور حوائج زندگانی
زن و فرزند میرے صفائی خلوت کو مکدر کرتے لیکن میں اپنے کام
میں مشغول ہی رہا ۔ الغرض میری خلوت و ریاضت کا زمانہ دس سال
گزرا اور اس عرصہ میں مجھ پر وہ کچھ منکشف ہوا کہ شمار میں نہیں آ سکتا
اور لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا ۔
آخر مجھ پر اچھی طرح منکشف ہو گیا کہ حق اور حقیقت خوب تصوف
میں ہے ۔ چراغ تصوف مشکوٰۃ نبوت سے نور حاصل کرتا ہے اور اس
نور کے بغیر دل منور نہیں ہو سکتا ۔ مجھ پر وہ حقائق منکشف ہوئے
کہ ذوق و حال ہی سے تعلق رکھتے ہیں ۔ میں اسی راہ پر گامزن ہوا کہ اس
کا آغاز طہارت قلب اور انجام فنا فی اللہ ہے ۔ امام صاحب راہ سیر و
سلوک کے نشان بھی بتاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سالک ایسے
مرحلوں سے بھی گزرتا ہے کہ حلول و اتحاد کا خیال اس کے دل میں
پیدا ہوتا ہے لیکن یہ اندیشہ محض خطا ہے ۔ اس کے بعد تصوف
اور اسرار نبوت اور طریق سیر و سلوک کو شرح و بسط سے بیان
کرتے ہیں ۔ ان کا ذکر آپ کی کتاب "المقصد الاقصیٰ" اور بالخصوص
احیاء العلوم میں مفصل ہے ۔
آخر امام صاحب پر جب یہ منکشف ہوا کہ ایک فرقہ تو علوم ظاہر

اور دوسرا فلسفہ کلام اور تیسرا علوم باطنی و تعلیمی میں گمراہ ہے تو دل میں ولولہ اٹھا کہ ان کو ورطہ ہلاکت سے باہر نکالنا چاہیئے۔ لیکن اس کے لیے بھی اسباب مناسب کی ضرورت تھی۔ آخر وہی ہوا جو منظور خدا تھا اور اسی طرف شیخ سعدی نے اشارہ کیا ہے کہ

بادشاہ وقت نے کہا اور دوستوں نے بھی ترغیب دی اور آپ نے پھر سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن کتنا فرق موجودہ اور گزشتہ حالات درس میں تھا۔ پہلے مجھے ہوس شہرت اور محبت جاہ و مال اور محض ہوا و ہوس تھی اب میں یہ باتیں ترک کر چکا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ میں منزل مقصود پر پہنچوں گا یا اجل پیش از وقت مجھے آ لے گی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے اپنی اور اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بنوں، پہلے آپ ہدایت یافتہ ہو کر پھر دوسروں کی رہنمائی کروں۔

امام صاحب کو تو غالباً اپنے ہی زمانہ کے لوگوں کی اصلاح اور ہدایت کا خیال تھا۔ ہزار سال کے قریب عرصہ گذرتا ہے اس عرصہ میں اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے طالبان حق تھے جو آپ کے فیض سے مالا مال ہوئے۔

اگرچہ ہمارا منشا نہیں کہ امام صاحب آپ کے متقدمین مشاہیر صوفیہ کی نسبت۔ ان کے تصوف کے بارہ میں رائے زنی کریں مگر مولانا ہمائی لکھتے ہیں کہ اگرچہ غزالی کے پیران طریقت ابوعلی فارمدی اور ابوبکر نساج ہیں اور امام صاحب کے مطالعہ میں کتابیں بھی مثلاً ابوطالب مکی (متوفی ۳۸۶ھ) کی کتاب قوت القلوب اور رسالہ قشیریہ امام ابو قاسم قشیری متوفی ۴۶۵ھ اور مقالات حارث محاسبی متوفی ۲۴۳ھ متوفی ۲۴۳ھ

بن یحییٰ متوفی ۲۴۳ھ و امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ و ماثورات جنید متوفی ۲۹۸ھ و تعلیمات شبلی و بایزید بسطامی لیکن امام صاحب خود محقق و نقاد ہیں امام صاحب کے تصوف کا پایہ ان سے بلند تر ہے۔ لیکن مولانا جلال الدین رومی کے تصوف کو امام صاحب کا تصوف بھی نہیں پہنچا۔

اول الذکر مشاہیر کے تصوف میں ارکان اسلام صوم و صلوٰۃ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ امام صاحب کے تصوف میں زہد و ریاضت نمایاں ہے عارف رومی کے تصوف میں عشق کارفرما ہے۔ امام صاحب کے تصوف کی تعریف ان کے اپنے الفاظ میں "اکل حلال و اقتدا برسول اللہ فی اخلاقہ و احوالہ و اوامرہ و سنتہ" ہے اور فہم قرآن و حدیث میں دیگر علما فقہا اور مفسرین سے بے اندازہ تفاوت رکھتا ہے۔ البتہ امام احمد غزالی برادر امام صاحب شروع سے تصوف سے وابستہ رہے اور اکثر محققین کے نزدیک ان کا مرتبہ امام صاحب سے بڑھا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ بعض حضرات پر شریعت کا رنگ گہرا تھا اور بعض پر سرمد و مستی کا۔

"مستور و مست ہر دو چو از قبیلہ اند … من دل بعشوہ کہ دہیم اختیار چیست"
(حافظ)

مؤلفات غزالی

امام صاحب کی تصانیف کی تعداد تذکرہ نویسوں نے مختلف لکھی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ علوم دین پر آپ کی تصانیف ستر سے زیادہ ہیں۔ دیگر علوم فلسفہ وغیرہ پر بھی آپ کے مولفات ہیں۔

اور اگر سب کتابوں کو شمار کیا جائے تو تعداد دو سو کے قریب ہے ان میں سے بعض آپ کی اپنی تصانیف کی تلخیص بھی ہیں اور بعض احیاء وغیرہ کتب کی بعض فصل کی شرح بھی ہے ان کے علاوہ بعض کتب ایسی ہیں جو امام صاحب سے منسوب ہیں لیکن تذکرہ نویس اکثر متفق ہیں کہ امام صاحب کی تصانیف نہیں مثلاً "السر المکتوم فی اسرار النجوم" اور "تحسین الظنون" اور "النفخ والتسویہ" اور "الظنون بہ علی غیر اہلہ" اور سر العالمین وکشف ما فی الدار ہیں۔

اکثر کتابیں تو شائع ہو چکی ہیں اور بعض کے تراجم اردو اور فارسی اور لاطینی وعبرانی میں ہو چکے ہیں۔ امام صاحب کی تصانیف عموماً عربی میں ہیں۔ فارسی میں کیمیائی سعادت بہت مقبول ہیں۔ لیکن ابوحفص عمر بن عبدالعزیز بن یوسف طرابلسی امام صاحب کی چار کتابوں کے وصف میں لکھتا ہے کہ

هَذَّبَ الْمَذْهَبَ حَبْرٌ ۔ أَحْسَنَ اللّٰهُ خَلَاصَهُ

"بَسِيْطٌ وَّ وَسِيْطٌ" ۔ وَوَجِيْزٌ وَّخُلَاصَهُ

الوجیز امام صاحب کی معرکۃ الآراء تالیف علم فقہ میں ہے۔ اور "بسیط" اور "وسیط" دو اور تالیفات کے مطالب اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور ان ہی کی شرح "الوجیز" ہے۔ اسی کتاب کی نسبت بعض کی یہ رائے ہے کہ اگر غزالی دعویٰ نبوت کرتا تو "الوجیز" ہی ایک معجزہ کافی تائیدی شہادت تھی۔ احیاء العلوم اور وجیز اکثر علماء و فضلاء و آئمہ دین کے حلقہ درس میں رہی ہے۔ اور اس پر ان حضرات نے شرح اور حواشی اور توضیح اور استفادہ کی شارح حضرات میں سے یہ ہیں۔ امام فخرالدین رازی اور

ابوالشاعر محمود بن ابی بکر اصفی اور ابوحامد محمد بن یونس اربلی اور ابوالفتوح عجلی اور ابوالقاسم عبدالکریم بن قزوینی رافعی اور امام نووی نے جیسی کی تلخیص کی ہے۔ الوجیز مصر میں ۱۳۱۸ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔

اصول فقہ میں امام صاحب کی کتاب "المستصفی" دو مجلدات میں طبع ہوئی ہے۔ امام صاحب نے ۶ محرم ۵۰۳ھ میں تالیف کی۔ اس کتاب کی شرح اور تلخیص بھی اکثر علماء و فضلا نے کی ہے

امام صاحب کی کتاب "مقاصد الفلاسفہ" آپ کی دوسری کتاب "تہافت الفلاسفہ" کا مقدمہ ہے، غرض یہ ہے کہ ناظرین عقاید فلاسفہ سے واقف ہوں اس کے بعد انکی ماسئے سے، اور امام صاحب کی تنقید سے آگاہ ہوں، "معیار العلم" منطق میں "میزان العمل" علم النفس آپ نے لکھی۔ فرقہ باطنیہ کے رد میں "مستظہری" بنام المستظہر باللہ خلیفہ عباسی اور "مواھم الباطنیہ" تصنیف کی۔

امام صاحب کی ولادت ۴۵۰ھ میں وفات ۵۰۵ھ میں واقع ہوئی آپ کی زندگی کے بارہ میں یہ شعر مشہور ہے۔

نصیب حجۃ الاسلام زین سرائے سپنج   حیات پنجہ و پنج و فات پانصد و پنج

طوس کے لیے یہ فخر کہ ؎

ہر فقیہ و شاعر و مفتی کہ او طوسی بود   چوں نظام الملک و غزالی و فردوسی بود

سماد زونلی (تذکرہ الشعرا دولت شاہ) کہتا ہے کہ ؎

خردمند و تن می گفتم لدا پیرکہن جہان تا کہ   شد از شور غلغلے شیطان وز سودای هوی خالی

خرد گفتا عجب دارم کہ میدانی و می پرسی   بعہد علم غزالی بعہد علم غزالی

شیخ عطار فرماتے ہیں کہ

صدرے کہ برائے علم اندر علی بود — علم زلیقین اوز شک خالی بود

از قعر ہزار قلزم بے سروپا — اسرار پدید کرد غزالی بود

نیز ارشاد فرماتے ہیں کہ ؎

صدرے کز علم علم علام است — در ملک جہاں یگانہ ایام است

کان گہر علم عیان غزالی — دریائے علوم حجۃ الاسلام است

امام صاحب کا طرز استدلال اور روش تحقیق یہ ہے کہ مجادلہ اور بحث و مباحثہ کی اصل غرض دریافت حق ہونی چاہیئے لیکن اہل علم حضرات عموماً جذبہ مخالفت کے تحت مخالف فریق کی ایسی باتوں کی تردید بھی کرتے ہیں جو سچی ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ مجادلہ انتہائی مذموم ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحث ہمیشہ لے نتیجہ رہتی ہے بلکہ فریقین میں جذبہ نفرت بھی ابھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب نے جب تیل وقال مدرسہ کو چھوڑا تو یہ عہد بھی کیا کہ میں آئندہ کسی سے مباحثہ نہیں کروں گا۔ شام میں ایک عالم نے بساط مباحثہ بچھائی تو امام صاحب نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ میں نے یہ کام عراق کے لونڈوں کے سپرد کر دیا آپ نے اس کے بعد مدت العمر کبھی کسی عالم سے باوجود دعوت مجادلہ مباحثہ نہیں کیا۔ البتہ میں نے افکار اپنی تصانیف میں شرح و بسط سے واضح کیے۔ بعض علماء نے ان کی تردید بھی کی، تنقید بھی کی اور بعض نے کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا۔ یہ زمانہ گذر گیا۔ اس کے بعد امام صاحب کی تصانیف ہمیشہ علماء فضلا کے حلقہ درس میں رہیں۔

امام صاحب نے بعض مذاہب اسلامیہ معتزلہ و باطنیہ کا بالخصوص

بھی اپنی کتابوں میں کیا ہے مگر آپ کسی فرقہ کی تکفیر نہیں کرتے۔ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ اختلاف عقاید فروع میں ہے اصول پرست متفق ہیں۔ فروع میں اختلاف واجب ہے۔ تفقہ فی الدین فروع میں عقلاً ہوتا ہے اور رائے عقلی میں اختلاف ہوتا ہے۔

امام صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جس امر میں فقہ کا اختلاف ہے اسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی شخص مکلف شرعاً نہیں، اسی نظریہ کے تحت آپ فلسفہ کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منطق اور ہندسہ و ریاضی پر سب عقلاء کا اتفاق ہے اور یہ حقائق ثابت شدہ ہیں اس لیے فلسفہ کی اس شاخ کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جو لوگ جذبہ مخالفت کے تحت ان کا بھی رد کرتے ہیں خود غلطی خوردہ ہیں اور اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ لیکن فلسفیوں کے تخیلات اور افکار ایسے ہیں کہ ان پر ان کا بھی اتفاق نہیں ان میں چون و چرا کی گنجائش ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ اسلام کے لیے نہ مضر ہیں اور نہ مفید ان کو بھی نظر انداز کرنا چاہیئے۔ البتہ بعض ایسے معتقدات ہیں جو ان تخیلات کی بنا پر فلسفی پختہ کیے ہوئے ہیں اور اسلام کے مخالف ہیں ان کا رد کرنا چاہیئے۔ مگر تردید کرتے وقت محض اپنے عقیدہ کو خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو بطور دلیل پیش کرنا چاہیئے۔ فلسفہ کا رد براہین عقلیہ ہی سے مناسب ہے۔ امام صاحب نے یہی روش اختیار کی ہے۔

امام صاحب اسی نظریہ کے تحت کہتے ہیں کہ انبیاء و رسل بھی حکماء ہیں اور توحید پر ہر ایک زمانہ میں ان کا اتفاق رہا ہے اگر فلسفی

بھی کسی بات پر تحقیقاً متفق ہوتے۔ تو ہیں اُسے حق سمجھ کر تسلیم کرلیا۔ لیکن ان کا باہمی اختلاف شاہد ہے۔ کہ حقیقت کا انکشاف ان پر نہیں ہوُا۔ وہ محض قیاسات سے کام لے رہے ہیں۔

امام صاحب نے بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ حالیہ زمانہ کا ایک محقق کہتا ہے۔ کہ کبھی کبھی زمانہ میں حکماء کا کسی ایک امر پر اتفاق نہیں ہوُا۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو واجب ہے۔ کہ خلف سلف سے اختلاف کرے۔ ذہنی ارتقاء کا راز اسی میں مضمر ہے۔ تمام علوم و حکمت اور فنون پر تغیرات واقع ہو رہے ہیں۔ اور کوئی شخص یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ کہ اُسے ایک ذرہ کا علم کماحقہٗ کامل حاصل ہے ذرہ ذرہ میں امکانات بےشمار ہیں اور ہر امکان کے بےشمار پہلو ہیں حکماء ہر ایک شئے کو جیسی کہ وہ ہے مشاہدہ ضرور کرتے ہیں مگر اپنے زاویہ نگاہ سے اور ایسے زاویے غیرمحدود ہیں جسے ہم سائنس یا حکمت سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا علم کم و بیش انسانی، مادی اور ذہنی ارتقاء میں مدد دے رہا ہے۔ اور اس علم کی تردید کوئی حکیم نہیں کرتا۔ امکانات اشیاء حکماء پر منکشف ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی ایجاد نہیں۔ مثلاً مسئلہ کشش ثقل، نیوٹن پر منکشف ہوُا۔

نیوٹن ابھی پیدا ہی نہ ہوُا تھا کہ یہ قانون فطرت آفرینش سے سرگرم عمل تھے۔ نیوٹن مرگیا اور یہ قانون ویسا ہی کارفرما ہے۔ نیوٹن کی شخصیت سے اور کسی شخص کے ایمان و کفر سے مائل

بے نیاز ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ قانون فطرت کا کچھ نہ بگاڑ سکتا ہے۔ اور نہ سنوار سکتا ہے۔ البتہ منکر اس کے علم و عمل کے فائدہ سے محروم ہے۔ اور جو تسلیم کرتا ہوا اس کا اتباع کرتا ہے فائدہ میں رہتا ہے۔ اسی طرح .. انکشافات ہیں جو انسانی مذہب میں وحیاً انبیاء رسل پر واضح ہوئے ان میں کوئی اختلاف نہیں البتہ اس میں انسانی ذہنی ارتقاء کے مناسب لدارتقاء فہم ہے۔

غرض "حقائق" میں کوئی اختلاف نہیں لیکن کوئی شخص یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ اسے ان کا علم کماحقہ حاصل ہے۔ امام صاحب نے اسی تحقیق کی بناء پر عصمت انبیاء کا انکار کر دیا۔ احیاء العلوم الدین (جلد چہارم باب اوّل در بارہ توبہ) میں لکھتے ہیں کہ

کوئی شخص اعضاء کے گناہ سے خالی نہیں کیونکہ اعضاء کے گناہ سے تو انبیاء تک نہ بچ سکے قرآن و حدیث میں انبیاء کی خطاؤں اور ان کی توبہ اور خطاؤں پر گریہ و زاری مذکور ہے۔ اور اگر بعض ادنیٰ گناہ سے محفوظ بھی رہے تو دل سے قصد گناہ سے نہ بچے گا۔ اور اگر دل میں بھی قصد نہ ہوگا تو وسوسہ شیطان سے نہ بچے گا۔ کہ وہ خیالات پریشان دل میں پھیلا کرتا ہے۔ اور اس سے یاد الٰہی سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور اگر وساوس سے بھی خالی رہے تو اس بات سے نہیں بچ سکتا۔ کہ اللہ تعالےٰ کی صفات

اور افعال کی واقفیت میں غفلت اور قصور ہو اور یہ سب باتیں نقصان کی ہیں۔ اور ہر نقصان کا کوئی سبب ہے اور اس نقصان کو چھوڑنا اور اس کی ضد نفع کو اختیار کرنا توبہ کی غرض ہے۔ اور کسی انسان کے متعلق یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نقصان سے خالی ہے۔ البتہ مقدار نقصان کے بارہ میں لوگ مختلف الرائے ہیں۔ اصل نقصان کچھ نہ کچھ ہر ایک میں موجود ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ آنحضرت فرماتے ہیں کہ

"بے شک میرے دل پر زنگ کا پردہ آجاتا ہے یہاں تک کہ میں دن رات میں ستر بار استغفار پڑھتا ہوں۔ (امام مسلم) اور اسی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے آپ کو بندگی عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ

"اللہ نے تیری اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمائیں) جب ایسے عالی شان نبی کا یہ حال ہو تو دوسروں کا کیا ہوگا۔"

ہمیں مسئلہ عصمت انبیا کے دقائق میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے کہ واجب ہے کہ انسان غلطی کرے اور گناہ کرے مگر ارادہ نہ کرے۔ سہواً غلطی خاصہ بشری ہے اور اسی میں اس کے ارتقا کا راز مضمر ہے۔ ہربرٹ سپنسر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ واجب ہے کہ خلف سلف سے اختلاف کرے۔ اور سلف کے نقائص رفع کرے۔ جن قوموں پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ رجعت پسند ہوتی ہے۔ اور اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ اقوام سے بہت پیچھے رہ جاتی

ہیں اور ادوار آخر مٹ جاتی ہیں۔ ذہنی ارتقا اسی انسانی غلطی میں مضمر ہے
انسان غلطی بھی کرتا ہے اور ترقی بھی کرتا ہے۔ طبقہ حیوانات میں کوئی
جاندار غلطی نہیں کرتا اور نہ ترقی کرتا ہے۔ اگر انسان غلطی نہ کرے تو
حیوان مطلق ہوگا۔ اور اگر ارادۃً کرتا ہے تو بہائم سے بھی بدتر ہے۔ اگر
انسان معصوم ہو تو یا تو خدا ہوگا جیسا کہ بعض مذاہب کا عقیدہ ہے
یا حیوان مطلق ہوگا۔ اس لیے جو حضرات خوش عقیدت کی وجہ سے
انبیاء اور ائمہ دین کو معصوم عن الخطا کہتے ہیں وہ نادان دوست ان کو
یا تو انسانیت کے درجہ سے گراتے ہیں یا خدا بنا کر پوجتے ہیں۔

جو اہل مذہب انبیاء و رسل اور اپنے اوتاروں اور رشیوں اور منیوں
کو معصوم بے عیب، "نہ کلنک" یقین کرتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں
الجھے ہوئے ہیں کہ اگر یہ حضرات خطا کار تھے تو جو کچھ وہ بذریعہ "وحی"
کہتے پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جائے گا، یہ ایک مغالطہ ہے۔

تمام کائنات ماسوائے انسان "وحی" کے تحت عمل کرتی ہے اور
غلطی نہیں کرتی۔ ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی حیرت انگیز چھتہ بناتی ہے
کہ آج تک اہل علم و حکمت باہم نفیس اوزار بنانے سے قاصر رہے
ہیں۔ وہ پھولوں اور پھلوں سے شہد حاصل کرتی ہے اس کے مختلف
رنگ ہوتے ہیں اور لوگوں کے لیے دوائے شفا بھی ہے۔ انسان
کیمیائی طریقہ سے شہد مصنوعی بنا سکتا ہے۔ لیکن آفرینش سے شہد
کی مکھی ایک ہی حالت میں ہے۔ "وحی" میں نہ غلطی ہے اور نہ اس
کے فہم و شعور میں غلطی کا احتمال ہے۔ وحی کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے
کیونکہ وہ خالق نہیں۔ جو کچھ انبیاء و رسل بذریعہ وحی کہیں گے وہ من و عن

حق ہوگا اور پورا ہوکر رہے گا۔ اس کے خلاف القاءِ شیطانی جو دور
از کار توقعات اور تمناؤں ہی ہوتا ہے اس کا جھوٹ بھی پرکھا جاتا ہے
کہ باطل ہے اور باطل ہوکر رہتا ہے۔

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ "وحی" معصوم ہے
نہ کہ مہبطِ وحی بشر، بشری شخصیت کا تقاضہ کچھ اور ہے اور "وحی" کی نوعیت
اور شے ہے۔ مغالطے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان دونوں کو بلا امتیاز مخلوط
کر دیتے ہیں۔ اور اگر کچھ تمیز بھی کرتے ہیں تو بشر کو "مظہر الوہیت"
قرار دیتے ہوئے معصوم یقین کرتے ہیں۔ "در شکل انسان میں خدا
تھا مجھے معلوم نہ تھا" اس کا نتیجہ واضح ہے کہ ہم اپنے جیسے بندوں
کو وہ حق حکومت دیتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ خالق کائنات رب العالمین
کے لیے خاص ہے۔ اور ان کو "فوق البشر" سمجھتے ہیں انسانی حق حکومت
جو ایام جاہلیت میں بادشاہ دینی اور
دنیوی اخذ کرتے اور اپنے آپ کو سورج اور چندرماں اور دیوتاؤں کی اولاد
کہتے یہی شرک عظیم تھا جس کے خلاف حضرت ابراہیمؑ نے اعلان جہاد کیا۔

لیکن عقیدہ عصمت انبیاءؑ بالکل بے بنیاد نہیں اگرچہ مغالطے سے
خالی نہیں۔ حکومت ایک "امانت" ہے اور مقدس امانت ہے۔
جو اللہ تعالیٰ نے آدم اور بنی آدم کو عطا فرمائی ہے۔ "سخر لکم ما
فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون"

انسان کہ فلک ہاست سرافگندۂ او — در حیرت او گم است
دارد خاصیتے کہ در خارج و ذہن — ہر چیز کہ آ...

سلف کے نقا... ہے۔ وہ رجعت لیے

حکومت کا اہل باوجود ظلم و جہل انسان ہی ہے بہت پیچھے کو انسان

آن میں "خلافت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس عطیہ ایزدی کے ہوتے
وہ کائنات میں تصرف کرتا ہے۔ اگر یہ تصرف سنت اللہ یعنی قوانین
فطرت کے مطابق ہے تو نتیجہ بھی خاطر خواہ بر آمد ہوتا ہے اور انسان
دینی اور مادی ترقی زیادہ سے زیادہ کرتا رہتا ہے اور اگر ظلم و جہل
کے ساتھ تصرف کرتا ہے۔ تو عذاب کے منہ آتا ہے، انسان
انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یہ سب کچھ مشاہدہ کر چکا ہے۔ اور کر رہا
ہے۔ ظلم کی تعریف ہے۔ وضع شیٔ علی غیر محلہ، یعنی جو منشاء فطرت
ہے اس کے خلاف اشیا بے محل استعمال کرنا ہے۔ ظلم دیدہ و دانستہ
ارتکاب غلطی یا گناہ ہے، گناہ ہر عمل ہے جو منشاء فطرت کے خلاف
ہو۔ جہل کوئی غلطی یا گناہ ناواقفیت کے سبب ہے۔ جسے سہواً
کہتے ہیں۔ یہ عذاب جو ظلم و جہل کی وجہ سے نازل ہوتا ہے فطرت
کی طرف سے انتباہ ہے اور غرض یہ ہے کہ انسان سیدھے راستہ
سے بھٹک گیا ہے تو پھر توبہ یا بازگشت سے صراط مستقیم اختیار
کرے۔ جب افراد یا قومیں اس فطری انتباہ کی پرواہ نہیں کرتی تو
دیر سویر مٹ جاتی ہیں۔ تاریخی واقعات قوموں کی ہلاکت پر کافی شہادت
ہیں۔ آثار قدیمہ زبان حال سے ان کی تباہی کی عبرت انگیز داستان سنا
رہے ہیں۔

کہاں ہے دارا کہاں سکندر کہاں ہے کسریٰ کہاں ہے قیصر
خط شکستہ میں ان کے در پر زمانہ عبرت نگار دیکھا

مشاہیرِ اسلام

از

عباد اللہ اختر

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور